رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۱۶

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۱۶

امام المتغزلین

اعتبار الملک لسان الدہر حکیم الشعراء جناب دل شاہجہانپوری

یادگار حضرت امیر مینائی لکھنوی

رسالہ

رہنمائے تعلیم

لاہور

کا

دل نمبر

سالانہ چندہ صہ

قیمت فی پرچہ عہ

مینیجنگ پروپرائٹر

ماسٹر جگت سنگھ

قواعد وضوابط

۱۔ رہنمائے تعلیم بالعموم انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

۲۔ سالانہ چندہ باستثنائے [illegible] صرف تین روپے [illegible] بذریعہ [illegible] ارسال
خدمت ہوگا [illegible] نمونہ مفت طلب کرنے کی تکلیف گوارا [illegible]

۳۔ خریدار اصحاب خط لکھتے وقت چٹ نمبر ضرور لکھا کریں ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف

۴۔ رہنمائے تعلیم میں تمام ایسے علمی، مذہبی، اخلاقی، طبی، تاریخی، تحقیقی مضامین شائع ہوا کرتے ہیں جو شائستہ
و مفید ہوں [illegible] ادب پر پورے اترتے ہیں۔

۵۔ [illegible] مضامین [illegible] نہیں ہوتے

۶۔ جو مضامین [illegible] ان کے واپس [illegible] لفافہ [illegible]

۷۔ [illegible] مضامین [illegible] ہونگے۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ آنا چاہئے

۹۔ مضامین [illegible] کے متعلق جملہ خط و کتابت [illegible] آگیا رام [illegible] پنڈت [illegible]
صاحب جوتشی [illegible] کے نام ہونی چاہئے اور دیگر امور ترسیل زر کے متعلق [illegible] نام ہونا چاہئے۔

۱۰۔ مشتہرین اصحاب [illegible] فائدہ اٹھائیں۔ اجرت [illegible] جو ذیل میں درج ہے

نرخنامہ اشتہارات

پیمانہ صفحہ	ایک بار	تین بار	چھ بار	سال بھر
اول صفحہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
نصف صفحہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
چوتھائی صفحہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

نرخنامہ اشتہارات سرورق (مستقل پورے سال کیلئے)

صفحہ ۲ و ۳ ایک سو آٹھ روپیہ سالانہ — (اجرت ہر حال میں پیشگی آنی چاہئے)

صفحہ ۴ ایک سو بیس روپیہ سالانہ — منیجر رہنمائے تعلیم [illegible] گلی لاہور



حکیم ضمیر احسن خان صاحب دل شاہ جہان پوری اور ان کے صاحب زادے

بابت ماہ اپریل ۱۹۳۶ء

سررشتہ تعلیم پنجاب کا سب سے پرانا اور بہترین خدمتگذار

رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

جلد ۳۱ — نمبر ۴

علمی، ادبی، اخلاقی، طبی، تاریخی، زرعی، اور صنعتی مضامین کا ماہوار مجموعہ

زیر سرپرستی تاج الشعرا فصیح العصر ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی جانشین حضرت داغ مرحوم

مدیر اعزازی

مسٹر لچھمی چند ودیارتھی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایم۔ او۔ جی۔ اے۔ (لندن)

معاونین اعزازی

...گیارام سچدیو منشی فاضل — جناب جوش ملسیانی

...الب کاشمیری ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل — سردار گوبخش سنگھ جوہر میڈلسٹ

مسٹر جگت سنگھ مینیجنگ پروپرائٹر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور رام گلی بلڈنگ ۵۵

...چندہ پانچ روپے (صہ)   ششماہی تین روپے (سے۳)   فی پرچہ سوا روپیہ (عہ)

فہرست مضامین

دل نمبر

رہنمائے تعلیم کی سی سالہ زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس کا ایک خاص نمبر اس حیثیت کا شائع ہو رہا ہے۔ جو اس کے فنی رسالہ ہونے کے باوجود اوّل سے آخر تک خالص ادبی ہے۔ اور جس میں نکاتِ سخن کے سوا اور کسی موضوع کی بحث نظر نہیں آتی۔ رسالہ ہذا کے معاونین میں نیاز مند مدیر حصہ نظم کی شرکتِ عمل کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ اس کے ادبی شوق اور بُرے بھلے مذاقِ سخن کی وجہ سے شعبۂ ادبیات کو زیادہ سے زیادہ وسعت حاصل ہو۔ اور آخر کار وہ ایسے نمبروں کا سلسلہ بھی شروع کرے جو سرتاپا مرقع ادب ہوں۔ دل نمبر جو ناظرین کرام کے سامنے آ رہا ہے۔ اسی مبارک سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اور خدا نے چاہا۔ تو اسی قسم کے بلکہ اس سے بھی زیادہ شاندار نمبر جن کا دھندلا سا خاکہ اب زیادہ مرئی صورت اختیار کر رہا ہے۔ اشاعت پذیر ہونگے۔

زندہ مشاہیر کی قدردانی اور پایہ شناسی کا جذبہ ہندوستان میں بہت کم بلکہ برائے نام ہے۔ مرحوم بزرگوں کی عزت افزائی کے لئے جو آواز سنائی دیتی ہے وہ بھی کچھ زیادہ ہمہ گیر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے ادبی رسالوں نے غالب نمبر۔ مومن نمبر اور حالی نمبر کے سوا دوسرے شعرائے مرحوم کے کمالات اور ان کے نوادرِ افکار پر کوئی توجہ مبذول نہیں کی۔ لکھنؤ سے آتش نمبر امیر نمبر اور اسی طرح دہلی سے میر نمبر۔ ذوق نمبر۔ داغ نمبر شائع ہو سکتے ہیں۔ یہی حال ہندی رسالوں کا ہے۔ نہ کسی نے کالیداس نمبر شائع کرنے کی زحمت گوارا کی ہے۔ نہ بھرتری نمبر کی۔ اسی طرح تلسی داس نمبر۔ بہاری نمبر اور خانخاناں نمبر بھی اشاعت پذیر ہو سکتے ہیں۔ شعرائے مرحوم کے کمالات سے ہماری بے التفاتی کا یہ عالم ہے۔ تو زندہ شعراء کو کسی سے کیا امید ہو سکتی ہے ٹیگور کی قدر افزائی کی۔ تو یورپ والوں نے کی۔ اور اس کے بعد ہندوستانیوں کو یہ محسوس ہوا۔ کہ ان کا ایک ہم وطن شاعرانہ کمالات کے لحاظ سے کس قدر امتیازی وسعت رکھتا ہے۔ یہی سرد مہری دوسرے مشاہیر کے متعلق عام ہو رہی ہے۔ ورنہ مشاہیر اردو میں متعدد باکمال ایسے ہیں۔ جن کا پایۂ سخن بلاشبہ اس قدر بلند ہے۔ کہ ان کے نام پر خاص نمبر شائع کئے جانے کی ضرورت ہے۔ مثلاً حضرت جلیل۔ حضرت نوح۔ حضرت دل۔ میرزا یگانہ وغیرہ بعض رسالوں نے اقبال نمبر ضرور شائع کئے ہیں۔ مگر مقام افسوس ہے کہ اب تک جلیل نمبر۔ نوح نمبر۔ دل نمبر۔ یگانہ نمبر کسی نے قابلِ اشاعت خیال نہیں کئے۔ اس میدان میں ہماری تمام جد و جہد اور دوڑ دھوپ زیادہ تر عید نمبر۔ ہولی نمبر ہی تک محدود رہتی ہے۔ جب تک ہم اپنے قابل افراد کی قدر و منزلت کرنا خود نہیں سیکھتے۔ اس وقت تک غیروں سے یہ امید رکھنا کہ وہ ہمیں بھی کسی قابل سمجھیں۔ سراسر فضول اور خام خیالی ہے۔ ہومر اور گوئٹے کا کلام تو سراپا بہار نظر آتا ہے۔ مگر شعرائے ہند کی نغز گفتاری سے ہمیں مصنوعیت کی بُو آتی ہے۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا۔ کالیداس کی عظمت کو ہم سب مانتے ہیں۔ مگر اس انداز سے کہ شیکسپیئر کی فوقیت کا اعلان ہوتا رہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم شیکسپیئر کو انگلستان کا کالیداس کہنے کی بجائے

الشاکالیداس کو ہندوستان کا شیکسپیر کہتے۔ فی زمانہ شعرائے ہند میں سب سے زیادہ عزت و توقیر میرزا غالب کی ہو رہی ہے۔ اور یہ جذبہ نہایت قابل ستائش ہے۔ مگر ہماری پیر پرستی یا گور پرستی نے اس ہنر کو بھی عیب بنا دیا ہے اور اس صورت حال کو دیکھ کر یہ مصرع بے اختیار زبان پر آجاتا ہے ۔ ع

نہ جفائیں نہیں آئیں نہ وفائیں آئیں

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ دنیائے ادب دل نمبر کی اشاعت پر ہماری محنت اور کوشش کو کس نگاہ سے دیکھے گی لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہم نے اپنی بساط کے موافق اپنا فرض ادا کر کے ایک مثال پیش کرنے کی جسارت کی ہے آج سے تقریباً ایک سال پہلے دل نمبر شائع کئے جانے کا اعلان ہوا تھا۔ ہمیں افسوس ہے۔ کہ ماہ نومبر گذشتہ میں ہی مضامین کی کوشش سے فارغ ہو جانے کے باوجود اس خاص نمبر کی اشاعت ناگزیر حالات کی وجہ سے معرض التوا میں رہی۔ اور اس التوا سے مختلف اصحاب کی زحمت انتظار اصرار پیہم بلکہ طویل شکایات کی محرک ہوئی۔ تاہم مضامین کی نوعیت سے ہمیں یہ اطمینان پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ کہ انہیں دیکھ کر التوا کی شکایت کو ضرور نظر انداز کر دیا جائیگا اور دیر آید درست آید کہکر اس ادبی خدمت کو تلافی مافات سمجھا جائیگا ۔

اس نمبر میں سب سے پہلا تنقیدی مضمون حضرت نیاز فتحپوری کا ہے۔ یہ مضمون وہی ہے۔ جو حضرت دل کے دیوان (نغمۂ دل) میں شامل ہے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ حضرت دل کی شاعری پر حضرت نیاز نے نہایت جامع اور سیر حاصل بحث فرمائی ہے اور کچھ اس سبب سے کہ جناب مرزا احسان احمد صاحب اور حضرت اثر لکھنوی کے مضامین حضرت نیاز ہی کے ادبی مباحثات سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ تینوں مضامین ایک ہی سلسلہ کے ہیں۔ اس مضمون کو یہاں بھی شامل کر دینا نہایت ضروری تھا۔ اس کی تعریف میں یہی کہہ دینا کافی ہے۔ کہ یہ حضرت نیاز فتحپوری کی تراوش قلم کا نتیجہ ہے ۔

اس کے بعد حضرت عزیز لکھنوی کا ایک مختصر مضمون ہے۔ یہ بھی نغمۂ دل میں شامل ہے۔ اسے پڑھ لینے کے بعد وہ تنقیدی مضمون سامنے آتا ہے جو مرزا احسان احمد صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ مضمون نامور نقاد نے حضرت نیاز کی تنقید پڑھ کر بلکہ اسے سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تنقید کے آخری حصے میں حضرت نیاز کے بعض مقالات سے اختلاف رائے ظاہر کیا گیا ہے۔ اور کلام دل کی بہت سی خوبیاں بیان کرنے کے بعد اس میں لکھنویت کا شائبہ دکھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اسی کوشش کا جواب وہ معرکۃ الآرا مضمون ہے۔ جو جناب اثر لکھنوی نے سپرد قلم فرمایا ہے۔ یہ تینوں مضامین جو ادبیات کی بحث میں نہایت بیش قیمت ہیں۔ اسی ترتیب سے پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ جس ترتیب سے کہ وہ شائع کئے گئے ہیں ۔

محترمی جناب اثر کا یہ مضمون لکھنویت کا راگ الاپنے والوں کے لئے تازیانۂ عبرت سے کم نہیں۔ انہوں نے ذم مشابہ بالمدح کا التزام نہایت خوبی سے قائم رکھ کر بہت کھری کھری سنائی ہیں اور حق یہ ہے کہ جتنی باتیں

کہی ہیں۔ خدا لگتی کہی ہیں۔ ہم نے عطوفی میرزا یگانہ کی خدمت میں بھی یہ درخواست کی تھی۔ کہ وہ بھی لکھنویت کے عنوان پر کوئی دھواں دھار مضمون لکھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں اور لکھنؤ کی عزت و آبرو کی حفاظت کے خیال سے اپنے مخالفین کی افسوسناک ہنگامہ آرائی کو تھوڑی دیر کے لئے فراموش کر دیں۔ مگر افسوس کہ دنیائے ادب سے بالکل بیگانہ ہو جانے کی وجہ سے میرزا موصوف نے اس مخلصانہ درخواست کو اوقات فرصت پر ٹال دیا۔ ہم اب بھی ان کی خدمت میں یہ گذارش بلکہ التجا کرتے ہیں۔ کہ براہِ کرم وہ اس بدعت کی بیخ کنی کے لئے قلم اٹھائیں ؎

ان مضامین کے بعد جناب مولانا ناطق لکھنوی کا خطبۂ صدارت ہے۔ جس میں انہوں نے نئے فیشن کے شعرا سے مخاطب ہو کر نوعیتِ غزل پر بحث فرمائی ہے اور اس ضمن میں بہت قیمتی نصیحتیں کی ہیں۔ یہ مضمون مغربی شاعری پر مٹنے والوں اور غزل کو بازیچۂ اطفال بنا دینے والوں کے لئے رہنمائے مشفق ہے ؎

متروکاتِ زبان اور متروکاتِ شعری پر اظہارِ خیالات کرنے کے لئے ہم نے حضرت دل کی خدمت میں جو درخواست کی تھی۔ اُسے نہایت مہربانی سے انہوں نے منظور فرمایا۔ اگرچہ اس موضوع پر ہمیں ایک مبسوط مضمون کی توقع تھی! ور وہ مضمون اگر پچیس تیس صفحات میں بھی سما سکتا۔ تو اس کے لئے عدم گنجائش کا کوئی عذر مانع نہ ہو سکتا تھا۔ تاہم موصوف نے جو کچھ عنایت فرمایا ہے۔ وہ مبتدی اصحاب کے لئے بہت مفید اور سبق آموز ہے ؎

فراہمی مضامین کے سلسلہ میں ہم سید دل محمد فضا کے نہایت شکر گزار ہیں۔ اس خاص نمبر کے لئے انہوں نے جو تکلیف گوارا کی ہے اور جو امداد ہمیں دی ہے۔ وہ اگر شاملِ حال نہ ہوتی۔ تو ہم بلاشبہ بعض بیش بہا مضامین سے محروم رہ جاتے۔ اسی ضمن میں یہ امر بھی خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ کہ دل نمبر کا اعلان شائع ہونے کے بعد سب سے پہلے جو چیز ہمیں موصول ہوئی۔ وہ جناب فصیح العصر حضرت نوح ناروی کی نظم ہے۔ جو موصوف نے ہماری طرف سے کسی قسم کی تحریک نہ ہونے کے باوجود مرحمت فرمائی۔ برابر کے دو ہمعصروں میں باہمی خلوص و ارتباط کی یہ مثال جو دونوں باکمالوں نے اپنے نامور استادوں سے ورثہ میں پائی ہے۔ سب کے لئے قابلِ تقلید ہے یوں تو اس نظم کا ہر ایک بند کیا بلحاظ صورت اور کیا بلحاظ سیرت اس قدر مرصع ہے۔ کہ اسے عقدِ ثریا سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن وہ بند جس میں انسانی دل کی عظمت بیان کی گئی ہے۔ خاص طور سے معرکۃ الآرا ہے۔ ہمارا منہ نہیں کہ اُس کی داد دے سکیں ؎

ان گراں قدر مضامین کے علاوہ ہم نے وہ تمام ضروری یادداشت جو ایک شاعر کے حالاتِ زندگی اور اس کی شاعری سے مخصوص ہو سکتی ہے۔ اس نمبر میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ مختلف عنوانوں کے ماتحت مختلف اصحاب نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس میں حسنِ اتفاق سے جو باتیں بیان کرنے سے رہ گئی تھیں۔ وہ اس مضمون میں جو ادارہ کی طرف سے درج کیا گیا ہے۔ بیان کر دی گئی ہیں ؎

اخلاقیات کے سلسلہ میں جناب آبر احسنی کا ایک مختصر مضمون اس نمبر میں موجود ہے - یہ مضمون ایک انت کی حیثیت میں ہمارے پاس پہنچا تھا۔ آبر صاحب نے اخلاقی مصلحت کی بنا پر یہ تاکید کر دی تھی - کہ شاعت سے پہلے یہ مضمون جناب دل یا ان کے کسی عزیز کو نہ دکھایا جائے - یہ پابندی عائد کرنے سے ان کا نشا یہ تھا۔ کہ ناگہانی طور سے ممدوح کے دل و دماغ میں کسی گزشتہ صحبت کی یاد تازہ کی جائے۔ مقام شکر ہے لہ آج ہم اس بارِ امانت سے سبکدوش ہوتے ہیں ؎

اس نمبر کے حصۂ نظم میں صرف وہی نظمیں یا غزلیات شامل کی گئی ہیں - جو یا تو حضرت دل کے کلام سے بطور ضمین کچھ علاقہ رکھتی ہیں - یا جن کے قوافی میں ان کے تخلص کی تکرار پائی جاتی ہے - چونکہ حضرت ل کے کلام فصاحت نظام کا بہت سا انتخاب اس نمبر کے مضامین میں شامل ہے - اس لئے اس نمبر کا حصۂ ظم بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے مضامین نثر کی طرح نہایت شاندار نظر آتا ہے ؎

دل نمبر کا یہ مختصر سا خاکہ بیان کر دینے کے بعد ہم دوسرے مضمون نگار اصحاب کی سعیٔ مشکور پر اظہارِ امتنان اور جن اصحاب کے مضامین درج نہیں ہو سکے - ان کی خدمت میں اظہارِ معذرت کرتے ہیں - دل نمبر مرتب کرنے کے لئے ہم نے یہ اصول مقدم سمجھ لیا تھا کہ حضرت دل کے عزیزوں یعنی ان کے تلامذہ کی طرف سے اُستاد کی مدح سرائی کا کوئی مضمون نثر میں ہو یا نظم میں - شائع نہیں کیا جائے گا - یہ اصول اس بنا پر اختیار کیا گیا - کہ دنیائے ادب میں یہ مدح سرائی خواہ کتنی ہی منصفانہ کیوں نہ ہو - قابلِ وقعت نہیں سمجھی جائے گی - یہی وجہ تھی کہ ایک طے کردہ اصول پر پابند رہنے کے خیال سے جناب فضا اور جناب مضطر بی اے کے دو قیمتی مضامین جو انہوں نے بہت محنت و کاوش سے لکھے ہیں - شامل نہیں کئے گئے - ان کے علاوہ زین صاحب اور عبرت صاحب کی دو نظمیں جو حضرت دل کی مدح میں انہوں نے بہت عرق ریزی سے لکھی ہیں - شائع نہیں کی گئیں - ان اصحاب کے علاوہ دو تین مضمون اور بھی ہیں - جو ضخامت بڑھ جانے کے خیال سے روک لینے پڑے - ہمیں امید ہے - کہ یہ اصحاب بیان کردہ عذرات کی بنا پر ہمیں معذور بلکہ مجبور خیال فرمائینگے ؎

خدا کرے - کہ ہماری یہ ناچیز کوشش دنیائے ادب میں قابلِ لحاظ سمجھی جائے اور ہم حسنِ قبول کی صورت میں اپنی محنت کا صلہ حاصل کر سکیں - فقط

جوش ملسیانی

مدیر حصۂ نظم و شعبۂ ادبیات

کلامِ دلؔ پر ایک نظر

اس نمبر میں حضرت دلؔ کی غزل پر مختلف اہلِ قلم کی طرف سے جو بحث اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ وہ اس قدر مشرح اور مبسوط ہے کہ اس موضوع پر کسی مزید اظہارِ رائے کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ تاہم اس خیال سے کہ غزل جناب دلؔ کا خاص میدان ہے اور ان کے سرمایۂ کمال کا گرانقدر حصہ غزل ہی کی صورت میں ہے۔ اسلئے اسے اظہارِ رائے کے بغیر نہیں چھوڑا جا سکتا۔

نغمۂ دل میں نامور مصنف نے رنگِ قدیم اور رنگِ جدید کو الگ الگ دکھانے کی کوشش تو ضرور کی ہے مگر بقول حضرت نیاز فتحپوری قدیم و جدید میں کوئی امتیاز کرنا بہت دشوار ہے۔ قدیم کو قاف اور جدید کو جیم لکھ دینے کی بجائے اگر ہر غزل کے ساتھ سنہ تصنیف بھی لکھ دیا جائے۔ تو بھی یہ مشکل حل نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک سالم غزل اپنی مجموعی صورت میں زمانہ حال کی غزل کا بہترین نمونہ اور رنگ قدیم و جدید کے امتیاز سے بالاتر ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ سالم غزل اور اسکی مجموعی صورت کو چھوڑ کر رنگِ قدیم کی بعض غزلیات میں سے ایک ایک دو دو شعر ایسے انتخاب کئے جا سکتے ہیں۔ جو کسی قدر رنگِ قدیم سے منسوب ہو سکیں۔ ورنہ کوئی سالم غزل ایسی نہیں ہے جس پر حرف قاف کا صحیح اطلاق ہو سکے۔ یہ ایک ایک دو دو شعر جو رنگِ قدیم کی مد میں شمار ہو سکتے ہیں۔ انہیں بھی خالص رنگِ قدیم سے منسوب کرنا درست نہیں۔ یہ اندازِ سخن جسے حضرت دلؔ نے رنگِ قدیم قرار دیا ہے کب اور کیوں ترک کیا گیا۔ اس سوال کا جواب حضرت دلؔ نے ہمارے استفسار پر سپردِ قلم فرمایا ہے۔ جو اگرچہ اسی نمبر میں کسی اور جگہ بجنسہٖ شائع کر دیا گیا ہے۔ مگر نغمۂ دلؔ کو اوّل سے آخر تک پڑھ لینے کے بعد ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس استفسار کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہاں حضرت دل کی ایک سالم غزل جس کے ساتھ حرف قاف بھی لکھا ہوا ہے درج کی جاتی ہے ؎

کوئی دے کسی میں ایسا نہیں غمگسار میرا — کہ انہیں سنائے اے دل کبھی حالِ زار میرا
تری ٹھوکروں کو ظالم عبث آج جستجو ہے — جسے کل مٹا چکی ہیں وہی تھا مزار میرا
پسِ مرگ بھی ہے ظاہر یہ نشانِ خاکساری — کبھی گرد باد بن کر نہ اٹھا غبار میرا
دل ادھر تڑپ رہا تھا تو جگر ادھر تھا بسمل — کہوں کیا کہ حال کیا تھا شبِ انتظار میرا
تری تیغ ناز چل کر اسے کچھ تو دے تسلّی — کہ بہت تڑپ رہا ہے دلِ بیقرار میرا
نگہِ ستم کے تیور یہ جتا رہے ہیں اے دلؔ — نہ ہوا کبھی نہ ہوگا وہ ستم شعار میرا

اس غزل کو جسے حضرت دل رنگِ قدیم میں شامل فرماتے ہیں پڑھ کر یہی کہنا پڑتا ہے۔ کہ جناب دلؔ کے خیال میں رنگِ قدیم کا مفہوم وہ نہیں جو عام طور سے ان الفاظ کے ساتھ وابستہ سمجھا جاتا ہے۔ چھ اشعار ہیں جن میں کوئی شعر ایسا نظر نہیں آتا۔ جو غزل گوئی کے بہترین معیار سے خارج ہو۔ ہر ایک شعر استادانہ اندازِ سخن کی تصویر، حسنِ معانی کی دلکش تنویر جذبات

نگاری کی جان اور تغزل کا ایمان ہے۔ اسے رنگِ قدیم میں شامل کرنا نہایت ناانصافی ہے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت دل کی ایک اور سالم غزل جسے رنگِ جدید کہنا چاہیے اور جو نعمۂ دل میں اس سے شامل [illegible] کی اشاعت کے بعد مشاعرہ معرک ضلع سیتا پور میں پڑھی گئی ہے۔ بہ غرضِ محاکمہ پیش کی جاتی ہے۔ تاکہ صحیح طور [illegible] معلوم ہو سکے۔ کہ حضرت دل کا رنگِ قدیم ان کے رنگِ جدید بلکہ آج کل کے اندازِ سخن سے بھی مختلف نہیں ہے اور رنگِ قدیم میں بھی [illegible] تغزل کی وہی شان موجود ہے جو رنگِ جدید میں پائی جاتی ہے۔

غزل مشاعرہ معرک ضلع سیتا پور

کبھی ضبطِ سوزِ دل سے کبھی گرمیٔ فغاں سے — جو شرر اڑے چمن میں وہ مرے ہی آشیاں سے
دلِ زار و نالہ کش کو کوئی لائے اب کہاں سے — جو دلیلِ کارواں تھا وہی گم ہے کارواں سے
مرا ہر نفس بیاں ہے مرے اشک ماجرا ہیں — یہی شرحِ مدعا ہیں وہ سنیں جہاں جہاں سے
جو چھپے جگر میں ناوک وہ کھٹک رہے ہیں دل میں — یہ مجھے خبر نہیں ہے ہوئی ابتدا کہاں سے
دلِ زار کو نہ ہوتا کبھی شکوۂ تغافل — ابھی آشنا نہیں ہے ترے رازِ امتحاں سے
نہ سمجھ سکے ہم اب تک وہی فیصلہ تھا دل کا — جو کہا تری نظر نے جو سنا تری زباں سے
مجھے یاد آ چکی ہیں وہ ازل کی داستانیں — جو نظر ہے آشنا ہے ترے حسنِ دلستاں سے
ہوئی بے وجود ہستی نہ مٹی وفا پرستی — کہ ہزاروں گل کھلے ہیں مری خاکِ آشیاں سے
تری بے نیازیوں نے نہ کئے قبول سجدے — یہی داغ تھا جبیں پر جب اٹھے ہم آستاں سے
کبھی نالۂ جنوں ہوں کبھی نغمۂ عنادل — بنے سینکڑوں فسانے مری ایک داستاں سے
نہیں امتیاز ناصح تری پندِ برمحل کا — یہ مقامِ بے خودی ہے مجھے چھوڑ دے یہاں سے

ہمارے فلسفی شعرا جو اپنی مستانہ لغزشوں کی برکت سے نہ صرف دل کی بلکہ اس کی تمناؤں کی گہرائیاں ناپتے اور رعنائیِ عصیاں کے گیت الاپتے رہتے ہیں۔ جنہیں چاندنی راتوں میں قمر گیت گاتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ جو سیم گوں خاموشیوں کے منظر دیکھتے رہتے ہیں۔ جو بھیگے ہوئے کیف کا لطف اٹھاتے رہتے ہیں۔ جنہیں جوانی کے سنہری خواب آتے ہیں۔ اور اس سنہری خواب کی سنہری تعبیر بھی جانتے ہیں۔ جو الم زاروں۔ ضو زاروں۔ کیف زاروں۔ تمنا زاروں حسرت زاروں اور خدا جانے کن کن زاروں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ جن کی نگاہیں جھڑتے ہوئے کیف اور جھڑتے ہوئے تبسم کو دیکھ سکتی ہیں اور اسی وجہ سے وہ کیف ریز تبسم ریز اور نوا ریز کی ترکیبیں تراشتے ہیں۔ جو بہترین تغزل کو بھی لکھنویت سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ ریز نگار اور زار نویس اگر رنگِ جدید کی اس غزل کو بھی جو اوپر درج کی گئی ہے۔ رنگِ قدیم قرار دیں۔ تو تعجب نہیں۔ ورنہ غزل کی تعریف کو مدِ نظر رکھا جائے۔ تو حضرت دل کے رنگِ قدیم میں بھی ان

ﮯ یہ مقطع موصول ہوئی ہے۔ ادارہ

اس کے رنگِ جدید کے تمام محاسن موجود ہیں۔ جو نغمۂ دل میں کوئی سالم غزل ایسی دستیاب نہیں ہو سکی۔ جس پر صحیح طور سے رنگِ قدیم کا اطلاق ہو سکے۔ صرف دو چار غزلیں ہیں۔ کہ ان میں ایک ایک دو دو شعر جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ایسے نظر آتے ہیں جنہیں رنگِ قدیم میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ؎

ساقی کی چشمِ مست نے بیہوش کر دیا
لینا جناب شیخ چلے آسمان پر

ابرو پہ آئینہ میں نگاہیں ہیں بار بار
برسا رہے ہیں تیر وہ اپنی کمان پر

بوقتِ خود بینی نہ دیکھیں آپ تن کر آئینہ
ہرا ہے حسن یہ کھینچے گا خنجر آئینہ

رُخ پہ جب لٹکنے وہ گیسو اور خوبی بڑھ گئی
ہو گیا ہے دل بڑھانے سے بنتر آئینہ

جوڑا اچھا ہے مری تقدیر ان کی زلف کا
یہ بھی بل کھائی ہوئی ہے وہ بھی بل کھائی ہوئی

جو بے تقصیر مارا تھا تو اندر آتے کرم کرتے
انہیں ہاتھوں ہماری لاش کی تشہیر ہو جاتی

لے اُڑیں گی اُن بتوں کو شوخیاں
یوں حیا کی پاسبانی جائے گی

رنگِ قدیم وجدید پر بحث ختم کرنے کے بعد نغمۂ دل سے متعلق صرف ایک دو باتیں اور ایسی ہیں جن کا بیان کرنا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ حضرت دل کی طبیعت نے جوہر قابل کی طرح حضرت امیر مینائی کا رنگِ سخن کچھ اس طرح جذب کیا ہے۔ کہ ان کے صدہا اشعار ایسے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر یہ امتیاز کرنا مشکل ہے۔ کہ غزل حضرت دل کی ہے یا حضرت امیر کی۔ مثلاً ؎

جو زخمِ خونچکاں دلِ مضطر کے ہو گئے
جوہر شناس تیغِ ستمگر کے ہو گئے

حسنِ چمن تھے قطرۂ شبنم بہار میں
پلٹی ہوا تو اشک گلِ تر کے ہو گئے

ساقی نگاہِ لطف اٹھائے تو کس طرف
کل اہلِ بزم ایک ہی ساغر کے ہو گئے

آہیں شریکِ درد ہیں کس کی شبِ فراق
نالے تو ہم نوا دلِ مضطر کے ہو گئے

یوں وقفِ دیر و کعبہ رہے ہم جنابِ دل
اس گھر کے ہو گئے کبھی اُس گھر کے ہو گئے

اس کا تتبع ہر شاگرد کا فرض ہوتا ہے۔ مگر تتبع کو اس حد تک پہنچا دینا۔ کہ کامل طور سے استاد کا رنگِ سخن جذب کر لیا جائے ہر شاگرد کا کام نہیں۔ مرآۃ الغیب میں حضرت امیر مغفور کی وہ غزلیں ملحوظ ہوں۔ جن میں ایک کی زمین خنجر میں رہ گئے محشر میں رہ گئے۔ اور دوسری کی کنعان میں رہ گئے۔ زنداں میں رہ گئے۔ ہے۔ اسکے بعد حضرت دل کی یہ غزل جس کے چند شعر اوپر درج کئے گئے ہیں۔ پڑھی جائے۔ تو حضرت دل کی قوت جاذبہ کا اعجاز صاف طور سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ یہاں ان ہر دو غزلیات کا اقتباس اس لئے درج نہیں کیا۔ کہ اپنے کلام کے ساتھ حضرت امیر مرحوم کا کلام بطور مقابلہ درج کرنا حضرت دل کو ضرور ناگوار معلوم ہوگا ؏

دوسرا نکتہ قابلِ غور یہ ہے۔ کہ متروکاتِ زبان اور متروکاتِ شعری کے لحاظ سے حضرت ولی کی زبان ان شعرا کے لئے جو اہلِ زبان نہیں ہیں۔ بلاشبہ ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ ان متروکات کو جن کا مختصر بیان حضرت ولی کے قلم سے اسی نمبر میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ ماننے کو تو سب فصحا مانتے ہیں۔ بلکہ اس بحث میں حضرت ولی سے بھی کچھ پیش پیش ہیں۔ مگر میدانِ عمل میں آکر پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اور ایسا اوقات تو نہیں البتہ بعض اوقات کوئی نہ کوئی متروک لفظ استعمال کر ہی جاتے ہیں۔ متروکات کا نہایت سختی سے پابند رہنا اور ان کے عدم استعمال سے کبھی غافل نہ رہنا یہ وصف یا تو ہم نے جناب نوح ناروی میں دیکھا ہے یا جناب ولی میں۔ ورنہ بیشتر فصحائے زمانہ حال جو اپنی حاصل کردہ شہرت و عظمت کے بجا طور سے مستحق ہیں۔ ان متروکات کی پروا نہیں کرتے۔ اوریاں۔ واں۔ تلک۔ لے کہ۔ پس مردن۔ پس از مردن۔ پر بمعنی مگر۔ ولیکن تخفیف حروفِ علت وغیرہ اب تک استعمال کئے جاتے ہیں۔ خرابی یہیں تک محدود نہیں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ان متروکات کے استعمال پر زور دیتا اور ان کے جواز پر اصرار بھی کرتا ہے۔ جب اہلِ زبان کا یہ حال ہو تو زباندانوں کو ان پر توجہ دلانا اور ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ متروکات کے پابند ہوں فضول اور بیکار ہے۔ پنجاب کے اہلِ قلم متروکات کو جاننے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے۔ طرہ اس پر یہ کہ ان کی فرعونیت اہلِ زبان کی تقلید سے اس قدر سرکشی اختیار کر رہی ہے کہ متروکات کا پابند ہونا تو درکنار وہ روزمرہ کی غلطیاں بھی اپنے تصرفات سے منسوب کرتے اور انہیں جائز و برحق سمجھتے ہیں۔ مثلاً لاہور کے ایک پروفیسر صاحب کی ایک اردو نظم جس کا عنوان ہسپانوی عورت تھا۔ ہمیں بغرض اشاعت موصول ہوئی۔ اس نظم میں ٹیپ کا مصرع یہ تھا۔ ؎

تو نے الفت مجھ سے کرنی ہو تو کر میرے لئے

یہ نظم کسی انگریزی نظم کا کامیاب ترجمہ تھی۔ اس لئے ٹیپ کے مصرع میں تھوڑی سی ترمیم کرنے کے بعد اسے شائع کر دیا گیا۔ یہ ترمیم حسبِ ذیل تھی۔ ؎

تجھ کو الفت مجھ سے کرنی ہو تو کر میرے لئے

کچھ عرصہ کے بعد لاہور کے رسالہ کارواں میں جو صرف سالانہ نمبر کی صورت میں شائع ہوتا ہے۔ یہی نظم پھر شائع ہوئی اس مکرر اشاعت میں ٹیپ کا مصرع اپنی اصلی صورت ہی میں تھا بعض اصحاب نے اس مصرع کی زبان پر اعتراضات بھیجے۔ چونکہ یہ اعتراضات اہلِ زبان کی طرف سے تھے۔ انہیں بے چون و چرا تسلیم کر لینا مناسب تھا۔ مگر ہماری حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ جب کہ ہم نے اگلے سال کے کارواں میں ان اعتراضات کی تردید پڑھی۔ اور زبان کے اس فاش سقم کو پنجابیوں کے تصرفات کی آڑ میں پناہ دی گئی۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب اہلِ زبان کے روزمرہ سے سرکشی اور تمرد کی یہ صورت ہو۔ تو متروکاتِ زبان کی پروا کرنے اور ان پر سختی سے پابند ہونے کی کیا توقع ہو سکتی ہے ان حالات میں جبکہ نہ اہلِ زبان صحتِ زبان کی پروا کرتے ہیں اور نہ زباندان۔ حضرت ولی کی شستگی زبان سے

صحت زبان کے ہر طرفدار کو خاص مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ہم بہ بانگ دہل یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ متروکات زبان کی انتہائی پابندی کے لحاظ سے فصحائے لکھنؤ میں حضرت ولؔ اور فصحائے دہلی میں حضرت نوحؔ صحت زبان کے علمبردار ہیں +

غزل کی ان دو خصوصیتوں کے علاوہ محاسن کلام کے اور بہت سے پہلو ایسے ہیں۔ جو حضرت دلؔ کے لئے سرمایۂ افتخار ہو سکتے ہیں۔ مگر اس نمبر میں ان کی غزل پر بہت زیادہ بحث ہو چکی ہے۔ اس لئے اب دیگر اصناف سخن پر ہم ناظرین کرام کی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ تاکہ یہ ظاہر ہو سکے۔ کہ موصوف کا کمال سخن صرف غزل ہی تک محدود نہیں ہے ؎

نغمۂ دل میں مجموعہ غزلیات کے بعد جیسے صفحہ ۱۸۷ پر ختم کیا گیا ہے۔ بیس بائیس صفحات اور بھی ہیں۔ جن میں ۲۵ رباعیات۔ چار مخمسے اور دو ترجیع بند موجود ہیں۔ سب سے پہلے ہم رباعیات کا تھوڑا سا انتخاب یہاں درج کرتے ہیں ؎

شاعر جو اسیر کی عنایت سے ہوئے — وہ رب قدیر کی عنایت سے ہوئے
جز فکر سخن فکر نہیں کچھ اُن کو — آزاد اسیر کی عنایت سے ہوئے

عالم سے جدا ہے مے پرستی میری — صرف مے و مینا ہوئی ہستی میری
صد شکر گرا تو پائے ساقی پہ گرا — گردوں سے بلند تر ہے پستی میری

یہ دونوں رباعیاں حسن بیان کی تصویر اور استادانہ انداز سخن کیلئے سرمایۂ توقیر ہیں۔ پہلی رُباعی اتنی لمبی ردیف کے باوجود اس قدر کامیاب ہے۔ کہ باید وشاید۔ چوتھا مصرع رباعی کی جان ہوا کرتا ہے۔ ذرا اسے بھی ملاحظہ فرمائیں اللہ اللہ یہ مصرع کس قدر مستغنی عن التصیف ہے۔ اس کی داد کما حقہٗ دی جائے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت دلؔ کو پہلے یہ ہی مصرع جس کے الہامی ہونے میں ذرا شک نہیں سوجھا ہے۔ اور اسی بنیاد پر اس رباعی کی تعمیر اُٹھائی گئی ہے۔ مصرع ثانی میں ردیف کی معنوی عظمت مصرع اوّل سے خراج تحسین طلب کر رہی ہے۔ مصرع سوم میں فکر سخن اور فکر دنیا میں جو لطیف اور معنوی فرق حقیقی و مجازی استعمال سے ظاہر ہوا ہے۔ وہ بھی نہایت قابل داد ہے۔

دوسری رباعی میں پستی کو بلند اور وہ بھی گردوں سے بلند۔ بلند ہی نہیں بلکہ بلند تر ثابت کرنیکی کوشش کتنی کامیاب ہوئی ہے یہ مصرع بھی بلند خیالی کی معراج ہے اور اس پر جو مصرعے لگائے گئے ہیں۔ ان سے بہتر اور کوئی صورت خیال میں نہیں آسکتی ؎

مقبول زمانہ وہ بشر ہوتا ہے — جو خاک سر راہ گزر ہوتا ہے
پستی کا عبث شکوہ ہے تجھ کو غافل — ہر گھر میں تہ نشیں گہر ہوتا ہے

صد حیف کہ اک پیکرِ حیرانی ہوں　　ذروں کی طرح صرفِ پریشانی ہوں
اے اہلِ نظر دیکھو حقیقت میری　　موجود ہوں عالم میں مگر فانی ہوں

عجز و انکسار کی فضیلت میں شعرائے کرام نے بہت کچھ کہا ہے۔ مگر حضرت دل نے جو گوہر بے بہا ڈھونڈا ہے۔ اسے حاصل ہفت قلزم کہنا چاہیئے۔ بحر کی جگہ ہزبحر کہنے سے استدلال کو جو تقویت حاصل ہوئی ہے۔ وہ اور بھی مستحسن ہے۔ دوسری رباعی میں پیکرِ حیرانی اور صرفِ پریشانی کی وسعتِ معنی کے علاوہ لفظ حقیقت کو مجاز کے معنی میں جو استعمال کیا ہے وہ بہت پُرلطف اور نہایت بلیغ ہے۔ اہلِ نظر کو مخاطب کرنا بھی لفظ دیکھو کی مناسبت سے لفظاً اور لفظ حقیقت کے لحاظ سے معناً نہایت قابلِ داد ہے ؎

لبریزِ فنا عمر کا پیمانہ ہے　　ہر ہر نفسِ سرد اک افسانہ ہے
دنیا تری نظروں میں ہے فانی اے دلؔ　　باقی جو سمجھتا ہے وہ دیوانہ ہے

عمرِ انسانی پر موت کی گرفت اس قدر زیادہ ہے کہ عمر کا پیمانہ اسی شراب سے بھرا ہوا سمجھو۔ مصرع اول کا ترجمہ تو یہی ہے مگر الفاظ بھرا ہوا میں وہ لطف کہاں۔ جو لبریزِ فنا کی ترکیب میں ہے۔ مصرع ثانی میں ہر ہر کی تکرار بہت بلیغ ہے۔ یہاں ہر اک نفس بھی کہا جا سکتا تھا۔ مگر ہر ہر نفس میں یا اور ہی عالم نظر آتا ہے۔ نفسِ سرد کو ایک افسانہ کہنا تمام واقعاتِ زندگی کو دو تین لفظوں میں بند کر دینا ہے۔ الفاظ میں یہ معنوی وسعت دونوں مصرعوں کا طرۂ امتیاز ہے ؎

مل جل کے رہو اہلِ وطن مرد بنو　　تنظیم کے میدان میں تم فرد بنو
معراجِ کمال پاؤ جمعیت سے　　منظور اگر تفرقہ ہو در د بنو

پہنچا چمنِ دہر میں پیغامِ بہار　　ہے جام بکف ساقیِ شیریں گفتار
مستوں کی طرح جھوم رہی ہیں شاخیں　　اب سبزۂ خوابیدہ بھی ہوگا بیدار

کیا کیا گلۂ بے سر و سامانی ہے　　قصہ دلِ ناکام کا طولانی ہے
طے کرتا ہوں میں دشتِ جنوں کی راہیں　　پیچھے مرے گرد آگے پریشانی ہے

دل حسن کے پرتو سے اک آئینہ ہے　　گنجینۂ معرفت مرا سینہ ہے
مانوسِ تجلی ہوں ازل سے اے دلؔ　　احساسِ حقیقت مجھے دیرینہ ہے

اس انتخاب سے ہر صاحبِ ذوق اندازہ کر سکتا ہے۔ کہ حضرت دلؔ کی رباعیات کس پائے کی ہیں اور ان کی طبیعت غزل کی طرح رباعی کہنے پر کس قدر حاکمانہ قدرت رکھتی ہے۔ اب ہم تخمیس کا تھوڑا سا اقتباس یہاں درج کرتے ہیں۔ نغمۂ دل کا چوتھا خمسہ حضرت

ولی نے اپنی ہی غزل پر کہا ہے۔ اس کے دو تین بند ملاحظہ ہوں۔

اس غزل کا مطلع یہ تھا ؎

مٹ گیا جب مٹنے والا پھر سلام آیا تو کیا
دل کی بربادی کے بعد اُن کا پیام آیا تو کیا

اس مطلع کی تخمیس میں کیا خوب فرماتے ہیں ؎

کوچۂ جاناں سے پیکِ خوش خرام آیا تو کیا
اب جو راحت بخشنے والا کلام آیا تو کیا
اُس کی یاد آئی تو کیا خط اُس کے نام آیا تو کیا
مٹ گیا جب مٹنے والا پھر سلام آیا تو کیا
دل کی بربادی کے بعد ان کا پیام آیا تو کیا

دوسرا شعر یہ تھا ؎

کاش اپنی زندگی میں ہم یہ منظر دیکھتے
اب سرِ تربت کوئی محشر خرام آیا تو کیا

اس شعر کی تخمیس حسب ذیل ہے ؎

شوق پامالی میں طرز فتنہ پرور دیکھتے
دل کی بربادی کا عالم اُس کے زیر پر دیکھتے
کچھ تو انجامِ محبت خاک ہو کر دیکھتے
کاش اپنی زندگی میں ہم یہ منظر دیکھتے
اب سرِ تربت کوئی محشر خرام آیا تو کیا

تیسرا شعر یہ تھا ؎

تیرگیِ بختِ عاشق بڑھ گئی شامِ فراق
چرخِ نیلی فام پر ماہِ تمام آیا تو کیا

اس شعر کی تخمیس بھی ملاحظہ ہو ؎

عشق سے پہلے سُنا کرتے تھے ہم نامِ فراق
دل لگانا تھا کہ تم بھیجا پیامِ فراق
یہ شب مہ یہ سماں۔ اس پر یہ آلامِ فراق
تیرگیِ بختِ عاشق بڑھ گئی شامِ فراق
چرخِ نیلی فام پر ماہِ تمام آیا تو کیا

خمسہ میں سب سے زیادہ قابلِ غور یہ پہلو ہوتا ہے۔ کہ لگائے ہوئے مصرعوں کا ربط اصل شعر سے اسقدر مضبوط ہو۔ کہ مفہوم کی تشریح کے لئے انہیں ایک جزو لاینفک ماننا پڑے۔ تینوں شعروں کی مذکورۃ الصدر تخمیس میں یہ وصف اس قدر نمایاں ہے کہ نئے مصرعے اصل شعر سے بلحاظ ربطِ کلام دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ ہر ایک بند میں حسن یہ برجستگی اور یہ خوبی پیدا کرنا نہایت مشکل ہے! اس میدان کا شہسوار وہی ہو سکتا ہے جس کی مشق سخن منتہائے کمال کو پہنچ چکی ہو۔

تخمیس کے یہ تین نمونے پیش کرنے کے بعد ہم حضرت ولی کے مجموعہ نظم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جناب نفضا جالندھری نے نہایت مہربانی سے جو مجموعہ نظم رسالہ ہذا کے دفتر میں ہمارے حسبِ الطلب ارسال کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ حضرت ولی کی نظمیں

صرف مقامی اور تقریبی ہیں۔ تاریخی۔ ادبی۔ اخلاقی۔ قومی۔ ملکی اور مزاحیہ عنوانوں یا جذبات و مناظر پر کوئی نظم انہوں نے نہیں کہی اور اگر کہی ہے۔ تو دفتر میں ہمیں نہیں پہنچائی گئی۔ ہنگامی نظمیں کہنے والے شعرا اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ کہ مقامی حیثیت کی تقریبی نظمیں زیادہ تر رفع الوقتی کے خیال سے کہی جاتی ہیں۔ احباب کے اصرار پیہم سے تنگ آکر عموماً بیگار ٹالنے کی کوشش کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان نظموں میں شاعری کا عنصر بہت کم بلکہ برائے نام ہوتا ہے۔ جھوٹی مدح سرائی انہیں اور بھی بے کیف بنا دیتی ہے۔ فرمائش کرنیوالے اصحاب شاعر کو ایک مشین سمجھ لیتے ہیں وہ انعقاد جلسہ سے چند ہی گھنٹے پیشتر شاعر کو اطلاع دیتے اور نہایت فصیح و بلیغ نظم کہنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ بیچارہ شاعر اگر تنگی وقت کی شکایت کرتا ہے۔ تو آپ یہ فرماتے ہیں۔ کہ پندرہ بیس شعر کہہ دینا کونسی بڑی بات ہے۔ یہ تو آپ کا پانچ منٹ کا کام ہے۔ اگر کسی غم والم یا کسی مریض کی تیمارداری یا اور کسی سانحہ کی وجہ سے یہ عذر پیش کرتا ہے۔ کہ اس وقت طبیعت حاضر نہیں۔ براہِ مہربانی مجھے معاف کیجئے۔ تو یہ حضرات شاعر کو بے لحاظ سمجھ کر چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں۔ اگر طوعاً و کرہاً ان کی فرمائش مان لی جائے۔ تو ان کی بدذوقی و کورسوادی عجیب و غریب پابندیاں عائد کرتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ صاحب بہادر کا نام معہ خطابات و القاب نظم میں آجائے۔ انکی لیڈی کا نام بھی آجائے۔ نئے صاحب بہادر جو تشریف لا رہے ہیں دو تین شعر ان کے لئے بھی مخصوص ہوں۔ ان کا نام نامی بھی معہ ان کے خطاب و القاب کے ضرور آنا چاہیے۔ انکی لیڈی کا نام بھی ضرور ہو۔ داعیان جلسہ میں سے فلاں فلاں اصحاب کے نام اظہار عقیدت کی صورت میں ضرور آئیں۔ صاحب بہادر نے کھیتوں کی مینڈیں دیہات میں بہت کوشش سے بندھوائی ہیں۔ باڑیں لگوائی ہیں۔ اچھی نسل کے سانڈ مہیا فرمائے ہیں۔ راجہ ہل استعمال کرنے کیلئے کاشتکاروں کو بہت ترغیب دلائی ہے۔ پلیگ کے دنوں میں رعایا کی جانیں بچانے کیلئے ان کی مسیحانفسی نے لاکھوں چوہے ہلاک کئے ہیں۔ ان تمام کارناموں کا ذکر بھی ہونا چاہیے۔ اشتمال اراضی اور کواپریٹو سوسائٹیوں کو ان کے عہد معدلت مہد میں جو روز افزوں ترقی ہوئی ہے۔ وہ بھی بیان کر دی جائے۔ سیاسی شورو شر کو دبانے کیلئے انہوں نے نہایت تدبر کا ثبوت دیا ہے اور اپنے آہنیں پنجے سے اس جدوجہد کا گلا گھونٹ کر مستقل امن قائم کیا ہے۔ یہ شاہکار بھی اس نظم میں مذکور ہوں۔ اب فرمایئے۔ کہ بیچارہ شاعر کس کس حکم کی تعمیل کرے مختلف جنس کے چھ سات نام کسی ایک بحر میں آہی نہیں سکتے۔ انگریزوں کے بعض نام ایسے ہوتے ہیں۔ جو باعتبار صحت تلفظ کسی بحر میں بھی منظوم نہیں ہوسکتے۔ اگر کوئی ہمت والا اس ہفتخوان کو طے کرنے میں کامیاب بھی ہو جائے۔ تو باقی ماندہ فرمائشوں کی تعمیل میں کیا کرے معلوم نہیں۔ یہ حضرات شاعر کو کیا سمجھے ہوئے ہیں۔ جس نظم میں سانڈ ڈکراتے ہوں۔ اونٹ بڑاتے ہوں۔ چوہے دم توڑ رہے ہوں۔ وہ نظم نہ ہوئی اچھا خاصہ وحوش خانہ ہوا۔ طرہ اس پر یہ کہ اس قسم کے جلسوں میں حکام کا رعب اس قدر طاری ہوتا ہے کہ لیڈیوں کا نام سن کر شاید کچھ داد مل جائے۔ (وہ بھی تالیوں کی صورت میں) ورنہ نظم پڑھنے والا یہی محسوس کرتا ہے۔ کہ تمام حاضرین کو سانپ سونگھ گیا ہے یہ وجوہ ہیں جو تقریبی نظموں کو بالکل ناکارہ اور مستقل شاعری کے دائرے سے خارج کر دیتی ہیں۔ اس قسم کی صدہا نظموں میں بمشکل تمام دو تین نظمیں ایسی نکلیں گی جو کسی ادبی معیار کے مطابق ہوں اور جن میں شاعرانہ انداز بیان غالب نظر آئے۔ مقام مسرت ہے کہ حضرت دل کی تقریبی نظمیں اس کلیہ سے مستثنےٰ ہیں۔ اور اسکی

وجہ فن شعر میں انکی مہارت تامہ انکی مشق سخن ان کا ذوق سلیم اور وجدان صحیح ہے۔ کہ ان اوصاف کی برکت سے پھیکا شعر ان کی زبان سے نکل ہی نہیں سکتا طبیعت ہے کہ ہر سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ ہر چمن میں شگفتہ رہتی ہے۔ ہر جگہ اپنی بہار دکھاتی ہے اور کسی عالم میں اپنا قدرتی رنگ نہیں چھوڑتی۔ یہاں ان نظموں کے بعض حصے ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کلکٹر ضلع شاہجہانپور کی تبدیلی پر حضرت ولی نے ایک نظم ۶ مارچ ۱۹۳۵ء کو الوداعی جلسہ میں پڑھی تھی اس کا ابتدائی حصہ محاسن کلام کی دولت سے مالامال ہے شروع کے چار بند حسب ذیل ہیں ؎

آج ہم روداد بخت نارسا کہنے کو ہیں　　　انقلابات جہاں کا ماجرا کہنے کو ہیں
چند آنسو ہیں جو اپنا مدعا کہنے کو ہیں　　　کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا ہے کیا کہنے کو ہیں
یہ خبر اتنک کسے تھی کیا سے کیا ہو جائے گا
نغمۂ دلکش مقدر کا گلہ ہو جائے گا

منظر رنج و قلق ہے کس لئے چشم پر آب　　　آج قلب مطمئن کو کیوں ہے اتنا اضطراب
دیدیا صبر و تحمل نے یکایک کیوں جواب　　　شادماں افسردہ خاطر ہیں کیا ہے انقلاب
روح پرور ہر ترانہ نالۂ دل بن گیا
وقعتۂ عشرت کدہ ویرانی منزل بن گیا

کیا صدا کانوں میں آئی ہے کہ دل مغموم ہے　　　ضبط رخصت ہو گیا تسکین بھی معدوم ہے
شومیٔ قسمت سے ہر امید اب موہوم ہے　　　لوح پیشانی پہ افسردہ دلی مرقوم ہے
کیوں نظر آتی نہیں افسردگی ملتی ہوئی
جس سے تھی تسکین خاطر وہ ہوا چلتی ہوئی

کون بے رونق پھلے پھولے چمن کو کر چلا　　　دامن گل جائے شبنم آنسوؤں سے بھر چلا
وائے حسرت جو نہال آیا بہ چشم تر چلا　　　چاندنی پھیکی ہے نظروں میں مہ انور چلا
کس کی رخصت آن واحد میں قیامت ڈھا گئی
نو شگفتہ غنچۂ دل پر اداسی چھا گئی

اسی طرح ایک نہایت پرلطف نظم باندازِ تغزل ہے۔ جو اے این سپرو صاحب کلکٹر شاہجہانپور کی تقریب رخصت پر کہی ہے اس نظم میں تغزل کی پوری شان جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور طبیعت ہے کہ سیر نہیں ہوتی۔ ناظرین پڑھیں اور لطف اندوز ہوں۔

نظم باندازِ تغزل ہنگام رخصت اے این سپرو صاحب کلکٹر شاہجہانپور

ہے وہم فقط آنا جانا جاتا ہے نہ کوئی آتا ہے　　　دنیا میں یہی ہم سنتے ہیں اک آتا ہے اک جاتا ہے

پہلے ہی کسی کے جانے سے کیا ضبط کی بھی ہمت نہ رہی
پھر اشک بہیگے آنکھوں سے پھر آج یہ دل گھبراتا ہے

وہ لطف کہاں وہ بزم کہاں او ہم سے جدا ہونے والے
پھر ٹیس سی دل میں اٹھتی ہے پھر درد ہمیں تڑپاتا ہے

ارمان کہاں امید کہاں یہ سب تھے فقط اک عالم تک
جو نقش تھا اپنی نظروں میں وہ نقش بھی مٹتا جاتا ہے

دستور یہی ہے دنیا کا آئے تھے یہاں جانے کے لئے
بےچین ہو کیوں آنسو پوچھو یہ کون ہمیں سمجھاتا ہے

ڈوبے کہ بچے اب کشتی کو گھبرا کے خدا پر چھوڑ دیا
ہم روک سکیں ممکن ہی نہیں وہ سیل جو امڈا آتا ہے

وہ شانِ کرم کا لطف کہاں قاصد بھی کہیگا اب جا کر
جب یاد تمہاری آتی ہے بےچین کوئی ہو جاتا ہے

ہم غرقِ تمنا ہونے کو نظارۂ ساحل سمجھے ہیں
اس بحر میں اک اپنا دل ہے جو ڈوب کے راحت پاتا ہے

احباب سبھی بہلانے کو ہم ذکر تمہارا کرتے ہیں
جب رات بھیانک ہوتی ہے ہر سمت اندھیرا چھاتا ہے

آئینگے بہت آنے والے جائینگے بہت جانے والے
یا نام خدا کا باقی ہے یا حسنِ عمل رہ جاتا ہے

الطاف میں بھی اخلاص میں بھی مقبول ہوئے سپرو صاحب
جب ذکرِ کرم ہم کرتے ہیں یہ نام زباں پر آتا ہے

انوار ہو تم تنویر ہو تم اخلاق کی اک تصویر ہو تم
توصیفِ مسز سپرو کے لئے اندازِ بیاں ڈھل جاتا ہے

اب کس سے کہیں اب کس سے کریں پیکانِ الم کا ہم شکوہ
کاوش ہے کہ بڑھتی جاتی ہے جتنا کہ یہ کھنچتا جاتا ہے

مختار ہیں یہ مجبور ہے دل گریہ کیلئے کچھ قید نہیں
جاتے ہیں اگر ان کی مرضی ہم کو بھی تو رونا آتا ہے

تم شاد رہو آباد رہو دنیا کو ہمیشہ یاد رہو
ہر نخلِ شرافت کھلتا ہے نیکی کا وہی پھل پاتا ہے

اس مختصر اقتباس سے جو تین چار اصنافِ سخن کی صورت میں ہے۔ تمام اہلِ ذوق نہایت آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ کہ حضرت دل کی جولانیِ طبع اگرچہ زیادہ تر غزل ہی کے میدان تک محدود ہے۔ مگر ان کی قادر الکلامی قلمروِ سخن میں تمام اصنافِ سخن پر حکمران ہے۔ حسنِ طبیعت اور کمالِ مشق کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے بہترین معیار یہی ہے۔ کہ مختلف اصنافِ سخن میں جوہرِ طبیعت کی آب و تاب یکساں نظر آتی ہو۔ حتےٰ کہ نہایت پھیکے اور بے لطف عنوانوں کے ماتحت بھی کوئی شعر ایسا نہ نکلے۔ جو حسنِ بیان کے لحاظ سے تہی دامن نظر آئے۔ قادر الکلامی کا یہ نمایاں وصف بہت کمیاب ہوتا ہے۔ حضرت دل کی خوش بیانی اس لحاظ سے بسا غنیمت ہے۔ بقول حضرت داغ۔ ؎

ایک ہوتی ہے ہزاروں میں طبیعت اچھی

جوش ملسیانی

مدیر حصۂ نظم

اعتبار الملک حضرت دلؔ شاہجہانپوری کے

حالاتِ زندگی

آپ کے کچھ کچھ سوانحی حالات تو رئیس التحریر جناب نیاز فتحپوری ایڈیٹر نگار نے اپنے مضمون میں سپردِ قلم کئے ہیں۔ میں بھی اپنی معلومات کے بھروسہ پر کچھ شذرات پیش کرتا ہوں ؎

نسب نامہ جناب مولوی ضمیر الحسن خاں صاحب دلؔ شاہجہانپوری ابن جناب خان احمد حسن ابن جمال الدین عرف قدرت علی ابن عزیز الدین ابن شاہ سرور ابن شاہ وارث ابن شاہ حکیم الدین ابن شاہ محمد واصل عرف بابا صاحب ابن شاہ قاسم سلیمانی رحمۃ

(نقل حالات حضرت شاہ قاسم سلیمانی از بحر ذخار)

آں سرزمرۂ مشائخ ذیشان آں سرگروہ عارفان آں معانی کمالاتِ معانی قطب روزگار حضرت شاہ قاسم سلیمانی از محتشمانِ طائفۂ مشائخ بغایت بزرگ و مجاہد و صاحب حالے قوی و نفسے قاطع و دستگیر داشت و اکثر شاہ بازان از آں صاحب کمال بہوائے کمال آمدند و در اوصاف المریدین نویسد کہ از اولاد آصف برخیا وزیر سلیمان علیہ السلام بود۔ اجدادش بر کوہ سلیمان میماندند۔ در وقتِ حضرت عمرؓ بر دست خالد بن ولید اسلام آوردند از خود بے محابا دلہ دو کس از ایشاں ہمراہ حضرت امام حسینؑ بر کربلا شربتِ شہادت چشیدند۔ حضرت شاہ قاسم سلیمانی از عمر ہفت سالگی فرائض صوم و صلوٰۃ ترک نکردہ و کبیرہ از وگاہی بعمل نیامدہ و مدام طاہر ماندے۔ بسلسلۂ قادریہ در بلدۂ بر دستِ سید عفیف الدین از اولاد محبوبؒ سبحانی غوث الثقلین مرید شد۔ و بعد شرفِ بیعت از خرقہ و خلافت شرف گشت یک خرقہ دیگر کہ موسوم بہ جبہ بود در صندوقچہ برائے شیخ امانت بود۔ پیر او عنایت کردہ و آں جبہ ہنوز در چلاسی کہ سی کروہ از پشاور است موجود است خلق زیارت آں میکند پس یک اربعین بحضور مرشد کشیدہ برائے حج بیت اللہ رفت و مناسک حج بجا آوردہ چندے در مکہ معظمہ و چندے در مدینہ منورہ ماندہ بہ کربلا رفت و بشرف زیارت مزار سید الشہداؑ و دیگر مشاہد مشرف شدہ بہ بغداد رفت۔ و بر مزار حضرت غوث الثقلینؓ یک اربعین کشید۔ پس زیارت حضرت امام علی موسےٰ رضا نمودہ بہ چلاسی رفت و بر مسند ارشاد نشست عالمے بوے تولد نمودہ سہ لک و یک صد یک مرید داشت از اں جملہ سہ و دو تن خلیفہ او صاحب ارشاد است پس الکثرت مریداں فیضی وغیرہ مقربان بارگاہ سلیمانی از

اکبر و جہانگیر جہا چہا فساد نمودہ آنجناب را بحضور طلب کرد۔ بادشہ آں را پا بزنجیر نمودہ و بقلعۂ چنارگڑھ فرستا و بقیہ عمر ہماں جا بطاعت و عبادت گزرانند خوارق عادت از وے بسیار مشاہدہ شد ایں ازاں کرامت بود کہ ہر پنج وقت نمازرا کہ محتاج وضو ست از دریا طلب نمود۔ آں وقت طرف جولاں دیدے فرمودے کہ از پائم برآئید از ہر دو پا جولاں برمی آید بعد وضو گفتے در پائم درآید از خود می آمد۔ وقت صبح روز چہارشنبہ ماہ جمادی الاول در سن یک ہزار و شانزدہ ہجری در قلعہ چنار گڑھ حق حق گویاں روح پاکش پرواز کرد۔ وہماں جا دفن شد۔

حضرت شاہ قاسم سلیمانی کو جو خلافت نامہ آپ کے پیر نے مرحمت فرمایا جس پر حضرت غوث الثقلین محبوب سبحانی محی الدین عبدالقادر جیلانی کی خاص مہر ثبت ہے۔ وہ اصل خلافت نامہ علاوہ دیگر اسناد کے آپ کے یہاں موجود ہے۔

مندرجہ بالا شذرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب دل شاہجہانپوری کے آباؤ اجداد اکابر زمانہ تھے۔

ہندوستان کا یہ مایۂ ناز شاعر ۱۸۷۵ء میں شاہجہانپور کے معزز افاغنہ گھرانے میں پیدا ہوا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم کے مدارج گھر میں طے کئے۔ خدا داد ذہانت اور طبع رسا کی بدولت آپ نے بہت جلد ترقی کر لی۔ پندرہ سال کی عمر میں شاعری کا چسکا پڑا۔ سب سے پہلے آپ نے یہ شعر نظم کیا۔

چلا ہے ابھی تیرِ مژگاں کسی کا ذرا اپنا اپنا جگر دیکھ لینا

سبحان اللہ شعر بلحاظ بندش کے کس قدر چست ہے ایک کمسن اور نوعمر بچہ کی زبان سے ایسا شعر سننا الہام سے کم نہیں، الشعراء تلامذۃ الرحمٰن کے اعتبار سے آپ قدرتی شاعر ہیں۔ آپ نے چند سال تک کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا۔

مشاعروں میں ذاتی انتخاب سے بلا اصلاح غزل پڑھی۔ استاد کامل کی جستجو رہی۔ انتہائی تجسس کے بعد جناب خدائے سخن منشی امیر احمد مینائی امیرؔ لکھنوی کو استاد منتخب کیا۔ کچھ زمانے تک بسلسلۂ خط و کتابت حضرت استاد سے اصلاح لی۔ بعد ازاں بمقام رامپور حاضر ہو کر زیارت استاد کا شرف حاصل کیا۔ چونکہ اپنے خال معظم اور ان کے ایک دوست کی معیت میں یہ سفر بعد واپسی شہر بدایوں کیا گیا تھا۔ بایں وجہ سرائے میں قیام کیا۔ حضرت استاد نے اپنے دولت کدہ پر قیام فرمانے پر اصرار فرمایا۔ مگر ہمراہیان کی وجہ سے معذرت کی۔ جب سرائے میں واپسی ہوئی۔ تو دوپہر کو عالیجناب حافظ جلیل حسن صاحب جلیلؔ (جو جانشین امیر استاد نظام اور نواب فصاحت جنگ جلیل القدر کے خطاب سے ممتاز ہیں) تشریف لائے۔ ملازم کے سر پر ایک خوان تھا جس میں کافی مقدار میں شیرینی تھی۔ فرمایا کہ جناب قبلہ نے بھیجی ہے۔ عرض کیا کہ فرض شاگرد کا ہے کہ استاد کی خدمت میں شیرینی پیش کرے۔ حضرت جلیلؔ نے فرمایا کہ جناب منشی صاحب قبلہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں ضمیر کو اسی نظر سے دیکھتا ہوں۔

جس نظر سے مسعود احمد (خلعت کوچک) کو۔ لہذا بچوں کو شیرینی کھلانا فرض بزرگی ہے۔ دوسرے روز بوقت حاضری شعر وسخن کا تذکرہ فرماتے ہوئے جناب منشی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ ضمیر تمہاری شوخ طبیعت ظاہر کر رہی ہے کہ دنیائے شاعری میں تمہارا مستقبل بہت نمایاں ہوگا۔ (سبحان اللہ حضرت استاد کی پیشگوئی بالکل درست نکلی) مگر شاعری کے لئے استعداد علمی کی کافی ضرورت ہے۔ لہذا اس طرف توجہ لازمی ہے ؂

فارسی کتب درسیہ کی تکمیل ہو چکی تھی۔ حسب الارشاد حضرت استاد عربی تعلیم شروع کر دی۔ معقول کی چند کتابیں مولوی سید محمد علی صاحب خیال سے پڑھیں۔ جو شاہجہانپور میں قابل شخصیت کے عالم تھے۔ کتب فقہ مولوی نادر الدین پشاوری سے پڑھیں جو شمس العلما مولوی عبد الحق صاحب علامہ خیرآبادی کے شاگرد رشید تھے۔ فقہ کی تکمیل کے بعد مشکوٰۃ شریف اور تفسیر جلالین مولوی بشیر احمد صاحب مرادآبادی اور مولوی عبد الباسط خاں صاحب شاہجہانپوری سے پڑھیں۔ ازاں بعد علم طب کا درس جو خاندانی پیشہ چلا آتا تھا شروع کر دیا۔ مولوی حکیم محمد صاحب سے جو نہایت مستند عالم اور علم طب میں حاذق الملک حکیم عبد المجید خاں دہلوی کے شاگرد رشید تھے تکمیل کی۔ قانون تک تعلیم ختم ہو چکی تھی کہ مولوی محمد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ حکیم محمد بشیر اللہ خاں صاحب (جو آجکل ریاست بھوپال میں نائب افسر الاطبا ہیں) کے مطب میں عملی مشغلہ شروع کر دیا۔ حکیم صاحب موصوف کا مطب اس وقت اعلیٰ پیمانے پر تھا تین سال تک مطب میں شریک ہو کر سند حاصل کی۔ اور اب بلا منفعت بغرض رفاہ عام یہ کار خیر جاری ہے۔ جب حضرت امیر مینائی لکھنوی حسب الطلب نظام حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ اور چند روز قیام فرما کر رحلت فرما گئے۔ تو پھر کسی استاد سے مشورۂ سخن نہیں کیا۔ علم عروض و بیان ذاتی مطالعہ کا حاصل ہے ؂

لطائف { حکیم جعفر حسین صاحب کاشف لکھنوی جو جناب رشک لکھنوی کے شاگرد تھے اور شاعری میں ذہن رسا رکھتے تھے بغرض علاج حضرت حافظ احمد حسین خانصاحب تشریف لائے۔ اشعار سنکر فرمایا۔ کہ مجھ کو بلحاظ سن یہ یقین نہیں آتا کہ یہ تمہارے اشعار ہوں۔ امتحاناً یہ طرح دی ؏

ہم رکھ کے کہیں بھول گئے طاق میں غنچہ

طاق قافیہ۔ میں غنچہ ردیف۔

فرمایا کہ ہمارے روبرو پانچ شعر نظم کر کے پڑھو۔ ایک گھنٹہ کی فکر میں گیارہ شعر نظم کر کے سنائے حکیم صاحب نے بغور سنکر فرمایا کہ ہم نے تم کو شاعر تسلیم کر لیا۔ سندیلہ کے عظیم الشان مشاعرہ میں کوئی قافیہ مخصوص کر کے منجانب تعلقہ دار صاحب سندیلہ انعامی طلائی تمغہ مرحمت فرمایا جاتا تھا۔ اس کے مجوز علاوہ دیگر نقادانِ سخن کے آپ بھی رہے ؂

شوق سندیلوی نے سولہ غزلوں پر مشاہیر اساتذہ سے اصلاح کرا کر اصلاح سخن کے نام سے ایک کتاب شائع کرادی جس میں شعرا کے خطوط بھی شامل ہیں۔ اس رسالہ میں آپ کی بھی اصلاحیں ہیں ؂

کسی کے کلام پر عیب جوئی کی عادت نہیں۔ مشاعروں میں بے تکلف داد دیتے ہیں۔ ایک مشاعرے میں ایک مبتدی شاعر نے آپ کو مخاطب کر کے شعر پڑھا۔ آپ نے بے تکلف داد دی۔ ایک کہنہ مشق شاعر پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ ایسی داد نہ دیا کیجیے۔ کیونکہ آپ کی داد سند سمجھی جائے گی۔ جواب دیا۔ کہ یہ میرا اخلاقی فرض ہے کہ کوئی شاعر مجھ کو خطاب کر کے شعر پڑھے تو میں اس کی حوصلہ افزائی کروں ؎

آر۔ کے۔ آر۔ ریلوے کی تشخیص معاوضہ پر ڈپٹی نذیر حسین صاحب بلگرامی مامور تھے۔ ایک چاہ کے معاملہ پر بمقابلہ چچا صاحب کے مقدمہ دائر تھا۔ عند الملاقات آگاہ ہو کر کہ آپ شاعر بھی ہیں۔ ڈپٹی صاحب نے فرمایا۔ کہ میرے بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔ لوحِ مزار پر نصب کرنے کے لئے ایک قطعہ تاریخ کی ضرورت ہے۔ آپ براہ کرم قطعہ تاریخ نظم فرما دیجئے۔ بلحاظ مذہب اثنا عشری قطعہ نظم کیا ؎

سید رضا حسین حسینی بہ فضلِ رب — اعلائے مقام خویش زہفت آسماں نمود
اے دلؔ زفکرِ مصرعۂ تاریخ گفتہ ای — در حبِّ اہل بیت بجنت مکاں نمود

آخری مصرعہ تاریخی ہے۔ جناب ڈپٹی صاحب بیحد ممنون ہوئے۔ اور مقدمہ آپ کے حق میں فیصل کیا ؎

سید انور حسین صاحب عرف ننھو صاحب آرزو لکھنوی جانشین جناب جلال لکھنوی کا قول ہے:۔
کہ اب تک دو باتیں مری سمجھ میں نہیں آئیں۔ دریافت فرمایا۔ کہ آپ افغان ہو کر اس قدر منکسر المزاج۔ اور حضرت بیباک شاہجہانپوری سید ہو کر اس قدر مغلوب الغضب کیوں واقع ہوئے۔ فی الواقعہ آپ کا پایۂ اخلاق بہت بلند ہے ؎

بیحد منکسر المزاج ہیں طبیعت میں متانت اور سنجیدگی نہایت درجہ کی ہے۔ الغرض آپ مجسمۂ شرافت ہیں ؎

شکل و صورت و اخلاق جناب دلؔ دراز قامت۔ سبک اندام۔ سنجیدہ و متین۔ شکل و شمائل کے لحاظ سے حسین وجمیل ہندوستانی شرفا و رؤسا سے ہیں۔ آواز نہایت شیریں وصاف طبیعت شگفتہ و شاداب ہے۔ جس طرح آپ طباع شاعر ہیں۔ اسی طرح تبحر عالم بھی ہیں ؎

آج تک آپ کی زبان سے کسی کی برائی نہیں سُنی۔ ہندوستان میں بلحاظ بلندیٔ اخلاق صرف آپ ہی کی ہستی حسنِ انتخاب میں آسکتی ہے۔ زمانہ جانتا ہے۔ کہ مرزا یگانہ چنگیزی اور مرزا عزیز لکھنوی کے درمیان کس قدر اختلافات رہے۔ اسی طرح اکثر معاصرین میں نوک جھوک اور چشمک رہتی ہے۔ مگر جناب دلؔ کے معاصرین کے ساتھ اس قدر خوشگوار تعلقات ہیں۔ کہ حیرت ہوتی ہے۔ آپ شکل کے لحاظ سے واقعی انسان مگر بلحاظ سیرت فرشتہ ہیں۔ یہ وصف جناب دلؔ ہی کے لئے قدرت نے مخصوص کر رکھا ہے۔ اکثر مشاعروں میں جہاں دو مخالف پارٹیاں موجود ہیں۔ آپ ثالث بن کر اس خوبی سے ترتیبِ غزل خوانی قائم کرتے ہیں۔ کہ دونوں فریق آپ سے

خوش ہو جاتے ہیں۔ شرم و حیا ان کے اخلاق کا خاص جوہر ہے۔ طبیعت میں ملنساری۔ ہمدردی۔ شفقت ہی امتیازی کے نمایاں وصف نظر آتے ہیں۔ آپ کثیر الاحباب ہیں اور تلامذہ کی غیر معمولی تعداد کے استاد ہیں ہندستان کے ہر حصہ میں آپکے شاگرد پائے جاتے ہیں۔ مدراس۔ بمبئی۔ وسط ہند۔ بنگال۔ یو۔پی۔ پنجاب۔ پشاور بلوچستان وغیرہ وغیرہ بلاد میں آپ کے نامور تلامذہ پھیلے ہوئے ہیں ؛

دُور دراز شاگردوں کے کلام کی اصلاح مراسلت ہی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ خط و کتابت کا سلسلہ باقاعدہ طور پر پابندئی وقت کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ اور جواب دینے میں بھی بہت مستعد ہیں ۔

خلق و تواضع کے ساتھ آپ کو اپنی خود داری اور عزت و توقیر اور اپنے مرتبہ کا بھی بہت بڑا خیال رہتا ہے بڑے بڑے امراء سے جناب دل برابری سے ملتے اور اپنی علو شان کا لحاظ رکھتے ہیں ؛

کہا جاتا ہے۔ کہ ہر فطرتی شاعر کی زندگی غم و آلام کا دفتر ہوتی ہے۔ جب اس مقولہ کی اصلیت پر نظر غائر ڈالی جاتی ہے۔ تو متاخرین میں سے ہندوستان کی مخصوص اور ممتاز ہستیوں میں میرتقی۔ غالب و مومن مرحوم اور دَور حاضر میں جناب دل شاہجہانپوری۔ لسان الملک ریاض خیرآبادی۔ مرزا یگانہ چنگیزی وغیرہ باکمال شعراء کی زندگی یکسر حسرت و یاس کا مرقع ہے ؛

منجملہ ریاض و یگانہ کے جناب دل صرف خانگی بکھیڑوں۔ اپنی رفیق زندگی کی غیر معمولی علالت کے اثر سے پریشان نظر آتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ مصائب و آلام سے لذت چشیدہ ہونا شاعر اعظم کے لئے ناگزیر ہے۔ اس لئے اگر جناب دل پر یہ اثر گہرا ہے۔ تو جائے تعجب نہیں۔ بلکہ جائے مسرت ہے کہ قدرت کو انہیں چمکانا مقصود ہے۔ جناب دل کے بعض بعض خطوط سے بھی ان کے سوانحی حالات کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔ راقم الحروف کے پاس **مکتوباتِ دل** مرتب کردہ کتابی شکل میں موجود ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ جو کہ خالی از ادب لطیف نہیں ہیں :۔

۱۳؍ اگست ۱۹۲۳ء دل نواز۔ سلام نیاز

محبت نامہ کاشف حالات ہوا۔ الحمدللہ کہ میں بخیریت ہوں۔ لیکن جناب بھائی صاحب کی طبیعت بدستور ہے۔ مرض میں کوئی افاقہ نہیں۔ بلکہ ضعف بڑھتا جاتا ہے۔ شافئ مطلق اپنے حبیب کے طفیل سے ان کو صحت تامہ عطا فرمائے۔ جناب میرے انداز کی ستائش فرماتے ہیں۔ یہ صرف حسن ظن ہے۔ ورنہ ادبا کی بارگاہ کا ناقابلِ التفات ذرہ ہوں۔ بے ترتیب الفاظ میں اپنے پریشان خیالات کا اظہار کر لیتا ہوں میرے حالات زندگی ہمیشہ غیر مطمئن صورت میں شکوہ سنج زمانہ رہے اور ہیں۔ علاوہ دیگر تفکرات کے میری اہلیہ کے دائمی امراض ہیں۔ آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں۔ کہ انہیں زندگی کی وہ علالت جو اپنے توحش دماغ کے

ساتھ ہم جلیس پر بھی اثر ڈالے کہاں تک مسرت آفرین ہو سکتی ہے ٭

والدہ برخوردار شبیر حسن سلمہ غیر معمولی زمانہ سے بعارضہ امراض رحم مبتلا ہے جس زمانہ میں دَورہ پڑتا ہے دماغ ماؤف ہو کر مختل ہو جاتا ہے۔ یہ حالت میرے سکونِ قلب پر اثر ڈالتی ہے۔ گویا نیم دیوانہ سا بھی ہو جاتا ہوں۔ ایسی صورت میں آپ اندازہ فرمایئے۔ کہ میرے شاعرانہ خیالات سے اہلِ ذوق کیا لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ صرف احباب کی ذرہ نوازی ہے۔ کہ دل سوز نالوں یا بے ہنگام نرالوں سے ان کے پُر خلوص قلب میں کیف پیدا ہو جاتا ہے چمن ہستی میں جب میری نگاہیں غنچہ نو شگفتہ کی طرف اٹھتی ہیں۔ تو میرے دل میں نشاط آفرین امنگ پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر صرف چند لمحات کے لئے۔ کیونکہ جب ان پھولوں کی طرف دیکھتا ہوں۔ جو بحالتِ پژمردگی فرشِ خاک پر پڑے ہوئے اپنی بیکسی کا خود ماتم کر رہے ہیں۔ تو بے اختیار میری روح کی تازگی اشکوں سے بدل جاتی ہے۔ لب جُو موجوں کا فرحت انگیز منظر اور سبزہ کی رعنائی جب دیکھتا ہوں۔ تو میرا مغموم دل چند ساعت کے لئے قابلِ سرور ہو جاتا ہے۔ لیکن حبابوں کا ابھر کر فوراً مٹ جانا میری نظروں کے سامنے عبرتناک نقشہ کھینچ دیتا ہے۔ تاہم میں مایوس نہیں ہوں۔ زمانہ کی رفتار میری نظر میں ہے۔ شبِ تاریک کے بعد روزِ روشن کی امید اور خزاں کے بعد بہار کا زمانہ مجھ کو پیغامِ مسرت پہنچا رہا ہے۔ کیا عجب جو میرا دورِ ناکامی جلد از جلد ختم ہو جائے۔ اور میں نشاط انگیز زندگی کے ساتھ احباب کی تفریح کا باعث ہو جاؤں۔ اگر یہ بھی نہ سہی تو میری افتادہی پر احباب ہنسنے لگیں گے جو فطرت انسانی میں داخل ہے۔ رِندسرشت عابد صاحب کی یہ عنایت ہے۔ کہ مجھ نقاصوں سے مجھ کو بیدار کئے ہوئے ہیں ٭

نیاز کیش

دلؔ

ایک اور مکتوب گرامی میں اپنے کسی عزیز شاگرد کو لکھتے ہیں:۔

۲۲ر مئی ۱۹۲۸ء ۔ شاہجہانپور

دلنواز ۔ سلام نیاز

جناب کے دو نو خط پہنچے۔ یاد فرمائی کا شکریہ میری پریشانیوں کی داستان اس قدر طولانی ہو گئی۔ کہ مجبوراً مختصر نویسی اختیار کر لی ہے۔ بہرحال خدا کا شکر ہے۔ نظامِ زندگی دو حالتوں پر قائم ہے۔ سکون اطمینان۔ اضطراب و پریشانی۔ آج کل صنفِ ثانی کا دَور ہے۔ دیکھئے یہ حالت کب تک قائم رہے۔ بھائی صاحب کے انتقال نے مجھ کو چند در چند افکار میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں ضعیف القلب انسان ہمیشہ دنیاوی جھگڑوں سے علیحدہ رہا۔ ممکن ہے کہ اس میں کچھ مصلحت ہو۔ ہر اضطراب کے بعد سکون قانونِ قدرت ہے۔ منتظر ہوں کہ مجھ کو سکون کب حاصل ہوگا۔ اس طرف کئی مقامی مشاعروں میں مجھ

شریک ہوا لیکن تازہ کلام سنانے سے قاصر رہا۔

برخوردار شفیق حسن سلمہٗ کی تعلیم اب شروع ہوئی ہے۔ ابھی نوگرفتار ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ابا میاں ہم کو پڑھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ کھیلنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

نیاز کیش
دلؔ

دیکھئے ایک نامور شاعر کے پیچھے کس طرح پریشانیاں لگی ہوئی ہیں۔ یہ پریشانیاں۔ یہ غم و آلام جس سے عام انسان ورمغموم ہوتے ہیں۔ ایک بلند خیال شاعر اس سے کیا کیا درس لے رہا ہے۔ یہی وہ چیز ہے۔ جو فطری اور غیر فطری شاعر میں فرقِ مراتب پیدا کرتی ہے۔

جب شعرا گردوپیش کے مشاہدات و مناظر کو و رازکار اور فوق الفطرت طور پر بیان کرتے ہیں۔ تو وہ بیان ان کے عینی نظارہ پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ نام نہاد شاعر ہیں۔ جو محض الفاظ کے پس و پیش سے تمثیلات تیار کرتے ہیں۔ اور نابینا ہونے کے باعث خود ان کو دیکھ نہیں سکتے ہیں۔

ہم جناب دلؔ کی کتابِ زندگی کے اوّلین اوراق پر جناب نیازؔ نے جو دو چار سطور لکھی ہیں۔ وہ اہلِ نظر کے لئے ایک دفتر سے کم نہیں۔ فی الواقع یہ امر قابل مطالعہ ہے۔ کہ آجکل وہ کس عالم میں رہتے ہیں۔ اور ان حالات سے ان کی شاعری پر کیا اثر پڑا۔

ایک اور خط ان کی داستانِ حیات کا بہترین مرقع ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:۔

۱۲ر نومبر ۱۹۳۲ء

دلنواز۔ سلام نیاز

میرے دل و دماغ اب تک انہیں پریشانیوں سے اثر پذیر ہیں۔ ایام سرما بوجہ تحریک نزلہ چند سال سے صحت کو خراب کر رہا ہے۔ تین چار یوم تک بوجہ تولید ریاح فم معدہ میں درد کی شکایت نے مجھ کو بیحد بے چین رکھا۔ مگر اب سکون ہے ۔ . . . . . سے مجھ کو کوئی شکایت نہیں۔ شاعر دنیا میں مظلوم پیدا ہوا ہے۔ دورِ قدیم میں عدو کی شکایت کی جاتی تھی۔ مگر اب شکوہ شاعر قسمت تک محدود ہے۔ شاعر بشرطیکہ فطری شاعر ہے۔ موت کے بعد حیات حقیقی پاتا ہے۔ خیر آنچہ گزشت گزشت۔

میری روح و دماغ کو تازہ کرنے کے لئے جناب فضاؔ کا اخلاص کافی ہے بوستانِ پنجاب کے آپ عرفانی پھول ہیں۔ برخورداران سلام عرض کرتے ہیں۔

نیاز کیش
دلؔ

ہم گذشتہ صفحات میں لکھ چکے ہیں کہ جناب اعتبارؔ الملک مخلص بے ریا۔ اور احباب نواز ہیں۔ چنانچہ باوجود

خانگی تکالیف اور امراضِ عزیزان سے طبیعت مضمحل ہونے کے تقاضائے احباب سے مجبور ہو کر الہ آباد، سیتاپور، لکھنؤ، کانپور وغیرہ مقامات کے مشاعروں میں شرکت بھی فرماتے ہیں۔ اس موقع پر ان کا ایک مکتوب درج کیا جاتا ہے جو ایک اعلےٰ پیمانہ کے مشاعرہ کا بہترین مرقع ہے ؛

۲۰ مارچ ۱۹۳۴ء شاہجہانپور مکرم و دلنواز۔ سلام نیاز

غیر معمولی زمانہ ہوا کہ میں بارگاہِ فضلت سے بے خبر ہوں۔ اوّل تو جناب بھائی صاحب کے انتقال نے مجھ کو خانگی کشمکشوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اطمینان اور سکون سے ناآشنا ہوں۔ دوئم مشاعرۂ نمائش کی وجہ سے مصروفِ انتظام رہنا پڑا۔ ۱۴ فروری ۱۹۳۴ء کو الہ آباد میں غیر معمولی پیمانہ پر مشاعرہ تھا۔ کئی طلبی نامے آئے۔ انکار لکھ دیا۔ مگر تحریکِ شرکت جاری رہی۔ کلکٹر صاحب نے بھی مجبور کیا۔ کہ ضرور شریک ہو جیئے۔ وہاں جا کر شعراء سے بابت شرکت مشاعرہ شاہجہانپور تبادلہ خیال بھی ہو جائیگا۔ میں گیارہ فروری کو ۴½ بجے شام کی ٹرین سے الہ آباد روانہ ہوا صبح پانچ بجے گاڑی الہ آباد پہنچتی ہے۔ اسٹیشن پر جناب ماجد علی صاحب وکیل سرکاری ہائی کورٹ بغرض استقبال موجود تھے۔ بسواری موٹر ہم لوگ ایک کوٹھی تک جو قریب مقام مشاعرہ تھی۔ پہنچا کر ایک منتظم کی تحویل میں دیدیئے گئے۔ اس کوٹھی میں جناب صفی لکھنوی، ظریف لکھنوی، عزیز لکھنوی، قمر بدایونی۔ سیماب اکبر آبادی پیشتر سے موجود تھے۔ لکھنؤ سے جناب بیخود موہانی، حکیم آشفتہ لکھنوی۔ سراج لکھنوی۔ قدیر لکھنوی کا ساتھ ہو گیا تھا۔ قریب دس بجے کے میں مع تیج بہادر سپرو کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ تعارف جناب کلکٹر صاحب کی ایک چٹھی کے ذریعہ سے تھا جو سر صاحب کے خلف الصدق ہیں۔ سر صاحب بہت اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔ ایک گھنٹہ تک نیاز مندی کا موقعہ دیا۔ بعد واپسی قیام گاہ پر طعام سے فارغ ہو کر شعراء مشاعرہ کے اسٹیج تک پہنچائے گئے۔ بارہ بجے دن سے آغاز مشاعرہ تھا۔ ڈاکٹر سر سلیمان شاہ صاحب چیف جسٹس صدر مشاعرہ تھے۔ مقامی شعراء کا دَور شروع ہوا۔ تمام مشاہیر قریب قریب موجود تھے۔ سائل صاحب دہلوی۔ حسرت موہانی۔ نوح صاحب ناروی۔ ساحر دہلوی۔ تاباں بدایونی۔ ہادی مچھلی شہری۔ کس کس کا نام لیا جائے۔ سب ہی شریکِ بزم تھے۔ ۵ بجے شام تک یہ دَور رہا۔ تمام معززین شریک تھے۔ ہاں خوب یاد آیا۔ آغاز مشاعرہ سے پہلے جناب نوح صاحب نے اپنے تلامذہ کو بلا کر باعظمت طریقہ سے میرا تعارف کرایا جو قدمبوسی کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ جناب نوح صاحب سے میرا قدیمی برادرانہ خلوص ہے۔ ۸ بجے سے دوسرا دَور شروع ہوا۔ میں نے ۸۰ نمبر پر غزل پڑھی۔ آخری نمبر ۸۴ تھا۔ میرے بعد چار بزرگ معمر ہستیاں باقی رہ گئی تھیں۔ ختم مشاعرہ سر شاہ سلیمان صاحب نے چار بجے شام کے لئے اپنی کوٹھی پر دعوت چاء نوشی دی۔ ہم لوگ اس وقت پر موصوف کی کوٹھی پر حاضر ہوئے۔ اس دعوت میں مخصوص شعراء تھے۔ ممدوح نے نہایت اخلاق کے ساتھ استقبال کیا تکلف کے ساتھ چاء نوشی ہوئی۔ بعد ازاں غیر طرحی کلام پڑھا گیا۔ ۹ بجے شب کو مجھ سے سر صاحب نے فرمائش کی کہ

کی گئی۔ ازاں بعد میں نے اجازت رخصت چاہی کیونکہ میں گیارہ بجے کی گاڑی سے واپس آنے والا تھا۔ چیف جسٹس صاحب نے میری درخواست نامنظور کی فرمایا کہ بغیر ختم دور میں اجازت نہ دونگا۔ اسٹیشن تک پہنچا دینا میرا ذمہ ہے۔ یہ دَور دس بجے ختم ہوا۔ تبر صاحب میرے ساتھ اُٹھے۔ اور اپنے ڈرائیور کو طلب کیا حکم دیا کہ مجھ کو "موٹر پر سوار کر کے اور قیامگاہ سے اسباب لے کر اسٹیشن تک پہنچا دو۔ یہ اخلاق ممدوح کا ہمیشہ یاد رہیگا۔ میں ۲۵ فروری کو شاہجہانپور واپس آیا۔ میرا کلام بعنایت الٰہی نہایت مقبول ہوا۔ چونکہ گوالیار میں ۲۶ فروری کو اعلیٰ پیمانہ پر مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بایں وجہ مشاہیر وہاں کی شرکت کا وعدہ کر چکے تھے۔ خیرآباد ضلع سیتاپور میں ۲۴ کو بڑا مشاعرہ تھا۔ تاہم شاہجہانپور کا مشاعرہ کامیاب رہا۔ اکثر صاحبان شریکِ بزم ہوئے۔ ابوالعلا حکیم ناطق صاحب لکھنوی۔ آثر صاحب لکھنوی۔ منظر صاحب لکھنوی۔ قدیر صاحب لکھنوی میرے مہمان تھے۔ مرزا احسان احمد صاحب بی۔ اے ایل۔ ایل بی۔ آصغر صاحب گونڈوی۔ جناب مرزا سلطان احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر کے ہاں قیام پذیر تھے۔ باقی شعرا مختلف مقامات پر ٹھہرائے گئے۔ مقامی شعرا صرف ۱۲ کی تعداد سے لئے گئے تھے۔ الہ آباد کے مشاعرہ کی غزل اور شاہجہانپور میں جو کچھ سنایا وہ پیش کرتا ہوں۔

امید ہے کہ جناب بخیریت ہوں گے ٭ آپ کے پہلو میں رہنے والا

دل

علامہ مولوی عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقی اردو حیدرآباد کا قول ہے۔ کہ ادب میں سینکڑوں دلکشیاں ہیں۔ اس کی بے شمار راہیں اور اَن گنت گھاتیں ہیں۔ لیکن خطوں میں جو جادو ہے (بشرطیکہ خط لکھنا آتا ہو) وہ اس کی کسی ادا میں نہیں نظم ہو۔ ناول ہو۔ ڈرامہ ہو یا کوئی اور مضمون ہو۔ غرض ادب کی تمام اصناف میں صنعت گری کرنی پڑتی ہے۔ اور صنعت گری کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ بناوٹ کی باتیں بہت جلد پُرانی اور بوسیدہ ہو جاتی ہیں صرف سادگی ہی ایسا حسن ہے جسے کسی حال اور کسی زمانہ میں زوال نہیں۔ بشرطیکہ اس میں صداقت ہو۔ اور ہم میں سے کون ہے۔ جس کے دل میں سچ کی چاہ نہیں؟ یہ ہمارے خمیر میں ہے۔ یہ ہماری فطرت کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔ جھوٹا بھی یہ نہیں چاہتا۔ کہ کوئی اُس سے جھوٹ بولے یہی وہ فطری تقاضا ہے۔ کہ بعض اوقات ہم ایک سادہ سی صداقت کی خاطر دلکش سے دلکش نظم اور دلچسپ سے دلچسپ ناول کو اُٹھا کے الگ رکھ دیتے ہیں۔ ہماری ہر تصنیف و تالیف۔ ہماری ہر علمی اور ادبی کوشش جو قلم سے نکل کر کاغذ پر آتی ہے۔ غیروں کے لئے ہے۔ اور یہ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ کہ غیروں کے ہاتھ میں جائے گی۔ اور غیروں کی نظریں اس پر پڑیں گی۔ اس لئے مصلحتِ وقت کا بھی خیال ہوتا ہے۔ عبارت آرائی بھی کرنی پڑتی ہے۔ تکلفات بھی برتنے پڑتے ہیں۔ خیال کو صاف صاف لکھنے کی بجائے طرح طرح کے پیرائے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن جب انسان اپنے کسی عزیز دوست کو خط لکھتا ہے تو وہاں کوئی غیریت باقی نہیں رہتی۔

بلکہ بسا اوقات دوئی کا پردہ بھی اٹھ جاتا ہے۔ وہ ہر مسئلہ اور ہر شے کے متعلق جیسا اس کا خیال ہوتا ہے صاف صاف اور سچ سچ لکھ دیتا ہے۔ وہ اپنی رائے میں آزاد ہوتا ہے۔ نہ دوسروں سے چوکتا نہ اپنے آپ کو چھوڑتا ہے اس وقت اُسے خوف لاحق ہوتا ہے۔ نہ نکتہ چینی کا کھٹکا۔ خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو بھالیتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اُسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے۔ اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر درد سے لبریز ہو جس میں ہمدردی بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کے بھری ہو جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو۔ تو بتاؤ کہ اس دل کی تراوش کیسی ہو؟ اگر آپ ایسے دل کی زیارت کرنی چاہتے ہیں تو آؤ دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ہوا ہے:

جناب دلؔ اپنے ایک بے تکلف عزیز کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ۔

۳ ۲۵/۳

دلنواز۔ سلام نیاز۔ معلوم نہیں کہ مرسلہ خط کا مخاطب کون ہے۔ میں نے کبھی موصوف کے کلام پر اصلاح نہیں دی اس لئے ظن غالب بھی ہے۔ کہ آپ سے خوش قسمت مخاطب اور مصلح ہیں۔ حسب التحریر مناسب ترمیم کر دی یہ معلوم ہو کر بہت مسرت ہوئی کہ جناب بھی قدردان حسن ہیں۔ اور ان پُرلطف گلگشت و شعار گلزار کوچوں میں آپ نے بھی خاک چھانی ہے۔ تغزل میں جوش اس وقت تک نہیں پیدا ہوتا جب تک نظر ... ن اور قلب جلوۂ رعنا سے اثر پذیر نہ ہو۔ میں بھی غیر معمولی زمانہ تک آستانِ حسن دلکش پر جبیں فرسا رہا ہوں۔ داغ ناکامی ہنوز باقی ہے بہر حال اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ تخیل میں سوز و گداز پیدا ہو گیا۔ اور یہی میرا مقصود تھا حصول مدعا عشق کی فطرت نہیں۔ شاعر کے لئے قلب پُر درد لازمی ہے۔ ورنہ نقاشی دلکش نہیں ہوتی۔

میرے خاص خطوط جن کو ایک زمانہ میں میں نے خونِ دل سے لکھا تھا مکتوب الیہ کے پاس ہونگے۔ مگر ان کا ملنا دشوار ہے:

آپ کا

دلؔ

ان چند خطوط سے جناب دلؔ کے بعض حالات جو اب تک زمانہ کی نظروں سے پنہاں تھے۔ واضح ہو جائینگے۔ کہ جناب دلؔ کتنے بلند اخلاق کے مالک ہیں۔ ان کا ذوقِ عشق کتنا پاکیزہ ہے۔ وہ کس قدر صاف گو اور پاک باطن ہیں۔ ان کی تحریر سراسر خلوص سے معمور ہے۔ اپنے خیالات کو کس دلکش پیرائے میں بے تکلف لکھے جاتے ہیں۔ کہ بے اختیار دل لوٹ جاتا ہے:

نثر میں مکتوبات دل کے علاوہ آپ نے ریحان شباب میں دردِ دل کے عنوان سے ۱۹۰۸ء میں ایک ناول لکھا تھا۔ جو نہایت مقبول ہوا۔ یہ ناول علیم اور محبوبہ کی محبت کا دلچسپ شاہکار ہے۔ اس میں قوم کی ابتر حالت عیش پسندی اور بادہ نوشی کے خراب نتیجوں کا فوٹو اس خوبی کے ساتھ کھینچا گیا ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ اس میں نثر کے بعض بعض ٹکڑے دل میں رکھ لینے کے قابل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دردِ دل کا افسانہ بالکل سچا افسانہ ہے۔ محض نام و مقام کی تبدیلی کی گئی ہے۔ یہ افسانہ اس قابل ہے کہ اس کی فلم تیار کی جائے اور پبلک میں پیش کیا جائے۔ مصنف نے اس کا ایک ہی ایڈیشن شائع کیا تھا۔ افسوس ہے کہ آج اس کی ایک کاپی کا ملنا بھی محال ہے۔ اندازِ تحریر بہت پُرجوش اور دلآویز ہے۔ ہمارے خیال میں اس ناول کا ایک اور ایڈیشن پبلک میں ضرور آنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ ناول خاص قدر و منزلت کا مستحق ہے۔ بڑے سائز پر ۲۵۶ صفحات پر محیط ہے۔

آپ کی دوسری تصنیف دل سوز ہے جو ۱۹۰۸ء میں پیام یار کے ہمراہ شائع ہوا۔ ایک انگریزی تاریخی ناول کا ترجمہ ہے۔ مسئلہ تناسخ پر محققانہ بحث ہے۔ اس کتاب سے مصنف کے تبحرِ علمی۔ قوتِ استدلال۔ رفعتِ خیال۔ قوتِ بیان کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ یہ کتاب بڑے سائز کے ۸۸ صفحات پر ختم کی گئی ہے ❊

اس کا بھی ایک ہی ایڈیشن شائع ہوا ❊

(غیر مطبوعہ کتب) ا۔ فرنگی محل لکھنؤ کے شاعر رضا لکھنوی نے آپ سے غیر معروف محاورات اور ضرب الامثال اشعار میں نظم کرنے کے لئے فرمائش کی۔ آپ نے چھ سات سو کے قریب خود ساختہ اشعار میں محاورات کو نظم کر دیا۔ وہ کتاب ان صاحب سے کوئی اور صاحب لے گئے۔ افسوس کہ اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ ورنہ اردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہو جاتا ❊

۲۔ متروکاتِ دل۔ جناب دل کے بستوں میں لپٹی ہوئی رہے۔ دیکھئے کب شائع ہو۔ زبان کے عجیب عجیب نکات بیان کئے گئے ہیں ❊

۳۔ جدید رنگ تغزل۔ نہایت دلچسپ رسالہ ہے۔ ضخامت سو صفحات کے قریب ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد شائع ہوگا ❊

۴۔ گلکدہ پر تبصرہ۔ مرزا عزیز (مرحوم) لکھنوی کے دیوان پر ایک معرکۃ الآرا مضمون سپردِ قلم کیا تھا۔ غالباً جناب عزیز نے کسی رسالہ میں باقساط شائع کیا تھا۔ یہ پُرمغز مضمون آپ کی ہین نکتہ سنجی کی دلیل ہے۔ چالیس صفحات پر حاوی ہے ❊

علاوہ ازیں آپ نے متعدد مضامین مختلف صنفِ کلام پر لکھے۔ جو اکثر و بیشتر ملک کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں ❊

تقسیم اوقات موسم گرما میں صبح ۶ بجے سیر و تفریح سے فارغ ہو کر دس بجے تک مریضوں کو دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد شاگردوں کے کلام پر اصلاح دی جاتی ہے۔ روزانہ پندرہ بیس غزلیں دیکھی جاتی ہیں۔ گیارہ بجے کے بعد کھانا کھا کر آپ دوپہر کو راحت فرمایا کرتے ہیں۔ پھر شام کے ۴½ بجے کے بعد ۶ بجے تک شاگردوں کے کلام پر اصلاح اور احباب سے ملاقات کا مشغلہ جاری رہتا ہے۔ آپ اپنی غزلیں گرما کے موسم میں صبح کے وقت اور سرما میں رات کے وقت دنیا کے جنجال کو خیر باد کہہ کر لکھا کرتے ہیں ؛

سردیوں میں ۱۰ بجے تک مطب کا کام اور پھر احباب سے ملاقات اور اصلاح کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ شام کے چار بجے کے بعد اصلاح کا کام بند کر دیا جاتا ہے ؛

آپ مطب کا کام محض رفاہ عام کے لئے کرتے ہیں۔ ہزاروں مریض آپ کے دستِ شفا سے شفایاب ہو کر جاتے ہیں۔ صبح کے وقت آپ کا مطب ایک ہسپتال کا منظر نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے ؛

لباس آپ کا لباس شرفا اور رؤسا کا سا ہوتا ہے۔ سادہ کرتہ یا قمیض پہن کر اوپر سے شروانی پہنتے ہیں۔ لباس صاف ستھرا ہلکا سا نفاست سے تیار کیا ہوا پسندِ خاطر ہے ؛

غذا آپ کی غذا پُر تکلف ہوتی ہے۔ نو وارد مہمان کا دل یہی چاہتا ہے کہ آپ کے دسترخوان کی ایک ایک چیز سمیٹ جاؤں۔ کھانا کھانے کے بعد سردیوں میں چار اور گرما کے موسم میں نفیس نفیس آم بھی کھائے جاتے ہیں۔ داغ مرحوم اور جلیل صاحب نے اپنے اپنے اشعار میں جس قدر آموں کی قسمیں گنوائی ہیں۔ وہ شاہجہانپور میں جناب والی کے باغات میں موجود ہیں ؛

سیر و سیاحت آپ کو سیر و سیاحت کا بھی بہت شوق ہے۔ بغرضِ سیر آپ نیپال بھوٹان بھی گئے۔ دارجیلنگ شملہ دہلی۔ جنوبی ہند۔ وغیرہ میں تشریف لے جاتے رہے۔ شکار کا بہت شوق ہے۔ اب بھی جب طبیعت میں امنگ پیدا ہوتی ہے سیر کے بہانے سے اکثر دُور دراز مقامات پر شکار کے لیے نکل جاتے ہیں ؛

ہمعصر اساتذہ (۱) خاندان امیر علیہ الرحمۃ میں آپ کے خواجہ تاش بھائی حضرت جلیل استاذ السلطان دکن۔ ۲۔ لسان الملک جناب ریاض خیرآبادی مرحوم۔ ۳۔ حفیظ جونپوری۔ ۴۔ مضطر خیرآبادی ۵۔ کوثر خیرآبادی۔ ۶۔ وسیم خیرآبادی مشہورِ زمانہ ہیں ؛

(۲) خاندانِ داغ مرحوم میں سے۔ تاج الشعرا حضرت نوح ناروی۔ بیخود دہلوی۔ بیخود بدایونی۔ جناب سائل دہلوی سیماب اکبرآبادی۔ ہجر شاہجہانپوری۔ رسا رامپوری۔ بیباک شاہجہانپوری۔ جوش ملسیانی وغیرہم کے ساتھ آپ کے بہت خوشگوار مراسم ہیں ؛

(۳) خاندانِ جلال میں سے جناب آرزو لکھنوی۔ کمال لکھنوی کے کمال کے آپ ہمیشہ سے معترف و مداح ہیں ؛

علاوہ ازیں اصغر گونڈوی۔ مرزا یگانہ چنگیزی۔ مرزا عزیز لکھنوی (مرحوم) جگر مراد آبادی۔ حسرت موہانی فانی بدایونی۔ ناطق لکھنوی۔ صفی لکھنوی۔ جوش ملیح آبادی۔ نواب آثر لکھنوی۔ وصل بلگرامی۔ عشرت لکھنوی۔ آسی لکھنوی۔ محشر لکھنوی۔ ثاقب کانپوری۔ مضطر دہلوی وغیرہ حضرات سے آپ کے مخلصانہ تعلقات ہیں ؛

آج تک کبھی کسی سے چشمک یا نوک جھوک کا موقع نہیں ملا۔ آپ کی خاندانی نجابت و وجاہت نے طبیعت میں ایک عجیب قسم کا انکسار پیدا کر دیا ہے۔ جس سے ایک دفعہ تعارف ہو جاتا ہے۔ بس ہمیشہ کے لئے اُس کے ہو گئے۔ الغرض آپ کی زندگی مشرقی تہذیب و تمدن کا بہترین قابل تقلید نمونہ ہے ؛

اولاد } آپ کے دو صاحبزادے ہیں۔ بڑے صاحبزادے کا نام میاں شبیر حسن خاں سلمہٗ ہے نویں جماعت میں تعلیم پا رہے ہیں۔ ماشاء اللہ نہایت ہونہار اور قابل طالب علم ہیں ؛
چھوٹے صاحبزادے شفیق حسن خاں سلمہٗ ہیں۔ جو غالباً دوسری جماعت میں ہونگے ؛

(سید دل محمد فضا منشی فاضل جالندھری)

رہنمائے تعلیم کا سپیشل ریڈ کراس نمبر

عالی حضور آنریبل ملک سر فیروز خاں صاحب نون نائٹ ایم۔ اے بیرسٹر ایٹ لاء وزیر تعلیم پنجاب و چیرمین انڈین ریڈ کراس سوسائٹی پنجاب برانچ کے حضور میں

ناظرین کرام یہ سنکر بیحد خوش ہونگے کہ رہنمائے تعلیم کے خاص "ریڈ کراس نمبر" کو ملاحظہ فرما کر عالیجناب آنریبل وزیر تعلیم صاحب نے مندرجہ ذیل گرامی نامہ ارسال فرما کر اس کی ناچیز خدمات کو دلی مسرت سے پسند فرمایا ہے :-

چیرنگ کراس لاہور نمبر ۲۲۳

مورخہ ۱۹ جنوری ۱۹۳۵ء بخدمت پروپرائیٹر صاحب رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

جناب من! آپکے تیار کردہ "سپیشل ریڈ کراس نمبر" کا ملاحظہ کیا۔ آپ کی تکلیف فرمائی کا شکریہ۔ اور اس نمبر کی تیاری پر اخراجات کثیر کے صرف کا مزید شکریہ۔ یہ نمبر نہایت مفید اور کام کی شے ہے۔ اور ریڈ کراس تحریک کے متعلق ہمیشہ کارآمد معلومات کا مخزن ہے۔ آپ کی اس شعبہ میں محنت و تکلیف کو میں بنظر استحسان پسند کرتا ہوں اور متوقع ہوں کہ آئندہ بھی آپ خدمتِ خلق کی بجا آوری میں بدستور سابق اسی سرگرمی اور انہماک کو کام فرماتے رہینگے جیسا کہ آپنے اس مرتبہ پر ظاہر فرمایا ہے آپ کا وفادار

دستخط Feroz Khan Noon

چیرمین

سِلکِ مُروارید

(از ناخدائے سخن حضرت نوحؔ ناروی جانشین حضرت داغؔ دہلوی)

اے ساقی مجھ کو ساغر دے　　اے ساقی ساغر کو بھر دے
رندی نے غم جھیلے ساقی　　دیر نہ کر البیلے ساقی
جیسا تقوے ویسی توبہ　　کیسا تقوے کیسی توبہ
اُٹھے بادل مستی کرتے　　ظاہر اپنی ہستی کرتے
بارش الطافِ پیہم کی　　بجلی چمکی قسمت چمکی
آنے والے جانے والے　　بیخود سب میخانے والے
شیشہ و خُم سے یارانہ ہو　　پیمانے پر پیمانہ ہو
رازِ مستی سب کھل جائے　　بوتل کا مُنہ اب کھل جائے
پی کر چلنا پھرنا اچھا　　اُٹھنا اچھا گرنا اچھا
بے ہوشی میں ہوش کی باتیں　　سرجوشی میں جوش کی باتیں

چاروں جانب دھوم مچی ہے
شادی سی ہر سمت رچی ہے

گلشن کا انداز نرالا　　بوٹا بوٹا ناز کا پالا
کلیوں کا رُک رُک کر کھلنا　　شاخوں کا جھک جھک کر ملنا
جائی جوہی کی خوش حالی　　نرگس کی آنکھیں متوالی
بیلیں پھیلیں دیواروں پر　　اندر اندر باہر باہر

جو تخت ہے وہ ہے بہتر — تختِ سلیماں سے ہے بڑھ کر
زلفِ سنبل بڑھ گئی کتنی — اُتنی حشر کی مُدت جتنی
مہندی رنگ انوکھا لائی — سوجھی اُس کو ہاتھا پائی
پھولوں میں سُرخی کچھ زردی — اپنی پوشاک اپنی وردی
سوسن چمپا نسرین بیلا — اچھا خاصہ ستھرا میلا
حسن لطافت سے رنگینی — اور مہک پھر بھینی بھینی

پتی پتی جھوم رہی ہے
بادِ سحر مُنہ چوم رہی ہے

مطرب آئے آئے آئے — فوراً ساز ملائے آئے
حشر اُٹھانے والا نغمہ — وجد میں لانے والا نغمہ
موسیقی جاری ہو جائے — کیفیت طاری ہو جائے
غور سے بہرے کا سُن لینا — دُھن پر اپنا سر دُھن لینا
راگ قیامت بن کر نکلے — تان جو نکلے تن کر نکلے
پیلو میں تاثیر غضب کی — دیپک میں تنویر غضب کی
افضل تر ایک ایک ترانہ — نیک زمانہ نیک ترانہ
محفل مخمور اس ساعت پر — ساعت مسرور اس قسمت پر
شور نہیں یہ صرف زمیں تک — گونج اُٹھا ہے عرش بریں تک
وہ بات اچھی وہ کام اچھا — جس کا آغاز انجام اچھا

کیف میں ڈوبے سارا گھر بھی
رقص کرے دیوار بھی در بھی

کیوں بدلی دنیا کی کایا — کیوں سب دنیا کا ارماں برآیا
کیوں عالم نے روپ نکالے — کیوں نہیں کرتا کوئی نالے
کیوں ہر سو اظہار مسرت — کیوں ہر جانب لطف و بہجت
کس لئے چرچے عیش و خوشی کے — کس لئے عیش و خوشی کے جلسے
کس لئے ذرہ ذرہ روشن — کس لئے کوچہ کوچہ ایمن
کس لئے اک اک صرفِ ترنم — کس لئے نازاں یہ وہ میں تم
تھی پہروں سے فکر اسی کی — اتنے میں ہاتف نے ندا دی
عید آئی ہے عید مناؤ — اٹھو جلد بہم مل جاؤ
پھر نہ ملے گا موقع ایسا — غفلت کیسی سونا کیسا
بیداری کو کام میں لاؤ — چمکو نام اپنا چمکاؤ

جوشؔ و جگت سنگھ آج مگن ہیں

یعنی محوِ لطفِ سخن ہیں

یہ دونوں سالک اردو کے — یہ دونوں مالک اردو کے
یہ اردو کے ضامن دونوں — یہ اردو کے محسن دونوں
اردو سے الفت دونوں کو — اردو سے رغبت دونوں کو
ناظم ہیں ناشر ہیں دونوں — واقف ہیں ماہر ہیں دونوں
دونوں لڑیاں ایک سہرے کی — دونوں آنکھیں ایک چہرے کی
عزّ و شرف میں لائق دونوں — فہم و خرد میں فائق دونوں
کام سنبھالا ان دونوں نے — نام اچھالا ان دونوں نے
دونوں سے احباب کی رونق — دونوں سے پنجاب کی رونق

کیا کہنا ان کی جدت کا — کیا کہنا اُن کی ہمت کا
سوجھ انوکھی بات نرالی — چیز نئی سوغات نرالی

عمدہ نمبر کامل نمبر
نکلا بن ٹھن کر دل نمبر

دل کا وصف ادا ہو کیونکر — دل بھاری ہے دونوں جگ پر
کہئے اس کو فخرِ عالم — کہئے اس کو عرشِ اعظم
اس میں دیکھے طور کے نقشے — دیکھے اس میں نور کے جلوے
معبد مسجد سے بھی بڑھ کر — دیر و حرم سے بھی افضل تر
اس کی عزت اس کی حرمت — اس کی رفعت اس کی وسعت
ظلم و کرم میں یہ لاثانی — اکثر آگ یہ اکثر پانی
اس پر کون و مکاں کے دھندے — جن و بشر سب اس کے بندے
واقف کارِ رسمِ محبّت — قدر افزائے حسنِ صورت
رنج مسرّت نغمہ شیون — دریا کوہ بیاباں گلشن
شکلیں بدلے چاہے جیسی — قوت اتنی قدرت ایسی

دل ہی دنیا دل ہی دیں ہے
دل جو نہیں تو کچھ بھی نہیں ہے

سب دل والے جب کامل ہیں — دل صاحب تو مجسم دل ہیں
کتنی اچھی کیسی اچھی — نظم اتنی نثر ایسی اچھی
رعنائی ہیں زیبائی ہیں — فخرِ امیر مینائی ہیں
زورِ غضب کا طبع رسا میں — فکرِ رسا کچھ اور ہوا میں

دردو اثر قربان تغزل — اللہ اللہ شان تغزل
نقادی ہیں استاد ایسے — استادی ہیں نقاد ایسے
جو مطلع ہے وہ روشن ہے — جو مقطع ہے وہ کندن ہے
جو جملہ ہے وہ خنجر ہے — جو فقرہ ہے وہ نشتر ہے
جو قطرہ ہے وہ دریا ہے — جو ذرّہ ہے وہ صحرا ہے
پڑھتے ہیں شعر ایسے ڈھب سے — دادِ سخن لیتے ہیں سب سے

اعلےٰ اولا ان کو دیکھا
ہر فن مولا ان کو دیکھا

غزلوں کے مضموں میں جوانی — معنوں کے مصرعوں میں روانی
مصرعوں میں لفظوں کی فصاحت — لفظوں میں معنی کی بلاغت
معنی میں مطلب پوشیدہ — مطلب میں شکلیں سنجیدہ
اک اک شکل میں کیا کیا جادو — ہر پہلو میں سو سو پہلو
گل چینی صرفِ رنگینی — رنگینی نذرِ گل چینی
شاعر ہیں کہنے کو اکثر — یہ شاعر ہیں یہ شاعر گر
طور آمیزی طرز آمیزی — ہوش اندوزی جوش انگیزی
کھُل کر ملنا مِل کر کھُلنا — سچّائی سے مِلنا جُلنا
جُود کرم الطاف عنایت — خُلق وفا اخلاص محبّت
سمجھے بوجھے دیکھے بھالے — مجھ کو بھائی کہنے والے

کم ہوگی لکھے گا جہاں تک
نوح کرے تعریف کہاں تک

اعتبار الملک جناب دلؔ شاہجہانپوری

(از رئیس التحریر علامہ حضرت نیازؔ فتحپوری ایڈیٹر رسالہ نگار لکھنؤ)

غالباً بلکہ یقیناً ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے۔ سید التفات رسول (مرحوم) تعلقہ دار سندیلہ کے یہاں سالانہ مشاعرہ کی تقریب میں (بلا مبالغہ) ہزاروں شعرا کا ہجوم ہے۔ اور میں بھی ایک تماشائی یا تماشہ بننے والے شاعر کی حیثیت سے بغیر کسی قابل التفات جگہ کو گھیرے ہوئے اس محفل میں ایک فردِ حقیر کی حیثیت سے شریک ہوں۔ انشار کے مشہور غزل کا مشہور مصرعہ

تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مصرعہ طرح تھا۔ محفل شعر گرم ہے۔ داد و تحسین کے سامعہ پاش نعروں سے در و دیوار جنبش میں آ رہے ہیں لیکن میں کہ اس وقت بھی مشکل ہی سے کوئی شعر مجھے پسند آتا تھا۔ خاموش بیٹھا ہوا۔ دنیائے شاعری کے ان مراسم و ظواہر کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اور حیران ہوں کہ "داد سخن" کے فن کا مطالعہ تاثرات قلب انسانی کو سامنے رکھ کر نفسیاتی نقطۂ نظر سے کروں یا شاعر و سامع کو جنبش اعضا کو پیش نظر رکھ کر فنون سپہ گری و ریاضت جسمانی کے اصول سے۔

جناب فصاحت لکھنوی مرحوم (امانت لکھنوی کے صاحبزادے) وضع لباس کی ان تمام خصوصیات کے ساتھ جو صرف لکھنؤ کے لئے مختص تھیں۔ غیر طرح میں اپنی ایک نہایت ہی معرکتہ الآرا غزل کا مقطع سناتے ہیں:۔

خدا جہاں میں مجھے صورت عصا نہ کرے ٹھہر ٹھہر کے اٹھاؤں قدم صدا نہ کرے

ساری محفل دفعتہً اس طرح چیخ پڑتی ہے۔ گویا کسی نے شتابہ آگ دے کر چھوڑ دیا ہے۔ میں بھی بڑا اغنیا رہو رہا ہوں لیکن شعر سے نہیں۔ اس کے مفہوم سے نہیں۔ بلکہ جناب فصاحت کے طریق ادا سے ان کے انداز شعر خوانی سے اور فن تمثیل کے اس منظر سے کہ اس شعر کے پڑھتے ہی وہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور خود عصا بن کر آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگتے ہیں:۔

اسی طرح سے جناب افضل (امیر کے بیٹے) جو اس وقت سر آمد شعرا لکھنؤ میں شمار ہوتے تھے و دیگر اکابر فن بن بن کر، سنور سنور کر طرح و غیر طرح میں غزلیں سناتے ہیں۔ اور اسٹیج پر اپنے اپنے فرائض ادا کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر یہاں نہ دل کو جنبش ہوتی ہے نہ روح کو کوئی اہتزاز۔

دوسرا دن طلوع ہوتا ہے اور دوپہر سے کچھ قبل دوسری صحبت شعر برپا ہوتی ہے، جو زیادہ مخصوص، زیادہ اہم ہے

کیونکہ اس میں صرف اساتذۂ فن ہی کو اپنا اپنا طرحی کلام سنانا ہے۔ واضح رہے کہ میں اپنی غزل اوّل ہی میں مبتدی و نومشق شعراء کے سلسلہ میں سنا چکا تھا، اور دل و دماغ کے اس بوجھ کو پھینک کر، صرف ایک تماشائی کی حیثیت پورا لطف اٹھانے کے لئے اپنے آپ کو آزاد کر چکا تھا، کامل دو گھنٹوں کے شور و شغب کے بعد ایک شاعر نے جو وضع و قطع، شکل و شمائل کے لحاظ سے مجھے بہت متین و سنجیدہ نظر آیا، بغیر کسی خاص اہتمام یا تیور کے (جس کے لئے شاید زیادہ صحیح لفظ شاعرانہ "لگاوٹ" ہوگا) طرح کی غزل شروع کی۔ اور جس وقت اس نے یہ شعر پڑھا کہ

نہ وہ آرام جاں آیا نہ موت آئی شبِ وعدہ
اسی دھن میں ہم اُٹھ اُٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں

تو میں کچھ سوچنے پر مجبور ہوا، بعض اگلے پچھلے واقعات سامنے آگئے اور دماغ بار بار یہی دوہرانے لگا کہ

نہ وہ آرام جاں آیا نہ موت آئی شبِ وعدہ

بے اختیار جی چاہا کہ پوچھوں یہ کون صاحب ہیں، لیکن خاموش رہا۔ یہانتک کہ جب وہ اس مقطع پر پہنچے کہ

وہ مشغولِ ستم ہیں اور ہم مصروفِ ضبطِ دل
نہ وہ بیکار بیٹھے ہیں نہ ہم بے کار بیٹھے ہیں

تو میں نے آخر کار اپنے قریب کسی صاحب سے پوچھ ہی لیا کہ یہ دل کون بزرگ ہیں، معلوم ہوا کہ ان کا نام ضمیر حسن خاں ہے اور شاہجہان پور کے رؤسا میں سے ہیں۔

یہ تھا میرا اور حضرت دل شاہجہانپوری کا اوّلین تعارف جسے باوجود حضوری کے بھی غائبانہ ہی کہونگا۔ کیونکہ اس کے بعد بھی میں اُن سے نہ مل سکا . . . . ان کو مجھ سے ملنے کی کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

زمانہ گزرتا گیا، مطالعہ وسیع ہوتا رہا، تجربات میں اضافے ہوتے رہے، مشکل پسند طبیعت کا معیار تنقید بلند ہوتا رہا، لیکن "نہ وہ آرام جاں آیا، نہ موت آئی شبِ وعدہ" کا لطف اسی طرح قائم تھا اور حضرت دل کی شاعری نے جو جگہ دماغ میں پیدا کرلی تھی وہ بدستور قائم تھی۔

اس کے بعد ایک ایک کر کے چودہ سال گزر گئے، زندگی کے مشاغل نے شعر و شاعری سے بیگانہ کر دیا۔ تمام وہ نقوش محو ہو گئے جن کا تعلق یاد ماضی سے تھا اور کسے یقین تھا کہ مجھے پھر حضرت دل کی شاعری سے لطف اٹھانے کا موقعہ ملے گا، لیکن حسن اتفاق کہ اسی زمانہ میں نگار کا اجرا ہوا اور حضرت دل نے اپنا کلام بھیجنے میں تقدیم کر کے ایک بار پھر سندیلہ کے ان نقوش کو تازہ کر دیا۔ اس کے بعد اکثر و بیشتر نگار میں آپ کا کلام شائع ہوا، لکھنؤ آنے کے بعد بارہا شرفِ زیارت بھی مجھے حاصل ہوا۔ تا اینکہ اس وقت آپ کا مجموعۂ کلام میرے سامنے ہے۔ اور سندیلہ میں اب سے ۲۲ سال قبل جو حسرتِ گفتگو میرے دل میں پیدا ہوئی تھی وہ آج اس طرح پوری

ہو رہی ہے کہ نہ صرف اس ایک مصرعہ پر بلکہ ان کے تمام کلام پر آزادی کے ساتھ جو جی میں آئے کہنے کے لئے مختار و آزاد ہوں حقیقت یہ ہے کہ اتفاقات اور داعیات قلب کی دنیا میں ایسے مواقع بھی شاذونادر ہی پیش آتے ہیں۔

عام دستور ہے کہ جب کسی کے کلام پر تنقید کی جاتی ہے یا کسی کے مجموعۂ کلام پر مقدمہ تحریر کیا جاتا ہے تو پہلے نفسِ شاعری کے متعلق ایک بسیط گفتگو کر لی جاتی ہے اور پھر شاعر کے کلام کو اس پر منطبق کر کے دیکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اصولاً یہ درست ہے، لیکن اصولاً یہ بھی نادرست نہیں کہ ایک ہی بات کا تکرار و اعادہ یا ایک ہی نوع کی گفتگو پر بار بار اصرار، موضوع کی دلکشی کو تباہ کر دیتا ہے اور طبیعت انسانی اس کے مطالعہ سے ابا کرنے لگتی ہے۔ شاعری کی بحث کوئی نماز تو ہے نہیں کہ روزانہ پانچ وقت پڑھنے کے بعد بھی شوق کم نہ ہو۔ یا اگر کم ہو جائے تو بھی "وظیفہ" بندش کے طور پر اس کو پڑھنا ضرور ہے۔

علاوہ اس کے شعر و شاعری پر اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ شاید کوئی نئی بات اب پیدا بھی نہیں ہو سکتی اور اگر ہو تو بھی اصول تنقید کے خلاف ہے کہ اصل موضوع سے ہٹ کر پہلے ایک مستقل رسالہ فن شعر پر دیکھنے کے لئے لوگوں کو مجبور کیا جائے اور اس کے بعد شاعر کے کلام کو سامنے لایا جائے۔ تاہم مختصراً یہ ضرور عرض کروں گا کہ جس طرح دنیا کے تمام فنوں میں فنون لطیفہ سب سے زیادہ مشکل فن سمجھے جاتے ہیں، اسی طرح فنون لطیفہ میں شاعری کو سب سے زیادہ نازک و دقیق فن خیال کیا جاتا ہے۔ غنا نام ہے اس مخصوص لحن یا آواز کا جو بار بار کی مشق سے، موسیقی کا ذوق رکھنے والے کے حلق و زبان سے پیدا ہوتی ہے، نقاشی نام ہے مُوقلم کی اس منظم جنبش کا جو ایک سدھے ہوئے ہاتھ سے پیدا ہو کر صفحۂ کاغذ پر مرئی صورت اختیار کر لیتی ہے لیکن شاعری نام ہے صرف ذکاوتِ حس کا، اور اُس کیفیت کے اظہار کا جس کا تعلق روح انسانی سے نہیں بلکہ صرف روحِ اخلاقی سے ہے۔ ایک نقاش کے نقش کا تعلق پہلے ہمارے باصرہ سے ہوتا ہے اور پھر دماغ سے، اسی طرح ایک مغنی کا لحن پہلے ہمارے سامعہ کو بیدار کرتا ہے اور اس کے بعد دماغ تک پہنچتا ہے، لیکن ایک شاعر کا شعر براہِ راست ہمارے دماغ کو ہماری روح کو متاثر کرتا ہے اور وہ کسی مرئی مجسم یا مسموع چیز کا محتاج نہیں۔ آپ ایک نقش سے مختلف رنگوں کے امتزاجِ صحیح کو محو کر دیجئے، آپ ایک لحن سے منظم اہتزازات و تموجات کو مٹا دیجئے نہ آپ کے سامنے نقش کا کوئی مفہوم رہیگا نہ موسیقی کا، برخلاف اس کے ایک شعر الفاظ کا لباس اختیار کرنے سے قبل، زبان پر آنے سے پہلے اور صفحۂ کاغذ پر نمودار ہونے سے قبل ہی شعر ہے۔ ہمارے آپ کے لئے نہیں، بلکہ خود شاعر کے لئے جو بجائے خود ایک شعر ہے غیر مسموع اور ایک وحی ہے غیر منطوق۔

ایک نقاش اپنے آپ کو اس وقت تک نقاش نہیں ثابت کر سکتا جب تک کوئی نقش اس کے سامنے نہ

ہو، ایک مغنی اپنے آپ کو مغنی نہیں کہہ سکتا تاوقتیکہ کوئی گیت اس کے حلق سے نہ پیدا ہو لیکن ایک شاعر شعر پڑھے یا نہ پڑھے، خاموشی کے عالم میں بھی شاعر ہے۔ اور اس کی کیفیت شعری جس کا دوسرا نام صرف "احساس حسن" ہے اس میں ہر وقت موجود ــــــ خواہ وہ حسن صوری ہو یا معنوی، ظاہری ہو یا باطنی۔ مدعا یہ کہ "خوبی محض" کی پرستش اس کی زندگی کا شعار ہے اور "انعطاف مطلق" کی پرستاری پر اس کی ہستی کا انحصار ــــ

آپ کسی ایک جگہ شاعر، مغنی اور نقاش کو جمع کر دیجئے اور ان سے کہئے کہ بالکل خاموش رہیں۔ ممکن نہیں کہ آپ تھوڑی دیر میں شاعر کو ان دونوں سے ممیز نہ کر سکیں، کیونکہ ان میں صرف شاعر ہی کی ہستی ایسی ہے جو آپ کو اپنی طرف کھینچ لے گی۔ درآنحالیکہ آپ ذریعہ و سبب سے بالکل بے خبر ہوں گے لیکن مغنی و نقاش کے پاس کوئی کیفیت ایسی نہیں ہے جو اپنی انفرادیت (individuality) کو بغیر نقش و غنا کی وساطت کے آپ سے تسلیم کرا سکے۔ غالباً اسی حقیقت کا اظہار حضرت دل نے اپنے اس شعر میں کیا ہے کہ

پیش دلدار رہیں مہر بہ لب حضرت دلؔ
کہ خموشی میں بھی اک قوت گویائی ہے

اور ایک وجہ امتیاز ملاحظہ فرمائیے ــــ چونکہ شاعر کی حس "خوبی محض" اور "حسن مطلق" سے متعلق ہے اس لئے اس کا نقش و غنا سے بھی پورا لطف اٹھانا یقینی ہے لیکن مغنی و نقاش اپنے احساس کے لحاظ سے مجبور نہیں کہ وہ شعر کی حقیقت کو بھی سمجھ سکیں۔ الغرض شاعر ہر وقت شاعر ہے۔ خواہ وہ خاموش ہو یا متکلم۔ بزم مشاعرہ میں ہو یا اپنی خلوت میں، صحرا میں ہو یا آبادی میں۔ وہ آپ اپنی کیفیات سے لطف اٹھاتا ہے۔ بغیر اس خیال کے کہ کوئی ان کا سمجھنے والا ہے یا نہیں وہ خود اپنے ادراک سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ بلالحاظ اس کے کہ کوئی اس کی تصدیق کرتا ہے یا نہیں۔ وہ بجائے خود ایک پُر رونق محفل ہے، ایک آباد انجمن ہے بلکہ ایک معمورۂ عالم ہے جس کی رونق و آبادی اور تکمیل و معموری کا وہ خود ذمہ دار ہے۔

اس لئے جہاں تک میں نے حضرت دلؔ کے فطرت کا مطالعہ کیا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ صاحب دیوان ہوں یا نہ ہوں وہ شعر کہیں یا نہ کہیں، شاعر پیدا ہوئے ہیں اور ایک حقیقی شاعر کی حیثیت سے انہیں اس دنیا سے گزر جانا ہے۔ میرے تقریباً ایک ثلث صدی کے تجربہ میں غالباً یہ بالکل پہلی مثال ہے کہ میں نے ایک شعر گو شاعر کو اس کے اخلاق کی حیثیت سے بھی حقیقی معنے میں شاعر پایا ہو، ورنہ میں نے تو اکثر یہی دیکھا کہ جو الفاظ کے لحاظ سے بہترین شاعر ہے وہ اخلاق کے لحاظ سے اتنا ہی بُرا انسان ہے۔

یہاں تک تو میں نے صرف اپنے ان تاثرات سے بحث کی ہے جو حضرت دلؔ کی شخصیت اور ان کی فطری اہلیت شاعری سے متعلق ہیں، لیکن آگے چل کر میں ان کے کلام پر بھی اظہار رائے کروں گا۔ اور دیکھوں گا کہ ان کے افکار شعری

کس حد تک ان کی فطرت کے ہم آہنگ ہیں، کیونکہ میری رائے میں سب سے پہلے ایک شخص کا معیارِ شاعری خود اسی کے اندر ڈھونڈھ لینا چاہیئے اور پھر اس کے کلام کو اس پر منطبق کر کے دیکھنا چاہیئے کہ وہ فطری شاعر ہے یا نہیں۔

بیانِ ماسبق سے ممکن ہے بعض حضرات کو یہ شبہ پیدا ہو کہ میرے نزدیک ہر وہ شخص جو صاحبِ اخلاقِ حسنہ ہو اُسے شاعر ہونا چاہیئے لیکن یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں۔ میرا مدعا یہ ہے کہ ایک شاعر کی فطرت کو اصولاً بہت بلند ہونا چاہیئے، اگرچہ ضروری نہیں کہ جس کی فطرت بلند ہو وہ اصطلاحی معنے میں شاعر بھی ہو، یعنی اپنے جذبات و تاثرات کو موزوں الفاظ میں ادا بھی کر سکتا ہو۔ اس لئے شاعری نام ہُوا اس ملکہ وہبی کا جو تاثرات کو الفاظ میں ظاہر کرنے کے لئے ایک انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت کیا جائے اور شعر نام ہے اس قوت شاعرہ و حس مدرکات کے باہمی تفاعل کے نتیجہ کا جو ایک شاعر میں پائی جاتی ہیں۔

اگر ایک شخص کی یہ قوتِ شاعرہ گمراہ ہو کر سطحیات و طامات کی طرف مائل ہو گئی تو شاعر کی صفت یہ بیان کی جاتی ہے کہ "الشاعر من کذب و اضحاک" لیکن اگر ایک فنِ جمیل کی حیثیت سے اس کو اختیار کیا گیا جس کا تعلق اعماقِ حیات سے ہے تو پھر اس میں کلام نہیں کہ شاعر وہ ہے من یملکہ الوحی العلوی اللذی یدفعہ عن الدنایا و تیلاعب باوتار نفسہ فیرسل منہ نغمات الحیاۃ المطربۃ۔

جس کو غیبی اشارات اور الہامات ربانی نیچی سطح سے اُٹھا کر بلندی پر لے جاتے ہیں اور اس کے ساز ہستی سے نغمات حیات پیدا کرنے لگتے ہیں۔ کیا خوب کہا ہے لوول LOWELL نے کہ شاعر وہ ہے جو" فراست و حکمت کو اعماقِ فطرت سے نکال کر نہاں مجاری وجود کی طرف لے جاتا ہے اور لوگوں کے سامنے آیات ابدیت پیش کرتا ہے"۔

شعر کے دو عنصر ہیں ایک وہ جسے بداہت کہتے ہیں اور دوسرے کا نام اختیار ہے۔ اول الذکر بالکل فطری چیز ہے اور نفس طبیعی سے متعلق ہے جس میں تمام شعراء برابر کے شریک ہیں اور زمان و مکان کے فصل و تفاوت سے اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں تمام عواطف فطری اور جذبات انسانی شامل ہیں مثلاً محبت و عناد، حزن و مسرّت، حماست و جُبن وغیرہ اور تاریخ میں ہم کو بہت سے ایسے آثار ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ ان میں سے بعض جذبات کی حیرت انگیز مثالیں اپنے بعد چھوڑ گئے ہیں کسی میں یہ کیفیات بہت شدید ہوتی ہیں اور کسی میں کم، اور بعض اقوام میں ان کے ماحول کے لحاظ سے یہ جذبات قومی خصوصیات کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مخصوص قوموں کی شاعری میں مخصوص اسباب امتیاز پیدا ہو جاتے ہیں۔

اختیارات کا تعلق تقدّم شعری سے ہے جو حالات و زمانہ کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے، یعنی اگر کوئی قوم صحرا نشینی کی حالت سے ترقی تمدن کی منزل تک پہنچ گئی ہے تو اس کی شاعری میں بھی ویسا ہی فرق پیدا ہو جائیگا اور عہد تمدن میں پہنچکر وہ بادیہ نشینی کی شاعری کو قائم نہ رکھ سکے گی۔ اس کی بہت کھلی ہوئی مثال اس وقت روس و جرمن کی شاعری ہے کہ جنگ کے وقت یا اس سے قبل شاعری کا جو رنگ وہاں پایا جاتا تھا وہ کچھ اور تھا۔ اور اس وقت کچھ اور ہے۔ یا پھر خود عہد اسلام میں شاعری کے مختلف ادوار پر نگاہ ڈالئے کہ مسلمانوں کے عہد عروج میں شاعروں نے کن جذبات کا اظہار کیا اور جب زوال شروع ہوا تو اسی کے ساتھ شاعری میں کس طرح کا حزن و ملال پیدا ہو چلا۔ اردو میں لکھنؤ و دہلی کی شاعری کا فرق بھی بہت مختلف ماحول و تمدن سے پیدا ہوا اور اب جو نمایاں فرق انداز بیان و اظہار جذبات میں بیس قبل کی شاعری سے پایا جاتا ہے۔ اس کا سبب بھی یہی حالات کا تغیر ہے ؎

اس لئے جب ہم کسی شخص کی شاعری پر نگاہ ڈالیں تو ہم کو شاعری کے ان دونوں عنصر (بداہت و اختیار) کو ضرور سامنے رکھنا چاہئے اور معلوم کرنا چاہیئے کہ ایک شاعر اپنی فطرت کے لحاظ سے کن جذبات کو زیادہ قوی لے کر آیا تھا۔ اور ماحول و امتداد زمانہ کے ساتھ حالات کے تغیر نے اس کی شاعری میں کیا تغیر پیدا کیا ہے ؎

یہ بڑی اصولی غلطی ہے کہ ہم موجودہ عہد کے کسی شاعر کو لے کر کسی گذشتہ دَور کے شاعر سے اس کا مقابلہ کریں، یا متاخرین کو سامنے رکھ کر متقدمین کے کلام پر اظہار رائے ـــ ہر شاعر کے کلام پر خود اسی کی شاعرانہ کیفیات، اور اُسی کے جذبات و حالات کے لحاظ سے رائے زنی کرنا چاہئے اور دیکھنا چاہیئے کہ فطرت نے اسے کس حد تک شاعر بنا کر اس کی ترقی کے لئے اسباب فراہم کئے تھے اور اس نے ان سے فائدہ اٹھایا یا نہیں اور اُٹھایا تو کس قدر؟

حضرت دلؔ کا نام ضمیر حسن خاں ہے اور آپ کا سلسلۂ نسب آٹھ واسطوں سے شاہ قاسم سلیمانیؒ تک پہنچتا ہے۔ جو سلسلۂ قادریہ کے نہایت مشہور بزرگ تھے اور سید عفیف الدینؒ کے خلفاءِ اجل سمجھے جاتے تھے۔ اخیر عمر میں جب آپ ہندوستان تشریف لائے تو مریدوں کی کثرت نے حکومت کو آپ کی طرف سے خائف کر دیا۔ اور عہد جہانگیری میں آپ قلعۂ چنار گڑھ میں مقیّد کر دئے گئے، چنانچہ ۱۰۱۶ھ میں وہیں بہ حالت قید آپ واصل بہ حق ہوئے ؎

اس طرح اوّل اوّل آپ کا خاندان ہندوستان میں آیا اور پھر بعد کو شاہجہانپور میں جو افاغنہ صوبہ متحدہ کا نہایت مشہور مستعمرہ ہے آپ کے آبا و اجداد سکونت پذیر ہو گئے[1]۔ یہیں ۱۸۷۵ء میں حضرت دلؔ کی ولادت ہوئی۔

---

[1] حضرت دل کے مختصر خاندانی حالات یہ ہیں :-
شاہ واصل، عرف بابا صاحب۔ ابن شاہ قاسم صاحب سلیمانی سے نواب عمدۃ الملک بہادر خاں نے اپنی لڑکی خدیجہ بیگم کا عقد ۱۱۳۰ھ

نشو و نما ہوا۔ تعلیم سے فراغت حاصل کی اور یہیں آپ اس وقت تک بقید حیات موجود ہیں۔ اور اپنی آبائی جائداد کا نہایت خوش سلیقگی سے انتظام کر کے پُرسکون زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ نے عربی میں بھی درس نظامی کی تمام کتابیں معقول و منقول کی مختلف اساتذہ سے پڑھی ہیں اور فارسی میں بھی تکمیل حاصل کی ہے۔ آپ فن طب میں بھی فراغت حاصل کر کے اپنے آبائی مشغلہ پر تا ایں دم قائم ہیں اور ایک کامیاب مطب کے مالک ہیں۔ فن شعر میں آپ کو جناب امیر مینائی سے نسبت تلمذ حاصل ہے۔ اور شاگردانِ امیر میں آپ کو ہمیشہ خاص امتیاز حاصل رہا ہے۔

یہ ہیں نہایت مختصر خاندانی و ابتدائی حالات جناب دل کے جو ہمیں معلوم ہو سکے ہیں۔ اور جب ان حالات و کوائف پر ہماری نگاہ جاتی ہے تو جناب دل کا شاعر ہو جانا "معجزہ" سے کم نظر نہیں آتا۔ ایک ایسے خانوادہ کا فرد جس میں فقراء و صوفیہ کے سوا کسی کا نام نظر نہ آئے، ایک ایسے خاندان سے متعلق ہونے والی ذات جو سخت و کرخت جنگجو افغانوں پر مشتمل ہو۔ ایک ایسے ماحول میں پرورش پانے والی ہستی جہاں خرابی صحت و اسقام جسم انسانی کے مکروہ مناظر کے سوا، جمالیاتی ذوق کو ابھارنے والی کوئی چیز نہ پائی جائے، تعلیم کے لحاظ سے صرف ایسا گردو پیش رکھنے والا وجود جہاں درس نظامی کی ظلمت آفرین اور انسانیت شکن کتابوں کے علاوہ کوئی صحیح ذریعہ دماغ کی

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ)

کے بعد قنوج میں کر دیا تھا اور بارہ گاؤں جہیز میں دیئے تھے ۱۸۵۸ء میں شاہجہانپور کے آباد ہو جانے پر نواب بہادر خاں کے خاندان کے ساتھ شیخ جمال صاحب بھی شاہجہانپور آکر محلہ ککرہ میں سکونت پذیر ہو گئے آپ کے مکانات مسکونہ کا کچھ حصہ اب تک موجود ہے۔ نواب بہادر خاں کی لڑکی سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی لڑکے کا نوجوانی میں انتقال ہو گیا اور لڑکی کا عقد آپ نے اپنے بھتیجے شیخ عنایت اللہ سے کر دیا۔ نواب بہادر خاں کی بیٹی کے انتقال کے بعد آپ نے کابل جا کر دو عقد کئے اُب بی بی کے بطن سے شیخ حکیم الدین پیدا ہوئے اور انہیں کی اولاد میں سے حضرت دل ہیں۔

شاہ واصل نسبتاً خلیل افغان تھے۔ اس خاندان میں بکثرت اولیاء اللہ گزرے ہیں۔ شیخ محمد۔ شیخ متی بابا۔ شیخ یوسف قطب السلام۔ شیخ عارف۔ خواجہ مراد۔ شیخ حسن افغان وغیرہ اسی خاندان سے تھے۔ وطن اصلی۔ موضع بادنی مضافات پشاور ہے۔ جہاں قبیلہ خلیل آباد ہے۔ شجرہ نسب۔ ضمیر حسن۔ ابن احمد حسن۔ ابن مولوی حکیم قدرت علی۔ ابن مولوی عزیز الدین۔ ابن شیخ غلام سرور۔ ابن شیخ وارث۔ ابن شیخ حکیم الدین۔ ابن شیخ واصل۔ ابن شاہ قاسم سلیمانی ــــ

شاہ قاسم سلیمانی چونکہ عرب میں بہت عرصہ تک رہے تھے اور عرب بکثرت آپ کے مرید تھے۔ اس وجہ سے آپ کے نام کے ساتھ لفظ شیخ شامل ہو گیا۔

دل صاحب کے والد ان کے صغر سنی ہی میں انتقال ہو گیا تھا اس لئے ان کی والدہ محترمہ اپنے حقیقی بھائی کے مکان میں بمقام محلہ باغی پٹھان چلی آئیں۔ والدہ اور خال مکرم کے انتقال کے بعد محلہ مذکور میں مستقل مکانات تعمیر کر لئے۔ دو بڑے بھائی بشیر حسن و نذیر حسن اب بھی موجود ہیں آپ کے ماموں صاحب نے ابتدائی فارسی تعلیم معلم ملازم رکھ کر مکان پر دلائی۔ بعد ازاں عربی کی اور طب کی تعلیم مختلف اساتذہ سے حاصل کی۔ آپ کی شادی بھی حقیقی ماموں کی صاحبزادی سے ہوئی۔

چونکہ ترکہ پدری حسب دلخواہ ناکافی تھی اس لئے ٹھیکہ داری اور تجارت کا سلسلہ بھی شروع کیا اور اسی کے ساتھ آبائی پیشہ طبابت بھی اختیار کیا۔

تربیت و جلاء ذہن و روح کا موجود نہ ہو، مشاغل معیشت کے لحاظ سے ایک ایسا معذور شخص جو رات دن ہتھوڑوں کے ساتھ سر کھپانے پر مجبور ہو اور اشغال تمدن کی حیثیت سے ایک ایسا انسان جو ہمیشہ فطرت انسانی کا بیمار پہلو اپنے سامنے رکھتا ہو ——— مجھے حیرت ہے ——— کہ ایسا شخص شاعر بن جائے اور شاعر بھی ایسا جو اپنے مقتضاء ماحول سے بلند، اپنے منشاء تعلیم و تربیت سے ارفع، اپنے حدود و مشاغل سے علیحدہ اور اپنے گرد و پیش کے حالات سے بالکل مختلف اور متمایز ہو! حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مثالیں ایسی ہیں جن کو دیکھ کر یہ حکم لگایا جاتا ہے کہ شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ جناب دل کا ریعان شباب (جس کی ایک تصویر آپ کو اس مجموعہ میں کسی جگہ نظر آئیگی) محض "واردات دل" اور "داعیات موسم" کے لحاظ سے کیا تھا اور انہوں نے "مبدء فیاض" کے اس عطیہ سے کچھ کام لیا یا نہیں؟ لیکن ان کی موجودہ متانت و سنجیدگی، تہذیب و شائستگی، اور انکسارانہ روش کو دیکھتا ہوں تو وہی لطیفہ یاد آجاتا ہے کہ "ایک بڈھا کسی گلی میں ٹھوکر کھا کر گر پڑا، کہنے لگا ہائے بڑھاپا، ادھر ادھر دیکھا، جب جانا کوئی نہیں ہے تو یہ کہتا ہوا بڑھا کہ جوانی میں کیا پتھر پڑتے تھے"

بہرحال یہ میرا قیاس ہی قیاس ہے۔ اگر واقعی حضرت دل کی جوانی پر کبھی "پتھراؤ" ہوا ہے تو میں معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں۔ اور خوش ہوں کہ انہوں نے شاعری کچھ کھو کر سیکھی ہے، کچھ دے کر انہوں نے دل کا تخلص حاصل کیا ہے۔

میرے اس خیال کی تصدیق کہ حضرت دل قدرت کی طرف سے شاعرانہ دل و دماغ لے کر آئے تھے، اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جب جناب امیر مینائی کے سامنے زانوئے تلمذ آپ نے تہ کیا تو استاد نے فرمایا کہ "ضمیر تمہاری شوخ طبیعت ظاہر کر رہی ہے کہ دنیائے شاعری میں تمہارا مستقبل بہت نمایاں ہوگا"

مجھے استاد امیر کی اس رائے سے ضرور اختلاف ہے کہ حضرت دل کی طبیعت میں شوخی پائی جاتی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے "شوخی طبیعت" کے الفاظ محض رسماً "اہلیت شاعرانہ" کے مفہوم میں استعمال کئے ہوں گے، ورنہ جناب دل کی شاعری میں اس شوخی کا عنصر کہاں، جو عہد امیر میں، داغی اسکول کے لئے مخصوص تھی! ورنہ حقیقتاً ایسے سنجیدہ و متین شاعر میں پائی جا سکتی ہے، جیسے جانشین جرأت و انشاء نہ بنتا تھا بلکہ خاندان مصحفی کے سلسلہ میں اس عظیم المرتبت شاعر کے قدم بہ قدم چلتا تھا، جیسے "مرآۃ الغیب" سے آگے بڑھ کر "صنمخانۂ عشق" تک نہ پہنچنا چاہیے تھا۔ اس مجموعہ میں حضرت دل نے بعض غزلوں پر صرف (ج) لکھدیا ہے اور بعض پر صرف (ق)، اس سے مراد ان کی جدید و قدیم کلام ہے۔ ہر چند مجھے صحیح علم اس کا نہیں کہ کس زمانہ سے ان کا دور جدید شروع ہوا اور کب دور قدیم ختم ہوا، لیکن چونکہ سند یہ کہ اس مشاعرہ کی غزل جس کا ذکر میں نے ابتدائی سطور میں کیا ہے جناب

دلؔ نے جدید دَور میں شامل کی ہے۔اس لئے یہ امر تو محقق ہے کہ ۱۹۰۰ء یا اس سے کچھ قبل وہ اپنے دَورِ قدیم کو ختم کر چکے تھے! اور ان کی غزل گوئی کا دَورِ جدید اب سے کم از کم تقریباً ایک رُبع صدی قبل شروع ہوتا ہے۔ پھر چونکہ جناب دلؔ کی عمر اس وقت ۷۵ سال کی ہے اس لئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انہوں نے ۳۰، ۳۵ سال کی عمر تک جو کچھ کہا ہے۔ اُسے دَورِ قدیم میں رکھا ہے اور اس کے بعد دَورِ جدید میں لیکن اوقات کی یہ تقسیم، ان کی اردو شاعری کا یہ تجزیہ آپ ریاضی کے کسی اصول یا قضایائے منطق کے ماتحت کرلیں تو کرلیں۔ ان کے مجموعہ کو دیکھ کر یہ معلوم کرنا از بس دشوار ہے کہ ان کا ابتدائی یا قدیم کلام کونسا ہوسکتا ہے اور جدید کونسا، وہی متین و سنجیدہ روش جو پہلے تھی اب بھی ہے، وہی احتیاط جذبات شباب کے اظہار میں جو اب سے ۴۰ سال قبل پائی جاتی تھی اب بھی موجود ہے غضب خدا کا آپ سارا دیوان پڑھ ڈالئے اور کسی ایک جگہ بھی آپ کو وصل کا (مبارک) لفظ نہ ملے۔ تمام مجموعہ چھان ڈالئے، کہیں بھولے سے بھی اِس (آرام جاں!) تمنا کا ذکر نہ آئے (جل جلالہ) بقولِ شخصے شاعر نہ ٹھہرے، بالکل دیوتا ٹھہرے۔

اگر حضرت دلؔ خیر سے ابھی جوان ہی نہیں ہوئے تو بات اور ہے، ورنہ ان کے اس محتاط رنگ شاعری کے صرف دو سبب ہوسکتے ہیں یا تو یہ کہ جس ماحول، جس تربیت میں ان کا شباب بسر ہوا وہ اس درجہ مولویانہ اور "سبحانہ و جلّ شانہ" تھا کہ ان میں "دل کی بات" کہنے کی ہمت ہی نہ تھی۔ (اور یہ خصوصیت شاعری کے اس عنصر کے ماتحت رکھی جائے گی جسے ہم نے اختیار کے نام سے ظاہر کیا ہے) یا پھر یہ کہ وہ قدرت ہی کی طرف سے "پیر شو بیاموز" قسم کا "عشق کمن سال" لیکر پیدا ہوئے جس کو زیادہ سنجیدہ لٹریچر میں "غیرت و حیا اور شرافت و متانت" کے الفاظ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جناب دلؔ کی متانت شاعری کا تعلق ان کی متانت فطرت سے ہے اور اس نوع کی "PRECOCIOUS" (قبل از وقت پختہ ہوجانے والی) ذہنیتیں بعض غیر معمولی ذکاوت حِس رکھنے والوں میں اکثر تو نہیں لیکن کمتر نظر آجاتی ہیں — یہ غالباً دوسرا لیکن زیادہ قوی ثبوت اس امر کا ہے کہ حضرت دلؔ کو منشی امیر احمد نے شاعر بنایا اور نہ کسی صحبت مشاعرہ نے اور نہ اس کا امکان تھا کیونکہ جس شخص کی فطری شاعری کو، اس کی جنگجو کرخت قومیت، خشک مولویانہ تعلیم اور بے آب و رنگ مشغلۂ معیشت و حیات، تباہ نہ کرسکے، اس میں امیر مینائی ہوں یا کوئی اور۔ کیا اصلاح و اضافہ کرسکتے تھے۔

میں نے جناب دلؔ کی متانت اور ان کی شاعرانہ سنجیدگی کا اس قدر ذکر کیا ہے کہ ممکن ہے اس سے بعض حضرات کو یہ شبہ پیدا ہو کہ ان کا کلام خشک و بے مزہ ہوگا لیکن آپ یہ سُنکر حیرت کریں گے کہ باوجود اس تمام رکھ رکھاؤ کے اور با ایں ہمہ حزم و احتیاط ان کے کلام میں وہی حلاوت، وہی عذوبت، وہی کیفیت اور

وہی دل نشینی پائی جاتی ہے جو صحیح رنگِ تغزل میں ہونا چاہیئے ۔ رندانہ شوخی، بیباک معاملہ بندی، رنگین محاکات، "گوشت و خون" کے جذبات کی ترجمانی، ہر چند غزل میں کبھی کبھی لطف ضرور پیدا کر دیتی ہے، لیکن آخر عشق و محبت کے کچھ مدارج بھی تو ہوتے ہیں، ایک خود دار غیور طبیعت میں کچھ صبر و ضبط بھی تو ہوتا ہے، حدیث محبت و عشق میں امتیاز بلند و پست بھی کوئی چیز ہے ۔ حضرت دل کو فطرت نے "مقطع" شاعر پیدا کیا تھا، آپ انہیں "ہنسوڑ" کیسے دیکھ سکتے ہیں، یوں تو ان کے ہاں شوخی بھی ہے لیکن تہذیب کے ساتھ ساتھ، چھیڑ چھاڑ بھی ہے مگر حدودِ متانت کے اندر، طنز نگاری بھی ہے، مگر دل شکن نہیں، بیتابی بھی ہے لیکن کھل کھیلنے والی نہیں، وہ ہنستے بھی ہیں لیکن صرف تبسم کی حد تک ۔ وہ ضبط بھی ہاتھ سے کھو دیتے ہیں لیکن جامہ دری سے اسی طرف یقیناً ان کے یہاں آپ کو وہ جوش و خروش نظر نہیں آئے گا جو عشق بیتاب کی خصوصیات میں داخل ہے، نہ ان کے کلام میں آپ کو وہ سوز و گداز ملیگا، جس نے میر کی شاعری کو یکسر بین اور مرثیہ بنا دیا ہے، لیکن اس باب میں وہ معذور تھے کیونکہ جو آزادی سے ہنس نہیں سکتا وہ دل کھول کر روتا بھی نہیں ہے ۔ قدرت اس قدر ظالم نہیں ہے کہ جسے وہ ہنسنے نہ دے، اُسے رُلا رُلا کر ہلاک کر ڈالے ۔

اس امر کا ثبوت کہ جناب دل کے قدیم و جدید کلام میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا اور یہ کہ جس معیار کا شاعر ان کو بننا تھا وہ معیار اپنے ساتھ ہی لائے تھے، ان کے دیوان کے مطالعہ سے ہر شخص کو نظر آ سکتا ہے ۔

ایک شاعر جو اوائل عمر میں یہ شعر کہہ سکتا ہے ؎

کوئی بیکسی میں ایسا نہیں غمگسار میرا ۔۔۔ کہ انہیں سنائے لے دل کبھی حالِ زار میرا

وہ اگر برسوں کی مشق اور ایک عمر کے تجربہ کے بعد اس کو صرف اتنی ترقی دے سکے کہ ؎

کیا جانے کس خیال سے چھوڑا حالِ زار ۔۔۔ مجھ پر بڑا کرم ہے میرے چارہ ساز کا

اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے جدید و قدیم کلام میں کوئی نمایاں فرق پایا جاتا ہے یہ کہ حالات و ماحول نے اس کے ذوق میں کوئی تبدیلی پیدا کی ہے کم از کم میری سمجھ میں تو آتا نہیں ۔

جس وقت کسی شاعر کا مجموعۂ کلام میرے سامنے آتا ہے تو سب سے پہلے میں یہ جاننے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ شاعر ہے بھی یا نہیں اور جب اس کی شاعری (خواہ وہ کسی رنگ کی ہو) متحقق ہو جاتی ہے تو پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ کیا پیغام دنیا کو سنانا چاہتا ہے، اس کی گفتگو کا نصب العین کیا ہے، لیکن یہ صرف اسی وقت دیکھتا ہوں جب رنگِ تغزل کے علاوہ کوئی اور چیز میرے سامنے ہوتی ہے، ورنہ غزل اور غزلیات میں تو دیکھنے کی چیز فقط یہ ہے کہ شاعر نے شاعری اپنے لئے کی ہے یا دوسروں کیلئے

یعنی اس نے خود اپنا حالِ دل سُنایا ہے یا دوسروں کا ذکر اپنی زباں میں کیا ہے۔ نیز یہ کہ اپنا حال خود اپنے آپ کو سُنایا ہے یا کسی اور کو ؂

اس لئے میری رائے میں غزل گوئی کے تین درجے ہوئے۔ ایک یہ کہ شاعر صرف دوسروں کے جذبات کی ترجمانی کرے اور خود ان سے بےخبر ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے تاثرات کو ظاہر کرے لیکن دوسروں کو سُنانے کے لئے اور تیسرے یہ کہ شاعر کا مخاطب خود اسی کی ذات ہو، اپنی بیتی اپنے آپ کو سُنائے خود ہی قائل ہو اور خود ہی سامع یعنی آتش کی زبان میں وہ ایک ایسی خشک "چوبِ صحرا" ہو۔ لگا کے آگ جسے قافلہ روانہ ہوا ؂

آخر الذکر درجہ شاعری کا نہایت بلند درجہ ہے اور دنیائے شعر کا یہ "تخاطب بالنفس" (Soliloquy) اگر پوری طرح کسی پر ابتدائی میں طاری ہوگیا تو وہ جلد مر جاتا ہے۔ اور اگر زندگی نے وفا کی تو شاعری کی حدود سے گزر کر جنون و دیوانگی یا ترکِ دنیا کے حدود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ اس وقت تک اردو شاعری کی دنیا میں، مجھے کوئی شخص ایسا نظر نہیں آیا جس کا کلام یکسر اسی رنگ کا ہو کیونکہ اول تو اس رنگ کا شاعر بہت کم کہتا ہے اور اگر کہے بھی تو صاحبِ دیوان نہیں ہو سکتا۔ وہ دنیا سے بےخبر ہوتا ہے اس لئے دنیا بھی اُس کی طرف سے غافل ہوتی ہے، اس کے جذبات کے تمام طوفان خود اسی کے خلوتِ دل میں اُٹھتے ہیں اور وہیں فنا ہو جاتے ہیں، وہ بقول بیدل "تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ" کا مصداق ہوتا ہے اور اپنے تاثرات جنہیں اس کا "نغمۂ عبادت" کہنا چاہئے خود اپنی ہی روح کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس کی بھی خبر نہیں ہوتی کہ ہستی کے "اعماقِ تنہائی" سے کوئی صدائے بازگشت پیدا ہوتی ہے یا نہیں۔ وہ گویا جنگل کا گلاب ہے جو اپنے لئے کھلتا ہے اور چند ساعت کے بعد وہیں مرجھا کر فنا ہو جاتا ہے ؂

دوسری قسم شاعری کی وہ ہے جو اپنے جذبات نظم نہیں کرتا۔ بلکہ دوسروں کے تاثرات پیش کرتا ہے جن کا علم اُسے محض قیاسی و سماعی طور پر حاصل ہوا ہے اور ہمیشہ ہر زمانہ میں اسی قسم کے شعرا کی تعداد زیادہ پائی گئی ہے بلکہ وہ لوگ جو واقعی شاعر ہیں اور خود اپنے تاثرات کو پیش کرتے ہیں وہ بھی گاہے گاہے اس بدعت کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اردو کے شاعروں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے شراب و متعلقاتِ شراب کا ذکر نہ کیا ہو، لیکن اگر آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جنہوں نے واقعی شراب پی کر ذکرِ بادہ خواری کیا ہے تو معلوم ہوگا کہ سو میں شاید ہی دو تین ایسے خوش نصیب ہوں جنہیں اس کی توفیق نصیب ہوئی ہو، ورنہ یہ سلسلۂ روایت یونہی سینہ بہ سینہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا چلا آیا ہے اور ان میں کوئی ایک بھی "محرمِ راز" نہیں، یہی سبب ہے کہ حافظ و غالب کی غزلیات میں ایک خاص لطف ہے ایک خاص ابداع (Innovation) ہے، ایک اصلیت (Originality) ہے، ایک حقیقت (Reality) ہے لیکن برخلاف اس کے ریاض کے یہاں رباوصف اس کے

کہ ان کا موضوع سخن یہی ہے، مشکل ہی سے کوئی شعر ایسا نکل سکے گا جسے کوئی بادہ خوار سُنکر خوش ہو سکے۔ داغ کا نہایت مشہور شعر ہے ؎

کچھ زہر نہ تھی شراب انگور کیا چیز حرام ہو گئی ہے

بظاہر اس میں کوئی ندرت نہیں معلوم ہوتی، لیکن یہ حقیقت صرف شراب پینے کے بعد ہی کھل سکتی ہے کہ اگر داغ شراب کی لذت سے واقف نہ ہوتا تو دوسرا مصرعہ کبھی نہ ہو سکتا تھا۔ بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ یہ مصرعہ صرف عروج نشہ ہی کی حالت میں کہا جا سکتا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ "کیا چیز" کا ٹکڑا کہ ـــ بغیر شراب پئے ہوئے زبان سے نکل ہی نہیں سکتا۔

تیسری قسم شاعری کی وہ ہے جو واقعی اپنے تاثرات دوسروں کو سناتی ہے اور عام طور پر اسی جماعت میں مت اول معیار شاعری کی جستجو کی جاتی ہے اور انہیں میں بلند و پست کا امتیاز قائم کر کے تنقید و تبصرہ کی خدمت انجام دی جاتی ہے۔

جناب ولی ظاہر ہے کہ، اوّل الذکر قسم کے "سنیاسی" شاعر تو ہو نہیں سکتے، کیونکہ وہ صاحب دیوان ہیں اسی دنیا کے آدمی ہیں، نظام تمدن و معاشرت کے ایک فرد صالح ہیں، انسانوں کی طرح رہتے ہیں۔ لوگوں سے بات چیت کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ زمیندار ہیں۔ تجارت کرتے ہیں۔ ٹھیکہ بھی کبھی کبھی لے لیتے ہیں یعنی مختصراً یہ کہ اگر ان کا دیوان سامنے نہ ہو اور کسی کو علم نہ ہو کہ آپ ہی حضرت ولی ہیں تو کوئی شخص یہ نہیں معلوم کر سکتا کہ آپ فلاں دلیل سے شاعر ثابت ہو سکتے ہیں۔ آپ خوش قسمتی سے اس جماعت شعرا میں بھی شامل نہیں ہیں جنہیں بجائے شاعر کے متشاعر کہنا چاہئے یا زیادہ رعایت سے کام لیں تو خیر شعرور و شویعر بھی کہہ سکتے ہیں ٭

بلکہ آپ کا کلام دیکھنے کے بعد ایک شخص یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ آپ واقعی شاعر ہیں اور شاعر بھی اس قسم کے جو زیادہ تر اپنے ہی تاثرات و جذبات کو پیش کرتے ہیں اور محض تقلید و نقالی کی شاعری نہیں جانتے ٭

شاعری کے بہت سے اصناف ہیں، یعنی بعض شاعر صرف قصیدہ گوئی کو اظہار کمال کا ذریعہ سمجھتے ہیں بعض رباعیات کے دلدادہ ہوتے ہیں بعض منظری و محاکاتی نظموں میں اپنے افکار کو پیش کرتے ہیں۔ بعض نے تو مباحث و اخلاقیات کو اختیار کر لیا ہے لیکن اکثر ایسے ہیں جو صرف جذبات محبت سے گفتگو کرتے ہیں، انہیں غزلگو شعراء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو ایک انسان کو صاحب دیوان بنا دیتی ہے اس میں شک نہیں کہ یوں تو تمام اصناف سخن اپنی اپنی جگہ ایک وقعت و قیمت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ واقعہ

تغزل کو تمام اصنافِ سخن میں وہی اہمیت و تفوق حاصل ہے جو گلدستہ میں چوٹی کے پھول کو حاصل ہوتی ہے یہ ایک ایسا بحرِ بے پایاں ہے جس کے ساحل کا پتہ نہیں، یہ ایسا وسیع میدان ہے کہ کوئی حد نظر سامنے نہیں اس میں ایک نوع کی ابدیت ہے جو جذبات انسانی کی ناقابل شمار کیفیات کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے، یہ ایک طرح کی "لانہایت" ہے، جو نفسیاتِ محبت کے ہزار اندر ہزار نکات کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ اگر کائنات کا ہیولیٰ نتیجہ ہے دقائق کی باہمی کشش کا، اگر موجودات کے صورِ مرئیہ کی تشکیل نام ہے۔ ذراتِ مادی کے تراکم و شدتِ اتصال کا یعنی اگر مادی دنیا میں "جواہرِ فردہ" کی باہمدگر "الفتِ کیمیائی" تمام عالمِ رنگ و بو کی وجود کا باعث ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اخلاق انسانی کی دنیا میں ان انعطافات کو نظر انداز کر دیا جائے جن کو شاعرانہ زبان میں "الفتِ روحانی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ایک غزل گو شاعر، اگر واقعی وہ شاعر ہے اور محبت کرنے والا دل رکھتا ہے، قدرت کا پیامبر ہے جو صرف ایثار قربانی، محبت و ہمدردی کا درس دینے دنیا میں آیا ہے، قدرت و عالم انسانی کے درمیان ایک ایسی کڑی ہے جو خلائق مادی کو تزکیہ تام کے بعد روحانیات سے ملا دیتا ہے۔ پھر جس شاعر میں خود تصفیہ روح و پاکیزگی جذبات زیادہ ہوگی اسی قدر خوبی سے وہ اس خدمت کو بھی انجام دے سکیگا۔

اس میں کلام نہیں کہ غزلگوئی کی ابتدا ان مادی جذبات سے شروع ہوتی ہے جو بسا اوقات صرف ہیجان نفس کے سایہ میں پرورش پاتے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ کمتر شاعر ایسے ہوتے ہیں جو اس منزل سے گزر کر غزل کے مقصودِ حقیقی تک پہنچتے ہیں لیکن جو شخص اس امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے، جو اس راہ سے خود فراموشانہ طور پر گزر جاتا ہے، وہ یقیناً اس دنیا کی چیز بھی نہیں رہتا اور یہی ہے ارتقا شاعری یا غزلگوئی کا۔

محبت سے زیادہ معصوم اور اس سے زیادہ غیر معصوم چیز دنیا میں کوئی نہیں، ایک ایسے شاعر کی محبت جس کو شاعری سے مطلق کوئی لگاؤ نہیں اکثر و بیشتر غیر معصوم ہی ثابت ہوتی ہیں، لیکن ایک سچے شاعر کی محبت ایسی پاکیزہ و معصوم چیز ہے کہ سوائے "انفاسِ الوہیت" کے اسے کسی اور شے سے مس کیا ہی نہیں جا سکتا۔

میں ایک حد تک اس کا مخالف ہوں کہ غزل کو حکمت و فلسفہ سے بھی کوئی تعلق ہے، کیونکہ میرے نزدیک تغزل بالکل چیز ہی دوسری ہے اور اس کو "عقلیات" و "حکمیات" سے متعلق کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ عشق کا علاج "علم العقاقیر" سے بھی ہو سکتا ہے۔ تغزل نام ہے محبت کی گفتگو کا، الفت کے راز و نیاز کا، حدیثِ عشق کا، وارداتِ قلبی کے اظہار کا، اور اس میں دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ "اصلیت" کتنی ہے، جوش کس حد تک پایا جاتا ہے اور سادگی بیان کا کیا رنگ ہے۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ ایک ہی جذبہ کو کس کس اسلوب سے پیش کیا گیا ہے۔ اور درد و تاثر کی کتنی کیفیت اس میں پائی جاتی ہے۔

حضرت دلؔ بھی صرف غزل گو شاعر ہیں اور اس لئے مجھے مسرت ہے کہ میں ایسے شخص کے کلام پر تنقید کرنے بیٹھا ہوں جس نے سوائے گفتگوئے محبت کے کوئی اور بات نہ کہی ہوگی۔ اور اسی یقین کو سامنے رکھ کر اب میں ان کے دیوان کی جستجو کرتا ہوں ؛

حضرت دلؔ نے بھی حسب رسم زمانہ پہلی دو غزلیں ایسی لکھی ہیں جنہیں حمد و نعت میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اصولاً اس قسم کی غزلیں اخیر میں ہونا چاہئیں تاکہ اگر توبہ کا دروازہ بند ہونے والا ہو تو اس کے اور اختتام دیوان کے درمیان کوئی ایسا فصل نہ پایا جائے جس پر کسی قسم کا احتساب ہو سکے۔

حمد و نعت کی غزلیں اکثر کیفیت سے خالی ہوتی ہیں، لیکن حضرت دلؔ کی نکتہ آفرین طبیعت یہاں بھی باز نہ آئی اور تغزل صحیح کا رنگ لئے ہوئے یہ شعر آخر کار نکال ہی لئے کہ ؎

حسن خود بیں کو ہوا اور رسوا ناز حجاب   شوق جب حد سے بڑھا چشم تماشائی کا

اثر عشق سے ہوں صورت شمع خاموش   پھر قع ہے مری حسرت گویائی کا

پہلے شعر میں "شاہد و مشہود" کی بحث کا جس خوبی سے فیصلہ کیا گیا ہے، اور دوسرے شعر میں "شمع" کو "حسرت گویائی" کہکر جو کچھ اور جتنا کچھ کہہ دیا ہے، اس کی تفصیل کے لئے حقیقتاً دفتر بھی ناکافی ہے ؛

تیسری غزل میں بھی ہلکی سی کیفیت حمد نگاری کی موجود ہے۔ وہ اس قدر لطیف و بلند ہو گئی ہے کہ جس وقت اس شعر پر نگاہ جاتی ہے ؎

کیا جانے کس خیال سے چھوڑا بہ حال زار
مجھ پر بڑا کرم ہے مرے چارہ ساز کا

تو قوت تنقید و تجزیہ دونوں خستگی سی محسوس کرنے لگتی ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں جذبات کی ان بلندیوں کی صراحت کی جائے جنہیں چند الفاظ کے اندر شاعر نے محدود کر دیا ہے ؛

پہلے مصرعہ کو پڑھ کر یہ سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ وہ کیا خیال تھا جس کے ماتحت "بہ حال زار" چھوڑ دیا گیا اور اُسے چارہ ساز کے کرم سے کیوں تعبیر کیا گیا تو ہجوم جذبات و معانی سے دم سا گھٹنے لگتا ہے ؛

اس مجموعہ میں اس قسم کے بلند اشعار بہ کثرت پائے جاتے ہیں، مثلاً ایک جگہ آپ اپنی بیخودی کو ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں کہ ؎

اُٹھ گیا پردۂ حایل، فقط اتنا ہے خیال   کیا کہیں جلوہ گہ ناز میں پھر کیا دیکھا

محبت کرنے والے کی انتہائی تمنا یہ ہوتی ہے۔ کہ آستان محبوب تک پہنچ جائے۔ لیکن اس تمنا کی تکمیل

میں سادگی کے ساتھ ساتھ جو کیفیت مسرت استغنا یا ناز عروج کی پائی جاتی ہے۔ اس کو جناب دل اسی حسن کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ؎

گرے یوں اُن کے سنگِ آستاں پر   جبینِ عجز پہنچی آسماں پر

غالب کا مشہور شعر ہے ؎

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود   قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

اکثر شعراء نے اس خیال کو ظاہر کیا ہے اور دیر و حرم کی جستجو کو بیکار بتایا ہے۔ جناب دل کی نگاہ بھی اسی بلندی تک پہنچتی ہے لیکن اپنی فطری متانت و سنجیدگی کی بنا پر نہ وہ دیر و حرم کی توہین کرتے ہیں نہ وہاں جانا لغو و بیکار بتاتے ہیں۔ بلکہ یوں ظاہر کرتے ہیں کہ ؎

جانبِ دیر و حرم کان لگے رہتے ہیں   کاش پردے ہی سے سننے تری آواز کہیں

یعنی ان کے نزدیک دیر و حرم صرف ایک پردہ ہے جس کے اٹھنے کے بعد ہی محبوب نظر آسکتا ہے لیکن اس کو وہ ظاہر کرتے ہیں اس انداز سے کہ اصل مدعا بھی ہاتھ سے نہ جائے اور اس ظاہر کو بھی ناگوار نہ ہو۔ اس خیال کو وہ دوسرے پیرایہ میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ ؎

گوشِ دل کے لئے کچھ طور کی تخصیص نہیں   ہر جگہ ہم تری آواز سنا کرتے ہیں

محبت میں ایک وقت ایسا بھی انسان پر آتا ہے جب فرطِ مایوسی میں وہ ترکِ تمنا کا خیال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شاید اس طرح مصائب سے نجات مل جائے لیکن بعد کو جب وہ اس کا ارادہ کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ترکِ تمنا، تو تمنا سے زیادہ دشوار چیز ہے۔ اس فلسفہ کو جناب دل نے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

دیا تھا عشق تو ہمت بھی دینے والا دیتا   کہ ایک وقت میں ہم ترکِ آرزو کرتے

شاعر نے اس شعر میں صرف ایک لفظ ہمت رکھ کر تمام مفہوم کو روشن کر دیا ہے اور اسی کو کہتے ہیں شاعری کا کمال اسی غزل کے بعض شعر اور ملاحظہ ہوں ؎

نگاہِ شوق رہی ہمزبانِ دل لیکن   کسی طرح نہ بنا شرحِ آرزو کرتے

تلاشِ یار کہاں آرزوئے دیدار کجا   ہمیں تو عمر ہوئی اپنی جستجو کرتے

مآلِ عشق پہ دل مطمئن اگر ہوتا   تو چھیڑ چھیڑ کے ناصح سے گفتگو کرتے

پہلے شعر میں عالمِ عشق و حسن کے جس منظر کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ وہ اہل دل سے مخفی نہیں، دوسرے شعر میں جو بلند خیال پیش کیا گیا ہے وہ بہت کم ایسے نپے تلے الفاظ میں کہیں نظر آئے گا۔ تیسرے شعر میں اس قدر لطیف بات کہدی ہے کہ داد کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔

نفسیات انسانی کا مسئلہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی تمنا کے خلاف گفتگو کرتا ہے تو اس پر غصہ آتا ہے لیکن جب اسی کے ساتھ انسان یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ کہنے والا صحیح کہہ رہا ہے تو عقل وتمنا کی یہ جنگ عجیب کیفیت پیدا کر دیتی ہے، نہ مایوس ہونے کو جی چاہتا ہے اور نہ کچھ کہتے ہی بنتی ہے۔ اسی خیال کو حضرت دل نے آخری شعر میں ظاہر کیا ہے کہ ناصح کی باتیں ہیں تو ایسی کہ ہم ان کو خوب بناتے، چھیڑ چھیڑ کر گفتگو کرتے، لیکن اس کا کیا علاج کہ انجام محبت خود ہم کو ویسا ہی نظر آتا ہے جیسا ناصح کہہ رہا ہے۔ اور اس لئے کس اطمینان پر اس کی مخالفت کی جائے۔ ناصح کے ساتھ جو شاعرانہ چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے یہ شعر اسی سلسلہ کا ہے لیکن اس قدر اچھوتا انداز بیان اور دلکش مفہوم، میں نے بہت کم دیکھا ہے۔

بلند خیال کے ساتھ اگر الفاظ بھی مناسب مل جائیں تو اس میں کلام نہیں کہ شعر سحر کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ مشہور بات ہے کہ محبت میں فنا ہو جانا محبت کی تکمیل ہے اور اس خیال کو ہزاروں طریقے سے ظاہر کیا گیا ہے حضرت دل نے بھی اسی خیال کو لیا ہے لیکن اسلوب بیان سے ایسی تازگی پیدا کر دی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کوئی نئی بات بیان کی جا رہی ہے۔ ملاحظہ ہو :-

دریائے محبت میں پہنچائے خدا تک ڈوبے گی جہاں کشتی اپنا وہی ساحل ہے

معلوم ہوتا ہے کہ پورا شعر بیک وقت شاعر کے دل میں آیا ہے اور دوسرے مصرعہ کے لئے پہلا مصرعہ ڈھونڈھنے کی اس کو ضرورت ہی نہیں پڑی

فن شعر میں ایک خاص چیز اور ہے جسے میں "تعبیر شاعرانہ" کہتا ہوں یعنی بغیر تشبیہ صریح محض استعارہ وکنایہ ویا کنایہ بالا استعارہ کی صورت میں کسی بات کو ظاہر کرنا . . . . اس انداز بیان کا ذہن سلیم پر نہایت قوی اثر ہوتا ہے۔ اور جو شاعر اس باب میں متعدد طریقے اس تعبیر کے پیدا کرتا ہے وہ بہت زیادہ کامیاب شاعر کہلاتا ہے۔ مومن کی شاعری کا راز صرف یہی تعبیر شاعرانہ ہے، اور اہل علم میں غالب کے وہی اشعار زیادہ ترپسند کیے جاتے ہیں، جن میں تعبیر کی کوئی خصوصیت پائی جاتی ہے۔

حضرت دل کے دیوان میں بھی متعدد مثالیں بہترین تعبیر شاعرانہ کی پائی جاتی ہیں۔ ایک جگہ دامن جھٹکنے کے انداز کو ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں ؎

سر طور ایک برق حسن لہراتی نظر آئی ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے داماں کو

اگر اسی کو تشبیہ کی صورت میں صرف مشبہ کے ساتھ ظاہر کر دیتے تو یہ لطف کبھی پیدا نہ ہوتا۔ دونوں مصرعوں میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علٰحدہ علٰحدہ دو باتیں بیان کی گئی ہیں لیکن جس وقت پورا شعر سامنے آتا ہے تو

از خود دونوں مصرعے مل کر ایسا لطیف اثر قلب و دماغ پر چھوڑ جاتے ہیں کہ بے اختیار کلمۂ تحسین زبان سے نکل جاتا ہے ؀

قریب قریب اسی انداز کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

ہم کیا بتائیں کیا تھی تیری نگہ کی گردش اک وجد کی سی حالت پہروں رہی ہماری

پہلے شعر میں محاکات کا رنگ تھا، لیکن اس میں تعبیرِ شاعرانہ کا تعلق صرف تاثر و کیفیت سے ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کسی کی "گردشِ نگہ" اپنی "حالتِ وجد" سے تعبیر کرنا اس قدر لطیف بات ہے کہ اگر اس خیال کو بہتر سے بہتر تشبیہ سے بیان کیا جاتا۔ تو بھی یہ حسن نہ پیدا ہو سکتا تھا۔

"سی" "نگاہ" کے متعلق ایک اور شعر حضرت دلؔ نے لکھا ہے جس میں زیادہ تر استعارہ بعیدہ کا رنگ ہے مگر کتنا خوب لکھتے ہیں ؎

یاد ہے ہاں یاد ہے طرزِ نگہ دستانہ ایک نازک پنکھڑی سے پارہ پارہ دل ہوا

ایک دوسرے شعر میں اس سے زیادہ مکمل طور پر اسی خیال کو اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

اندازِ تبسم تابِ شکن تھا کہ الاماں اِک پنکھڑی کی چوٹ سے دل چور ہو گئے

تعبیرِ شاعرانہ کی ایک نہایت نازک صورت یہ ہوا کرتی ہے کہ ظواہرِ مادی کو "تاثراتِ ذہنی" میں تبدیل کر دیا جائے حضرتِ دل کا ایک شعر اسی رنگ کا ملاحظہ ہو ؎

سُن لیجئے حالِ دلِ مضطر دمِ آخر ہو جائیگا ختم آج ہی افسانہ کسی کا

حالِ دل سننے کا تعلق سامعہ سے ہے۔ جو "ظواہرِ مادی" میں شامل ہے، لیکن "دمِ آخر" کہکر دوسرے مصرعہ میں "افسانہ کے ختم ہو جانے" کی اطلاع دینا سارے منظر کو عالمِ درد و تاثر میں تبدیل کر دیتا ہے ؀

اسی تعبیر کی صورت ایک اور بھی ہوتی ہے جسے تعبیرِ بامعنی کہنا چاہئے اور اگر شاعر کو اچھے خیال کے ساتھ الفاظ بھی اچھے مل جائیں تو یہ انداز نہایت دلکش ہو جاتا ہے اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو ؎

کنارے تک تو پہنچے گو کسی صورت سے بھی پہنچے تلاطم بحرِ غم کے ڈوبنے والوں کو ساحل تھا

ساحل اور غرقابی میں بالکل نسبت تضاد ہے لیکن شاعر نے تاویلِ معنوی سے دونوں کو ایک چیز ثابت کر دیا تعبیر شاعرانہ کی ایسی مثال سوائے اساتذہ کے کسی اور کے کلام میں مشکل سے ملتی ہیں۔

تقریباً اسی نوع کی دوسری مثال یہ ہے ؎

جو ہو نا آشنائے رازِ خاموشی وہ کیا سمجھے کہ ہے ناقابلِ تشریح اے دلؔ داستاں میری

اس میں "خاموشی" کو "ناقابلِ تشریح" داستانِ دل سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اسی کے ساتھ ایک لطیف کنایہ یہی ہے کہ خاموشی حقیقتاً خود ایک تشریح و صراحت ہے۔ اگر کوئی سمجھے۔

ایک اور شعر اسی رنگ کا یہ ہے ؎

نگاہِ شوق رہی ہمزبانِ دل لیکن　　　کسی طرح نہ بنا شرحِ آرزو کرتے

مصرعِ ثانی میں شرحِ آرزو نہ کر سکنے کا ذکر ہے، لیکن پہلے مصرعہ میں "نگاہِ شوق" کو "ہمزبانِ دل" لکھ کر شرحِ آرزو بھی کر دی گئی ہے۔

اسی سلسلہ میں ذیل کے اشعار خصوصیت کے ساتھ داد طلب ہیں ؎

شوقِ دل جتنا بڑھا گرداب میں بڑھتی گئی　　　آگے آگے نفس کے دھوکا سا کچھ حس کا ہے

انجام پوچھنا تھا ہمیں سوز و ساز کا　　　اے اہلِ بزم شمعِ سحر تو خموش ہے

ہماری کشتیِ عمرِ آہ ڈوبتی تھی ادھر　　　اُدھر نجومِ فلک ڈوبتے اُچھلتے تھے

اب تو ہر ہر نفس سردِ ہے افسانۂ دل　　　شدتِ غم میں کوئی جوشِ تمنا دیکھیے

الغرض حضرت دلؔ کے کلام میں مضمون آفرینی، علوئے خیال، ندرتِ مفہوم اور تعبیر بلند کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں، جو ثبوت ہے اس امر کا کہ جہاں تک ذہنیت خلاق، اکتسابِ فن اور مہارتِ شعری کا تعلق ہے وہ یقیناً ایک کامیاب شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ چیز جس کا نام غزل ہے، وہ کیفیت جسے "تغزل" سے موسوم کیا جاتا ہے اور وہ والہانہ تاثر جسے سوز و گدازِ محبت کہتے ہیں، کس حد تک آپ کے کلام میں نظر آتا ہے۔

افسوس ہے کہ ضیقِ وقت نے مجھے مہلت نہیں دی کہ میں پوری طرح اس مجموعہ کا مطالعہ کر سکتا لیکن اس امر کے اظہار میں مجھے نہایت مسرت ہے کہ سرسری نگاہ سے بھی صحیح رنگِ تغزل کے بہت سے پاکیزہ نمونے مجھے نظر آئے۔

تغزل کی دو بڑی تقسیمیں ہیں، ایک تو وہ جسے "عشاقی تغزل" کہتے ہیں اور اس میں صرف ان معاملاتِ حسن و عشق سے بحث کی جاتی ہے، جو زیادہ تر معاملہ بندی، محاکات، شوخی، چھیڑ چھاڑ اور ہلکے ہلکے جذباتِ محبت سے متعلق ہوتے ہیں۔ دوسری قسم تغزل کی وہ ہے جس کا نام میں نے "اثاثی تغزل" رکھا ہے اور میرؔ کی شہرت و کامیابی اسی رنگ کی تکمیل کی وجہ سے ہے۔ وہ لوگ جو قنوطی شاعری (Pessimistic poetry) کو زیادہ پسند کرتے ہیں وہ حقیقی تغزل اُسی کو سمجھتے ہیں، لیکن میرے نزدیک دونوں قسمیں اپنی اپنی جگہ قابلِ ستائش ہیں اور حقیقی شاعر وہی ہے جس میں یہ دونوں رنگ مکمل طور پر پائے جائیں۔

حضرت دلؔ کے مجموعہ میں دونوں قسم کے اشعار پائے جاتے ہیں اور ایک خاص اعتدال کے ساتھ، یعنی نہ

"غنائی تغزل" میں عامیانہ پن کی حد تک پہنچتے ہیں، نہ "ماتمی تغزل" میں بین اور مرثیہ کی حد تک۔ بلکہ ان کی شاعری "تبسم و موج" کا نہایت لطیف امتزاج ہے اور اگر وہ ہمیں کو خندۂ بے اختیار پر مجبور نہیں کرتے، تو عورتوں کی طرح گریہ و زاری میں بھی مبتلا کرنا نہیں چاہتے۔

چونکہ مقدمہ زیادہ طویل ہوگیا ہے۔ اس لئے میں صرف چند شعر یہاں پیش کروں گا۔ جن سے حضرت دل کی غزل گوئی کے یہ دونوں رنگ سامنے آجائیں۔

محبت کی کیفیت صحیح کو نہایت سادگی کے ساتھ حضرت دل اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

ہر دم ہے اسی محوِ تغافل کا تصور — عشق اور کسی کام کے قابل نہیں رکھتا

غنائی تغزل کی ایک بہترین مثال ملاحظہ ہو ؎

یہ بھیگی رات، یہ ٹھنڈا سماں پر کیف بہار — یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اُٹھ کے جانے کا

محبوب سے جس انداز میں خطاب کر کے محاکات و موسیقیت کو آپس میں ملا دیا گیا ہے وہ کسی معمولی شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اس شعر میں نہ کوئی تشبیہ ہے نہ استعارہ، نہ رعایت لفظی ہے نہ سوز و گداز، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ شعر مکمل نہیں ہے۔ میں تو اسے پڑھنے کے بعد آج کل (مئی) کی دوپہر کی گرمی میں بھی خاص قسم کی خنکی محسوس کرنے لگتا ہوں۔

محبت کا یہ فلسفہ کہ محبوب کا لطف سب سے بڑا ظلم ہے، ان الفاظ میں بیان ہوتا ہے ؎

وقتِ رخصت تسلیاں دے کر — اور بھی تم نے بیقرار کیا

مضمون پامال ہے، اس کیفیت کو اکثر شعراء نے ظاہر کیا ہے، لیکن جس سادگی سے جناب دل نے کہہ دیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر وہی کہہ رہا ہے جو خود اُس پر کبھی گزر گئی ہے۔ اس شعر میں سب سے زیادہ پُر لطف بات محبوب سے تخاطب ہے اور وہ بھی لفظ "تم" سے۔ اگر دوسرا مصرعہ یوں ہوتا:۔ اور بھی اس نے بیقرار کیا۔ یا۔ اور بھی تو نے بیقرار کیا تو یہ کیفیت کبھی نہ پیدا ہوتی۔

ایک غریب شاعر جب اپنی کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔ تو اُس کے لئے بہت سے الفاظ، متعدد تشبیہیں اور مختلف طریقے اظہار کے ڈھونڈھتا ہے، لیکن ایک شاعر صرف ایک معمولی فقرہ سے وہ نشتر چبھو دیتا ہے کہ الاماں۔ فرقت کی تکلیفوں کا بیان خدا جانے کس کس مبالغہ کے ساتھ شعرائے لکھنؤ کے یہاں پایا جاتا ہے لیکن حضرت دل معمولی سادہ الفاظ میں پوری داستان درد دُہرا جاتے ہیں ؎

کہنے کی ہے کیا حاجت احوال شبِ فرقت — گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سنا ہوگا۔

اس شعر میں "تم نے بھی سنا ہوگا" صرف اس ایک فقرہ سے وہ کام لیا گیا ہے جسے دوسرا شخص فرقت کے فرسیاہ

کر دینے کے بعد بھی پورا نہیں کر سکتا۔ کاش اس شعر کا پہلا مصرعہ یہ نہ ہوتا۔

ایک غزل میں آپ محبوب سے یوں خطاب کرتے ہیں ؎

دلسوز اگر ہو تو دکھائیں جگر کے داغ
تم چارہ ساز ہو تو کہیں ماجرائے دل

لیکن اگر آپ اس شعر میں "دکھائیں" اور "کہیں" کو اس طرح نہ پڑھیں جس سے عزم و ارادہ کی شان پیدا ہو، بلکہ بیان "حسرت" کے طور پر ادا کریں تو معلوم ہوگا کہ مخاطب کوئی دوسرا نہیں ہے بلکہ خود اپنی ذات ہے اور تغزل میں اس نوع کا "تخاطب بالنفس" (Soliloquy) نہایت بلند مرتبہ کی چیز سمجھا جاتا ہے۔

اسی غزل کا ایک شعر یہ ہے جس میں دوسرے رنگ کے ساتھ اسی مفہوم کو ادا کیا گیا ہے ؎

وہ خود غرض سنے نہ سنے اس سے کیا غرض
کہنا ہے بار بار ہمیں مدعائے دل

محبوب کا جب تک سامنا نہ ہو، عاشق کے دل میں خدا جانے کیا کیا ولولے ہوتے ہیں۔ اور وہ سمجھتا ہے کہ جب حضوری ہوگی تو شکایتوں کا دفتر کھول دونگا۔ اور قائل کئے بغیر نہ رہونگا، لیکن جب وہ "آرام جاں" سامنے آجاتا ہے تو اس عزم و ارادہ کا کیا حشر ہوتا ہے؟ حضرت دل یوں بیان کرتے ہیں ؎

دفعتہً پھر بھول جاتے ہیں جو کچھ آتا ہے یاد
ہم کسی کے سامنے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

ابتدائے رغبت میں بعض صورتیں ایسی بھی پیدا ہوتی ہیں جب عاشق کی سمجھ میں خود نہیں آتا کہ یہ کیا ہوا اور یہ تو کیونکر۔ حضرت دل نے اسی قسم کی ایک کیفیت کو اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

ہم کو بے چین کئے جاتے ہیں   ہائے کیا شے وہ لئے جاتے ہیں

یہاں "شے" سے کوئی متحقق چیز مراد نہیں ہے کہ آپ پہلے مصرعہ میں بے چین دیکھ کر لفظ "شے" سے "چین" کے معنے لے لیں، بلکہ مبہم مفہوم لیجیئے اور "کیا شے" کو ہلکا سا استفہامی و استعجابی رنگ دے کر پڑھیے۔ جب شعر کا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔

محبوب کے وعدہ کی نا استواری اور عاشق کا ہمیشہ اس کو باور کر لینا دنیائے محبت کا نہایت مشہور واقعہ ہے۔ لیکن حضرت دل اپنی ندرت بیان سے کام لے کر اس کو یوں ظاہر کرتے ہیں ؎

جفا کے بعد وہ عہد وفا کریں تو سہی
محال ہے کہ مرے دل کو اعتبار نہ ہو

مومن کی شاعری مجھے بہت عزیز ہے اور صرف اس لئے کہ وہ شعر کے درمیان بعض ٹکڑے چھوڑ کر ایک داستان کی داستان کو چند الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ حضرت دل کا ایک شعر بالکل اسی رنگ میں ملاحظہ ہو ؎

نگاہ مست سے او مڑ کے دیکھنے والے
تجھے تو ہے، مجھے اپنی خبر نہیں نہ سہی

اس شعر میں "تجھے تو ہے" خدا معلوم کتنی تفصیل اپنے اندر رکھتا ہے۔ اسی قسم کے نہایت لطیف عاشقانہ جذبات کی دوسری مثال یہ ہے ؎

کچھ خبر ہم کو نہیں، کون تھا وہ حضرت دل
چل دیا دل ابھی سینہ سے بس کر کوئی

پردہ اٹھنے کے بعد حضوری دوست جو از خود رفتگی عاشق پر طاری ہوتی ہے کسی سے مخفی نہیں، لیکن اس کو ظاہر کس طرح کیا جائے۔ حضرت دل اس سے یوں عہدہ برآ ہوتے ہیں ؎

پردہ اٹھا دیا یہ عجب اس نے چال کی
دیکھا تو ہم میں تاب نہ تھی عرض حال کی

دوسرے مصرعہ کی بے ساختگی نے معمولی بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ محبت کی کسی کیفیت یا حالت کا بیان ایسے سادہ الفاظ میں کہ کسی تصنع کا شائبہ نہ پایا جائے۔ غزل کی جان۔ فرقت میں محبت کرنے والے پر خدا جانے کیا کیا شدتیں گزر جاتی ہیں، ان میں سے ایک کا حال حضرت دل اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

کسی کی یاد تھی آنکھوں سے اشک ڈھلتے تھے اسی خیال میں ہم کروٹیں بدلتے تھے

اسی کے برعکس دوسری کیفیت ملاحظہ کیجئے ؎

روز آ آ کر تسلی دل کو دے جاتا ہے کون
کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ سمجھاتا ہے کون

یہ ہے صحیح رنگ تغزل اور اس کا نام ہے "حدیثِ محبت" جس سے لکھنوی شعراء اکثر محروم رہے اور جو اس سکول میں سوائے سلسلۂ مصحفی کے (جس میں ہمارے دل صاحب بھی شامل ہیں) کہیں اور نہیں پائی جاتی۔

مومن کی وہ غزل "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" بہت مشہور ہے۔ اسی طرح کی آپ بیتی عنفوانِ شباب کی حضرت دل نے بھی ایک مسلسل غزل کی صورت میں لکھی ہے۔ میں اس غزل کو یہاں نقل کر کے ان کی جذباتی شاعری کا ذکر ختم کرتا ہوں ؎

یاد ہے اے ہمنشیں وہ بھی زمانہ یاد ہے دل کا آنا یاد ہے پہلو سے جانا یاد ہے

جس جگہ آنکھیں لڑی تھیں ہے وہ منظر سامنے　　جس جگہ ہوش اُڑ گئے تھے وہ ٹھکانا یاد ہے
وہ مری بیتابیاں، وہ جوشِ چشمِ اشکبار　　وہ کسی گل پیرہن کا مسکرانا یاد ہے
اک بتِ کافر ادا نا آشنا کے عشق میں　　یاد ہے رہ رہ کے وہ آنسو بہانا یاد ہے
وہ تلطف اور وہ اس کا تلون ہائے ہائے　　وہ نگاہیں ملتے ہی آنکھیں چرانا یاد ہے

داستانِ دل نہ بھولی ہے نہ بھولے گی ضمیر
ابتدائے عشق کا اب تک زمانہ یاد ہے

فن کے لحاظ سے ردیف کا صحیح استعمال بھی خاص چیز ہے، چہ جائیکہ اس کے استعمال میں کوئی جدت و ندرت پیدا کرنا۔ بعض مثالیں حضرت دل کے کلام سے ایسی پیش کرتا ہوں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ "ردیف" کے استعمال میں کیسی کیسی شگفتگیاں پیدا کر دیتے ہیں۔

ایک غزل ہے جس میں "نشتر رہ گیا، رہبر رہ گیا" ردیف و قافیہ ہے، مقطع میں اس ردیف کو کس حسن کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؂

شوق سے تقوی شکن بن جاؤ تم اے دل مگر　　یہ سمجھ لو آج پی تو جامِ کوثر رہ گیا

ایک اور غزل ہے جس کا ردیف و قافیہ "زمانے کا، آستانے کا" ہے۔ اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؂

فقط ہے وعدہ ہی وعدہ نہیں وہ آنے کا　　پکارتا ہے یہ انداز مسکرانے کا
نہ پوچھ حالِ شبِ غم نہ پوچھ اے دل سوز　　نہیں نہیں وہ فسانہ نہیں سنانے کا

مطلع کے پہلے مصرعہ میں "آنے کا" آئے گا کے معنی میں مستعمل ہوا ہے، اور دوسرے شعر میں "سنانے کا" مفہوم ہے سنے کے قابل" "فغاں ہو جانا۔ زباں ہو جانا۔ ردیف و قافیہ ہے اس غزل کے ایک شعر میں جناب دل نے ردیف کے دو ٹکڑے کر کے عجیب لطف پیدا کیا ہے ؂

سوئے صحرا، تہِ تربت، پسِ دیوارِ حبیب
ہم بھی تقدیر پہ شاکر ہیں جہاں ہو، جانا

"دیوار پر، مغار پر" — اس غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؂

ہمصفیر و فصلِ گل آنے تو دو　　خود بخود ہو جائیں گے تیار پر

ایک غزل ہے جس کا ردیف و قافیہ "انداز کہیں، آغاز کہیں" ہے۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو جس میں ظرفی مفہوم کو فعل میں تبدیل کر دیا ہے ؂

حق تو یہ ہے کہ خطا تم سے ہوئی اے منصور   تھیں چھپانے کی جو باتیں وہ بآواز کہیں

ایک غزل میں ردیف ہے "معلوم ہوتی ہے" اور قافیہ "آتشیں، جبیں" وغیرہ ہے۔ اس کے ایک شعر میں قافیہ کا استعمال ملاحظہ ہو۔

جو حسرت راحتِ دل تھی جلائے دل روح پرور تھی
نہیں اب گوشۂ دل میں کہیں معلوم ہوتی ہے

حضرتِ دل نے فارسی ترکیبیں بہت کم استعمال کی ہیں۔ لیکن اگر کہیں کی ہیں تو نہایت لطیف و سبک۔ مثلاً:—

بنے گا قصۂ عبرت کسی زمانہ میں   مرا نیاز ترا شیوۂ ستم نظری
سمجھ رہا ہوں تقاضائے عشق والوں کو   نہ امتیاز اثر ہے نہ حسن بے اثری
خیال و خواب ہوا رخصتِ بہار کے بعد   نہ انبساطِ تمنا نہ وہ نغمۂ سحری

ستم جو جا کے اٹھاؤ قضا کو یاد کرو   مآلِ ہستیٔ اہلِ وفا کو یاد کرو
جو بے حسی کبھی بڑھ جائے قلبِ مضطر کی   کرشمۂ نگہِ فتنہ زا کو یاد کرو
تو دل آزار رہا، درد کا درماں نہ ہوا   چارہ سازِ خلشِ نوکِ مژگاں نہ ہوا
اک زمانہ وہ بھی تھا وحشت اثر کوئی نہ تھا   محوِ نیرنگِ نگاہِ عشوہ گر کوئی نہ تھا
تا درِ یار پہنچنا تھا کہ رخصت ہوئی روح   رہ گئی آرزوئے عرضِ تمنا باقی

غزل کی ایک اور خصوصیت سادگیٔ بیان ہے، سو اس کی مثالیں جناب دل کے دیوان میں ہر جگہ اس قدر کثرت سے ملتی ہیں کہ کسی انتخاب کی ضرورت نہیں۔ اس وقت تک جتنے اشعار انتخاب کئے گئے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو اس خصوصیت کا حامل نہ ہو ——— شوخی چونکہ ان کی فطرت نہیں اس لئے اس کی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں۔

اس مجموعہ میں علاوہ غزلوں کے کچھ رباعیاں بھی ہیں اور مختلف مطالب و معانی کی ہیں۔ چند تضمینیں ہیں اور ایک نظم ترجیع بند کے طرز کی بھی ہے۔ چونکہ حضرت دل ایک کہنہ مشق شاعر ہیں اس لئے جو کچھ لکھتے ہیں اس میں سلاست و روانی اس خوبی سے پائی جاتی ہے کہ ذہن سامع متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ چنانچہ جو شخص غزلیں دیکھنے کے بعد آپ کی رباعیات اور تضمین وغیرہ کو دیکھے گا وہ ایسا محسوس کریگا کہ انہوں نے شاید عمر بھر رباعیاں اور تضمینوں کے سوا کچھ لکھا ہی نہیں۔

— نیاز فتحپوری

دل کے قافیے میں ایک غزل

(ناخدائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی)

مزا الفت میں کیا دونوں کو حاصل ہو نہیں سکتا — مگر مشکل ہے ایک اُن کا مرا دل ہو نہیں سکتا

جفا و رشک و غم سہنے کے قابل ہو نہیں سکتا — مرا دل ہو بھی سکتا ہے ترا دل ہو نہیں سکتا

کسی کے رنج و غم میں کوئی شامل ہو نہیں سکتا — مرا ساتھی مرا حامی مرا دل ہو نہیں سکتا

عزیز تعلق بننے کو وفا کی بھی ضرورت ہے — فقط پہلو میں رہنے سے کوئی دل ہو نہیں سکتا

الٰہی اُڑ گئی دنیا سے کیا تاثیر الفت کی — وہ کہتے ہیں ہمارا دل ترا دل ہو نہیں سکتا

وہ فرماتے ہیں لاؤ مجھ کو دے دو کس طرح دے دوں — مرے پہلو میں پیدا دوسرا دل ہو نہیں سکتا

وفا سے آدمی تسخیر کر لیتا ہے عالم کو — وہ دل میں رہتے رہتے کیا مرا دل ہو نہیں سکتا

ہم آئیں کیا کریں یہ جانتے ہیں یہ سمجھتے ہیں — ہوا میں بھی شگفتہ غنچۂ دل ہو نہیں سکتا

وہ موسیٰ ہی تھے غش کھا کر گرے جو طور سینا پر — ہمیں جلوے سے سکتہ بھی تو اے دل ہو نہیں سکتا

جگہ دوں کیا سمجھ کر میں ترے پیکاں کو پہلو میں — مرا دل بن نہیں سکتا مرا دل ہو نہیں سکتا

پرائی چیز مل جائے تو پھر بھی وہ پرائی ہے — کوئی لے کر مرا دل مالکِ دل ہو نہیں سکتا

نگاہوں سے نگاہیں بلکہ اکثر چھپ بھی جاتی ہیں — مگر مل کر کبھی دل سے جدا دل ہو نہیں سکتا

وہی الفت وہی حسرت وہی غمزے وہی عشوے — نئے تم ہو نہیں سکتے نیا دل ہو نہیں سکتا

خصوصیت بھی کوئی چیز ہے ذاتی فضیلت بھی — تڑپنے کو جگر تڑپے مگر دل ہو نہیں سکتا

لگاوٹ اور پھر اس پر لگاوٹ خوب دلوں کی — انہیں تو دل بھی دے کر کوئی بے دل ہو نہیں سکتا

ہوائے گل اُڑا لے جائے لیکن ہے یہ مجبوری — عنادل کے تلفظ سے جدا دل ہو نہیں سکتا

یہ مانا اس میں بھی شوخی ہے اس میں بھی شرارت ہے — مگر تم سے زیادہ چلبلا دل ہو نہیں سکتا

وفا سے اُس کو مطلب ہے جفا سے واسطہ اُس کو
جنابِ نوح کا دل آپ کا دل ہو نہیں سکتا

تبصرہ

(لسان الہند مولوی مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی)

شعر جب فصاحت و بلاغت کی منزلیں طے کرتا ہوا شاعر کے دماغ سے نکلتا ہے۔ تو کبھی اعجاز ہوتا ہے کبھی سحر۔

وجد الشعر حینا وجد السحر ۔ ما شقیقین لیس یفترقان

عرب کے کسی شاعر نے خوب کہا ہے:۔

وما الشعر الا الشہد والسحر الحلی ۔ یعنی المنی یرفی العقول ویسکر

وما الشعر لا ادری وادری لانی ۔ تصورتہ لکنہ لا یصورہ

محسوسات انسانی کا منظوم ہو کر ایک خاص پیرایہ میں ظہور پذیر ہونا شاعری ہے۔ موضوع کچھ بھی ہو۔ مگر شعر شعر نہیں ہو سکتا۔ جب تک اُس کا تعلق جذبات و احساسات انسانی سے نہ ہو۔ اور جب تک انداز بیان و طرز ادا میں جدت و ندرت اور ایک خاص ترتیب و توازن نہ ہو۔ قدما کا قول ہے کہ قوت گویائی مشق سے جلا پاتی ہے۔ مگر شاعری فطرت انسانی ہے۔ دراصل شاعری وہ آفتاب ہے۔ جو ایجاد کے وسیع و زریں کشت زاروں پر جلوہ افگن رہتا ہے اس کی شعاعوں میں فطرت کے وہ مناظر باصرہ نواز ہوتے ہیں۔ جہاں دوسرے علوم حلقہ بیروں در ہیں۔

اس معیار پر جانچنے کے بعد ہندوستان میں گنتی کے چند شاعر ملتے ہیں جن کا کلام اِن خوبیوں سے مالا مال ہے۔ اُسی محدود گروہ میں میرے قدیم کرم فرما حکیم ضمیر حسن خاں صاحب دِلؔ بھی ہیں۔ مجھے روحانی مسرت ہے کہ اُن کا کلام زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ رہا ہے۔ حقیقی شاعری کے دلدادہ ان کے نتائج افکار سے بہرہ مند ہوں گے۔ اور یہ سمجھیں گے کہ مصنوعی اور فطری شاعری میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ خصوصاً اس عہد میں جب کہ شاعری بازیچۂ اطفال ہو رہی ہے۔

حضرت دلؔ کا کلام فصاحت و بلاغت کی تمام خوبیوں سے لبریز ہے سلاست و روانی کے ساتھ مضمون آفرینی جذبات کے ساتھ ندرت و تازگی اور اثر کی فراوانی باعتبار فن یا اصول غرض ہر حیثیت سے وہ ایک گرانمایہ شاعر ہیں۔ لکھنؤ کے بڑے بڑے مشاعروں میں اُن کی نوا سنجیوں نے سکہ بٹھا دیا ہے۔

علاوہ شاعری کے اُن کی ذات مجمع صفات بھی ہے۔ طبیعت مرنجاں مرنج اخلاق سے آراستہ متانت و خاموشی نے وقار بلند سے بلند تر کر دیا ہے ان باتوں کا اثر کہیں کہیں اُن کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے۔ الشعر کالمرآۃ برسم فیہ عقل الناظم موصوف کے چند اشعار اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتا ہوں جن

کی خوبیوں پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ مگر افسوس یہ خدمت میرے متعلق اس وقت ہوئی۔ جب اپنے امراض سے مجبور ہوں اور حسب خواہش اس کام کو انجام نہیں دے سکتا۔

یہ گویا واقعات بزم ہستی کا خلاصہ ہے
ترا یوں و نغمۂ خاموش اے شمع سحر ہونا

مدد اے جوشِ وحشت ایک ہی عالم نظر آئے
مرا چاک جگر چاک گریباں سے ملا دینا

بارہا ڈوب کے اُبھرا مرے دل سے نشتر
راز پھر بھی نہ کھلا عشق کی گہرائی کا

بہا رہے ہیں اپنی طبیعت خزاں نصیب
دامن پہ کھینچ کھینچ کے نقشہ بہار کا

گو رازِ حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا
ذرّوں میں کوئی ذرّہ بیکار نہیں ہوتا

شعر کا اندازِ بیان کس قدر فلسفیانہ ہے۔

ہوئی قیدِ تعین مانعِ دیدار اے موسیٰ
نگہ کو چاہیئے تھا بے نیازِ طور ہو جانا

رگیں کھچنے لگیں دل کی خوشا تمہیدِ نظارہ
وہ پردہ اُٹھ رہا ہے ہمنشیں اک تو حائل تھا

او عہد شکن حشر میں بھی وعدہ فردا
آنیکو ہے اس دن کے سوا کیا کوئی دن اور

گرے یوں اُن کے سنگ آستاں پہ
جبینِ عجز پہنچی آسمان پر

بیڑیاں جب کٹ چکیں کیا جانئے کیا آیا خیال
ہنس کے آہِ سرد کھینچی سوئے زنداں دیکھ کر

دونوں شعر محاکات کی بہترین مثال ہیں

سنگِ درِ حبیب کو حسِ نہ سہی قبول کی
فرق نہ آئے اے جبیں حوصلۂ نیاز میں

اُٹھے تو محو تمنا ملے تو غرقِ نیاز
نگاہ شوق کو فکرِ مآل کار نہ ہو

سرِ طور ایک برق حسن لہراتی نظر آئی
ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے داماں کو

اس شعر کی ندرت قابلِ داد ہے۔

رہیں گے مست ہمیشہ شراب ہو کہ نہ ہو
ملے تو تہمت ساقی اگر نہیں نہ سہی

یہی ہے سوزِ دلِ عندلیب کے معنی
قفس تو پھونک دیا چند پر نہیں نہ سہی

نگاہِ مست سے اوٹر کے دیکھنے والے
تجھے تو ہے مجھے اپنی خبر نہیں نہ سہی

زبان۔ اندازِ بیان ردیف کی خوبیاں داد طلب ہیں۔

برپا ہوا ہے حشر بس اتنی سی بات پر
اک نالہ کش کے بس میں طبیعت نہیں رہی

افسوس اک اسیرِ قفس کی تمام عمر
وقفِ نظر شناسیِ صیاد ہو گئی

شعر نہیں حسرت کا ایک دفتر ہے۔

عزیز لکھنوی

نغمۂ دل

(از عالی جناب علامہ سید علی احسن صاحب احسنؔ مارہروی لیکچرار مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)

نغمۂ دل جناب حکیم ضمیر حسن خاں صاحب (دلؔ) شاہجہانپوری کے دیوانِ غزلیات کا نام ہے۔ بسلسلۂ سخن تقریباً ۳۰-۲۵ برس سے راقم الحروف اور جناب موصوف میں رابطِ تعارف قائم ہیں۔ اس زمانے کا بڑا حصہ اگرچہ نصف الملاقات تک محدود رہا مگر بمصداق "زبان کا ایں دولت از گفتار خیزد" آوازۂ کلام نے دروازۂ کلیم تک پہنچنے کیلئے کوئی اجنبیت نہیں رکھی۔ کم و بیش چار مہینے ہوئے کہ نغمۂ دل کا خاطر نشیں کلام باصرہ نواز ہوچکا ہے۔ متذکرہ بالا تعارف و خصوصیت کے باوجود اس بے توفیقی پر نادم ہوں کہ اب تک اپنی لطف اندوزی کا اظہار نہ کرسکا۔ اور اسوقت بھی جتنا اور جیسا لکھ رہا ہوں۔ وہ نہ لکھنے کے برابر ہے۔

شعر و سخن پر تبصرہ لکھتے وقت عموماً شاعری کی تعریف، اور اسکی خصوصیات و متعلقات کا لکھنا جزو لاینفک سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہاں میں اس کو تحصیل حاصل سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ دیوان مذکور کے انطباع سے پہلے یا اسکے ساتھ ساتھ چند اربابِ نظر نے اپنے تبصرہ و نقد میں ان امور پر کافی روشنی ڈالدی ہے۔ نغمۂ دل کے ابتدائی اوراق میں (۷، ۵) صفحوں پر جناب نیازؔ مدیر "نگار" کا مقدمہ پھیلا ہوا ہے، پھر جناب عزیزؔ مرحوم لکھنوی کا تبصرہ مطبوع ہے۔ اس کے علاوہ دو ایک موقت الشیوع رسالوں میں "غزل گوئی پر ایک نظر" کے عنوان سے جناب اقبال احمد سہیلؔ ایم اے ایل ایل بی کا مضمون بھی نظر سے گزرا جس میں تمہید عمومی اور تنقید خصوصی کے بعد نغمۂ دل کے اشعار کا پسندیدہ انتخاب درج کیا گیا ہے؛

میں جناب نیاز کی طرح یہ لکھکر کہ "غضب خدا کا آپ سارا دیوان پڑھ ڈالئے اور کسی ایک جگہ بھی آپ کو وصل کا (مبارک) لفظ نہ ملے۔ تمام مجموعہ چھان ڈالئے کہیں بھولے سے اس (آرام جاں) تمنا کا ذکر نہ آئے۔ (جلّ جلالہٗ)" حضرت دل کو دیوتا نہ ٹھہراؤنگا کیونکہ بہ یک نظر نغمۂ دل میں یہ دونوں الفاظ دوچار ہوجاتے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۹ کا یہ شعر ؎

وصلِ شیریں کی تمنا دشمنِ جاں ہوگئی — خون جوئے شیر سے جاری ہوا فرہاد کا

اب رہی تمنائے آرامِ جاں، اسے خود جناب نیاز نے عنوانِ تعارف بناکر پسند فرمایا ہے یعنی:-

نہ وہ آرامِ جاں آیا نہ موت آئی شبِ وعدہ — اسی الجھن میں ہم اٹھ اٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں

البتہ جناب سہیل کی مندرجہ ذیل عبارت کو حرفاً حرفاً بطور تائید پیش کرونگا۔ کہ "حضرتِ دل کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدالِ ذوق ہے صفائی سلاست اور برجستگی کیساتھ کہیں کہیں لطیف فارسی ترکیبیں بھی آتی ہیں صحت زبان کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ خیالات نہ تو عامیانہ ہیں نہ اس قدر دقیق و عمیق کہ پتا نہ چل سکے؛ بلندی ہے مگر اسی حد تک کہ ہر شخص دیکھ سکے۔ اتنا اونچا اڑنا پسند نہیں کرتے کہ دوسروں کو دوربین لگانا پڑے"۔

ان سچے اور بے لاگ اظہارِ خیالات کے بعد صدیوں پہلے کے جمے ہوئے رنگِ تغزل کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے جس میں تنوعاتِ مضامین کے باوجود شعرا کا عام میلان اور مخصوص رجحان، کالماتِ غزل میں "گفتگو با زناں کردن" کے روزمرہ تک رہتا تھا۔ مضامین کی پیداوار، زمانہ و اہلِ زمانہ کے کردار سے وابستہ ہے۔ زمانہ آئینہ ہے اور اہلِ زمانہ اس کا عکس، آئینے میں وہی چیز نظر آئے گی۔ جو اس کے سامنے ہو گی۔ اس لئے ہر عکس کو اسی آئینے کے ساتھ دیکھنا چاہیئے جو بالمقابل موجود ہو۔

اب سے پچاس برس پہلے کا شاعر بلینک ورس اور سانیٹ قسم کی شاعری سے نا واقف محض تھا، ایسے اجنبی اسالیب بیان کا وجود اس کے کلام میں نہ ملے گا۔ نصف صدی پہلے کی گویائی اس کے زمانے کی موافقت کے ساتھ پذیرائی کے قابل ہے۔ اس عہد کے مضامینِ غزل چمن و صحرا، گل و بلبل، فرزانگی و دیوانگی۔ رندی و میخواری و غیرہم سے متعلق ہوتے تھے۔ جن کو فی زمانا بدمذاقی کا مترادف سمجھا جاتا ہے بایں ہمہ وہ اہلِ خبر اور اربابِ نظر جو اپنے فنی کمال اور فطری استعداد کی وجہ سے عصرِ حاضر میں بھی مقبولِ انام ہیں۔ قابلِ احترام ہیں، اور یہ احترام ان کی سنجیدہ مزاجی، متانتِ طبعی اور زمانہ کے سبب سے ہے۔ مضامین غزل میں عامیانہ خیالات و جذبات کے علاوہ فلسفہ و حکمت اور تصوف و روحانیت کے نکات اشارات شاعری کی وقعت کو بڑھاتے ہیں۔ اور اسکی عزت کو چار چاند لگاتے ہیں۔ تصوف و روحانیت کا مذاق انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک کم و بیش مسلمانوں میں موجود رہا۔ حضرتِ دل اُسی عہد کی یادگار ہیں اور یہ ان کی صحیح المذاقی اور بالغ نظری کا ثمرہ ہے۔ کہ انھوں نے اپنے کلام میں عریاں گوئی سے یکسر چشم پوشی کی۔ اور اکثر مجازی مضامین کو حقیقت کا لباس پہنایا۔ اسی معرفت نے ان کی شاعری کو سطحِ عام سے بلند کیا ہے۔ اور اسی حکمتِ بیان نے ایسی ساحری کو اعجاز و الہام کا مرتبہ بخشا۔ حضرتِ دل اس کامیابی کلام اور قبولیت عام پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تائیدِ کلام کے لئے نہیں بلکہ حجتِ تمام کیلئے ذیل میں چند ایسے اشعار نغمۂ دل سے انتخاباً لکھے جاتے ہیں۔ جن کو پڑھ کر خود اہلِ نظر دیکھ سکینگے کہ راقم مداحیٔ ممدوح کا حریص ہے یا واقعاتِ وقوعی کا حقیقت نویس۔

نہ کھلا راز کسی پہ دلِ سودائی کا عشق مرہونِ کرم ہے شبِ تنہائی کا
آج پیراہنِ ہستی بھی کیا نذرِ جنوں آخری تھا یہی ہدیہ ترے سودائی کا
دل بھی مٹ جاتا، تمنائیں اگر مٹنے کو تھیں! رہنے والا کون ہے کس کے لئے گھر رہ گیا
وہ حسنِ مطلق ہے جلوہ افگن بغور جس خوش ادا کو دیکھا عجیب قدرت کے ہیں کرشمے، جدھر نظر کی خدا کو دیکھا

اس مطلع میں لفظ بغور پر نظر کی جائے اور پھر میر تقی میر کے اس شعر کو پڑھا جائے ؎

سرسری تم جہان سے گزرے ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
مشاہدہ ہو تو کس طرح ہو بصارتِ ظاہری ہے عاجز گذر گیا جو خودی کی حد سے اُسی نے اس خودنما کو دیکھا
خبر نہیں انتہا کی ہم کو کیا ہے گم بے خودی نے اے دل قدم جو رکھا رہِ طلب میں تو دور تر راہنما کو دیکھا

آج ہی مٹنا تھا اے دل حسرتِ دیدار میں
تو مری ناکامیوں کے بعد کام آیا تو کیا

دیر سے کعبے میں پہنچا غیب سے آئی صدا
ٹھوکریں کھا کر سوئے بیت الحرام آیا تو کیا

جو مرجعِ عالم ہے، اسی در کی طلب ہے
کیوں بہشت نوردی کرے دیوانہ کسی کا

بہلا رہے ہیں اپنی طبیعت خزاں نصیب
دامن پہ کھینچ کھینچ کے نقشہ بہار کا

ہے جیتے جی تو ہم پر الزامِ سخت جانی
جب مر مٹیں تو کہنا کمبخت بے وفا تھا

ہے یہی شان، یہی جلوہ نمائی ان کی
طالبِ دید کی نظروں سے نہاں ہو جانا

وہ مرا جلوہ گہہ ناز میں انداز نظر
وہ ترا سامنے آتے ہی نہاں ہو جانا

پتھر کی جو مورت تھی، وہ راحت دل کی صورت تھی
کعبہ خدا کا گھر ہے مانا، دَیر تو ہم سے چھوٹ گیا

دل کے ٹکڑے دیکھ کے اے دِلؔ ہنس ہنس کر وہ کہتے ہیں
کس نے توڑا کیونکر ٹوٹا، توڑ دیا یا ٹوٹ گیا

گو رازِ حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا
ذرّوں میں کوئی ذرّہ بیکار نہیں ہوتا

ہر دیکھنے والے کی ہو جاتی ہیں بند آنکھیں
حیرت ہے نہیں پردہ درکار نہیں ہوتا

خمخانۂ ہستی میں ہر نشہ کی اک حد ہے
ساقی ترا متوالا ہشیار نہیں ہوتا

ہر عشوۂ ساقی ہے دلکش مری نظروں میں
گو تیر نہیں ہوتا، تلوار نہیں ہوتا

پامال شدہ ذرّے مقبولِ خلائق ہیں
مٹنا بھی ترے در پر بیکار نہیں ہوتا

اس شعر کا ماخذ اگرچہ یہ مشہور شعر ہے ؎ خاکساران جہاں را بحقارت منگر۔ توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد لیکن دیکھنا ہے کہ ایسے پامال مضمون کو دِلؔ کے اسلوبِ بیان نے کس قدر بلند کر دیا ہے۔ خصوصاً اس حقیقت کے اظہار و انشا کے بعد "مٹنا بھی ترے در پر بیکار نہیں ہوتا"۔ للّٰہِ درّ قائل۔ دو چار شعر اس غزل کے اور سنئے :۔

چند آبلہ پا وحشی کہتے ہوئے گذرے ہیں
کانٹا کوئی صحرا کا بے کار نہیں ہوتا

پردہ وہ اٹھائے ہیں اے شوقِ نظر ہمت!
ہر وقت نصیب اپنا بیدار نہیں ہوتا

جو مستِ حقیقت ہیں خم خانۂ الفت میں
ان کو کبھی پیمانہ درکار نہیں ہوتا

طینت میں ہے جب غفلت چونکے کوئی پھر کیونکر
سبزہ کبھی صحرا کا بیدار نہیں ہوتا

راحت طلبی میں ہے اندیشۂ ایذا بھی
پہلو کبھی پھولوں کا بے خار نہیں ہوتا

جینے کیلئے اے دِلؔ کس بل کی ضرورت ہے
دنیا سے مگر اٹھنا دشوار نہیں ہوتا

آئے دن مدِ نظر ہیں ان کو بزم آرائیاں
ہستیٔ عالم مٹا کر حشر برپا کر دیا

سمجھا ہوں اس کو منزلِ مقصود کی دلیل
دل ہے کسی کے نقشِ قدم پر مٹا ہوا

دیکھا تو سطحِ بحر کی حد میں حیات ہے قطرہ حباب بن کے جو اُبھرا فنا ہوا
چھا گئی حیرت جمالِ یار تھا یا برقِ طور جب نقاب اٹھی تو اک پردہ نیا حائل ہوا
حاصل ہے گو تقرّب پھر بھی یہ تفرقہ ہے کانٹا ہوں میں چمن میں تو پھول ہے چمن کا
خاک کے ذرّوں میں پنہاں عشق کا انجام تھا بے خبر اب تک حقیقت سے دلِ ناکام تھا
کیا سنائیں سرگزشتِ زندگیٔ پُر الم آشیاں اب تو قفس ہے اس سے پہلے دام تھا
پائمالِ عشق ہو کر یہ ہوا ثابت ہمیں خاک ہونا درحقیقت زندگی کا نام تھا
کثرتِ تنویر آخر بن گئی وجہِ حجاب پردہ اٹھنے پر بھی اک پردہ نظر آیا مجھے
دلِ مغموم! یہ بھی اک دلیل کامیابی ہے تری ناکامیوں کی داستاں مشہور ہو جائے
سمجھا نہ کوئی اسے دلِ اسرارِ فنا اب تک پہنچا وہ کہاں آخر گذرا ہے جو دنیا سے

یہ منتخب اشعار بادی النظر میں یاد نامعلوم ہونگے مگر ناظرین یقین فرمائیں کہ میں نے بہت سرسری انتخاب کیا ہے اور تنگیٔ وقت کیوجہ سے پورے دیوان پر نظر نہیں ڈالی ہے ورنہ کم سے کم ایسے دونے اشعار ان مضامین کے حامل منتخب ہوسکتے تھے جو فلسفۂ تصوّف اور حکمت و معرفت کا گنجینہ ہوتے، مزید طوالت کے خوف سے نثر نگاروں کی عام روش کے خلاف اشعار کو تشریح و تفصیل سے معرّیٰ رہنے دیا ہے اور وہ اس لئے کہ حضرت دل کی سخن آفرینیاں آشیانہ عنقا کی طرح فرضی و تخئیلی نہیں ہیں۔ بلکہ واقعی و تقلیبی ہیں، انکی معنی یابی کیلئے کسی کدو کاوش کی ضرورت نہیں، شعر و سخن کا معمولی مذاق رکھنے والے بھی بآسانی سمجھ سکینگے۔ اسلئے میں اس بیان کو تصوف کی حقیقت سمجھنے کیلئے شعر العجم (جلد چہارم) کی چند سطروں کے اقتباس پر ختم کرتا ہوں:۔ "فلسفہ جو شاعری میں آیا تصوّف کی راہ سے آیا، جب ہستیٔ مطلق وحدتِ وجود، فنا، لقا وغیرہ مسائل اسی تصوف کی بدولت آشنا ہوئے تو چونکہ دلچسپ مسائل تھے عام طبیعتوں کو ہمیں مزہ آتا تھا لیکن ہر شخص صاحب حال نہیں ہوسکتا تھا۔ اسلئے جو لوگ مکاشفہ اور حال کے زبان آموز نہ تھے فلسفے کا سہارا پکڑتے اور اسی کے سکھائے ہوئے الفاظ بولتے تھے۔ یہ تے بڑھتے بڑھتے پورا فلسفہ زبان میں آگیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تصوّف کا اصلی مقام عشق و محبت ہے، اس عالم میں دشمن اور دوست کی تمیز اٹھ جاتی ہے ہر چیز میں اسی کا جلوہ نظر آتا ہے ہر چیز سے محبت کی بو آتی ہے ہر چیز کیطرف دل کھنچتا ہے۔ تمام عالم ایک معشوق بن کر نظر آتا ہے۔ اور دنیا کی مکروہات اور مخالف چیزیں معشوق کی دلفریب ادائیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کا اخلاق پر عمدہ اثر پڑا فقہا اور علمائے ظاہر نے اختلافِ خیالات کی بنا پر جو دشمنی پھیلائی تھی اور جسکی بدولت نہ صرف غیر اہلِ مذاہب بلکہ خود اسلامی فرقوں میں ایک ابدی جنگ قائم ہوگئی تھی وہ حالت بدلگئی، عام محبت اور ہمدردی کے خیالات پھیل گئے اور یہ تعلیم ہونے لگی ؎

درحیرتم کہ دشمنیٔ کفر و دیں چراست از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است"

خلاصۂ کلام یہ کہ راقم الحروف نے حضرتِ دل کا دیوان اسی نظر سے دیکھا ہے اور اسی نقطۂ نگاہ سے وہ اشعار انتخاب کئے ہیں جن کی خوبی سے یقیناً کسی کو انکار نہیں ہوسکتا ؎ زینِ عشق بہ کونین صلح کل کردم تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

(احسن مارہروی)

نغمۂ دل پر تبصرہ

(از مرزا احسان احمد صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

یہ مجموعہ کلام شاہجہان پور کے مشہور اہلِ سخن جناب دلؔ کی تراوشِ قلم کا نتیجہ ہے۔ کتاب کی ابتداء جناب نیاز فتحپوری کے ایک مبسوط مقدمہ سے ہوتی ہے۔ جو ضرورت سے زیادہ طویل ہے۔ اس کے بعد جناب عزیز لکھنوی کا ایک تبصرہ ہے۔ جو اُسی قدر مختصر ہے۔ پھر غزلیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اور آخر میں چند متفرق اشعار۔ رباعیات۔ مخمس ہیں۔ غزلیات کی ترتیب افسوس ہے۔ کہ اسی طرزِ قدیم پر یعنی ردیف وار رکھی گئی ہے۔ اس ترتیب میں ایک بڑا نقص یہ ہے۔ کہ شاعر کے مدارج کلام کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یعنی ابتدا میں کلام کا کیا انداز تھا۔ اور رفتہ رفتہ اس میں کیا ترقیاں اور تبدیلیاں ہوئیں۔ لائق مصنف نے قدیم اور جدید کا فرق دکھانے کی غرض سے۔ ق۔ اور۔ ج۔ لکھ دیا ہے۔ لیکن اس سے بہتر طریقہ یہ تھا۔ کہ شروع میں قدیم کلام بالحاظ ردیف درج کر دیا جاتا۔ اس کے بعد جدید غزلیں یکجا جمع کر دی جائیں۔ اور غزلوں کی ترتیب زمانہ کے لحاظ سے رکھی جاتی اس طور پر کلام کے ارتقاء تدریجی کا اندازہ آسانی سے ہو سکتا تھا۔ علاوہ اس کے اگر ضخیم دواوین کلیات کے بجائے منتخب کلام کے مختصر مجموعہ شائع کئے جائیں۔ تو یہ زیادہ مفید اور بہتر ہوگا۔ شاعر کا یہ کمال نہیں ہے۔ کہ اس نے کتنا کہا بلکہ کیا کہا اور کیسا کہا اور نہ یہ ضروری ہے۔ کہ اس نے جو کچھ بھی کہا وہ سب شائع کر دیا جائے۔ افسوس ہے کہ لائق مصنف نے انتخاب سے کام نہیں لیا۔ ورنہ ان کے کلام کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ اگرچہ فرصت کی کمی کی وجہ سے ادبی مشاغل کا سلسلہ ایک مدت سے بند ہے تاہم یہ سخت ناانصافی ہوگی۔ اگر اس قسم کے قابل قدر کلام سے اعتنا نہ کیا جائے۔ موجودہ حالات میں تفصیلی تبصرہ کی گنجائش نہیں البتہ دیوان کے سرسری مطالعہ سے جناب دلؔ کی خصوصیات کلام کے متعلق جس حد تک اندازہ کر سکا اس کو مختصر حوالہ قلم کرتا ہوں۔

جناب دلؔ کا خاص صحیفۂ سخن غزل ہے۔ عام طور پر غزل گوئی نہایت آسان چیز سمجھی جاتی ہے۔ اگر صرف زلف و کمر۔ خط و خال۔ ناز و ادا وغیرہ کی مصوری کا نام غزل ہے۔ تو بے شبہ ہر بوالہوس بجا طور پر غزل گوئی کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ اس سے زیادہ نازک اور مشکل اور کوئی صنفِ سخن نہیں۔ ہر شخص عشق و محبت کی نزاکتوں کا اندازشناس نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ذوقِ صحیح اور فطرتِ سلیم کی ضرورت ہے۔ جو ہر انسان کا حصہ نہیں اس بنا پر ایک غزل گو شاعر کے کلام میں سب سے پہلے جس چیز کو میری نگاہ ڈھونڈھتی ہے وہ یہ ہے۔ کہ شاعر نے اپنے آئینہ محبت کو کس حد تک ابتذال کی گرد سے پاک و صاف رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس نے جس ہستی کو اپنا

مجبوب نظر بنایا ہے۔ اُس کی حیثیت صرف ایک بازاری فتنہ گری کی ہے۔ یا اس میں کچھ لطیف محاسن بھی ہیں۔ ماحول سے متاثر ہونا تقاضائے فطرت ہے۔ جناب دلؔ نے آنکھیں کھولیں تو ملک پر امیر مینائی کا رنگ چھایا ہُوا تھا۔ زانوئے تلمذ بھی جناب دلؔ نے اُنہیں کے سامنے تہ کیا۔ لیکن چونکہ قدرت کی طرف سے طبعِ سلیم عطا ہوئی تھی اس لئے ان کے کلام میں وہ ابتذال نظر نہیں آتا جو عام طور پر لکھنؤ کا انداز ہے۔ تاہم لکھنویت کا اثر بہت کچھ نمایاں ہے

نیاز صاحب ایک جگہ مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"غضب خدا کا آپ سارا دیوان پڑھ ڈالئے اور کسی ایک جگہ بھی آپ کو وصل کا مُبارک لفظ نہ ملے تمام مجموعہ چھان ڈالئے کہیں بھُولے سے بھی اُس (آرامِ جان) کی تمنا کا ذکر نہ آئے"

مجھ کو جناب دلؔ کی متانت اور سنجیدگی سے انکار نہیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس دعوے کا مقصد کیا ہے۔ کیا اس کا یہ منشا ہے کہ جناب دلؔ کا کلام لکھنویت سے بالکل پاک ہے۔ لکھنویت صرف وصل کا نام نہیں۔ جو مضامین عام طور پر لکھنؤ کے غزل گو شعراء کے سرمایہ خیال ہیں۔ مثلاً شمعِ تربت۔ چراغِ مزار۔ تُربتِ عشاق گریہ و زاری۔ ناز و ادا۔ کوچۂ قاتل۔ گورِ غریباں وغیرہ ان کی جھلک جناب دلؔ کے کلام میں بھی نظر آتی ہے۔ اور یہ اثر زیادہ تر ان کی قدیم غزلوں میں محسوس ہو ملتا ہے۔ مثلاً:۔

دلِ صد چاک میں دیکھا رُخِ روشن ان کا ہم نے نظارہ کیا ڈال کے چلمن اُن کا
اور آشفتہ تہِ خاک کرے گا ہم کو بال کھولے ہوئے آنا سرِ مدفن اُن کا

ہاتھ دل پر رکھ کے یہ کہنا کسی کا یاد ہے اب اسے اپنا نہ کہنا یہ ہمارا ہو گیا
جوڑا چھا ہے مری تقدیر اُن کی زُلف کا یہ بھی بل کھائی ہوئی ہے وہ بھی بل کھائی ہوئی
چھُری رکھ کر گلے پر کاش قاتل آفریں کہتا ہمارے ذبح کرنے کے لئے تکبیر ہو جاتی
ترا کوچہ ہے یا دارالشفا اے غیرتِ عیسٰی ادھر بیمار بیٹھے ہیں اُدھر بیمار بیٹھے ہیں
کھینچو چھُری نقاب الٹ کر عتاب میں چین جبین کو چین نہیں ہے حجاب میں
وقتِ خود بینی نہ دیکھیں آپ تن کر آئینہ ہر ادائے حسن پر کھینچے گا خنجر آئینہ

اس قسم کے اور بھی اشعار ہیں جن کو طوالت کے لحاظ سے ہم قلم انداز کرتے ہیں۔ لیکن دو شعر اور ملاحظہ ہوں

ہوا اُسکی گھٹا چھائی چمن میں پھر بہار آئی تمنا ہے کہ وہ گل پیرہن پہلو نشین ہوتا
یہ بھیگی رات یہ ٹھنڈا سماں یہ کیفِ بہار یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اُٹھ کے جانے کا

کیا نیاز صاحب اب بھی اپنے دعوے پر قائم ہیں۔ کیا پہلے شعر میں اُس (آرامِ جان) کی تمنا کا ذکر نہیں ہے

دوسرے شعر کا مصرع ثانی اگر وصل نہیں تو پھر کس کیفیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

ان مثالوں سے صرف یہ دیکھنا مقصود ہے۔ کہ جناب دلؔ کا کلام لکھنویت سے بالکل محفوظ نہیں ہے اور یہ استاد کے فیضِ صحبت کا لازمی نتیجہ تھا۔ لیکن چونکہ فطرت متین اور ذوق آشنا تھی اس لئے جناب دلؔ اس عام میں عام لکھنوی شعرا کی طرح بالکل برہنہ نظر نہیں آتے۔ اور کہیں کہیں اسی قدیم ذخیرہ سخن میں ذوقِ سلیم کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے جس نے آئندہ چل کر ان کے آئینہ کلام کو لکھنویت کی آلایش سے اس حد تک صاف کر دیا کہ پڑھنے والے کو یہ کبھی یقین نہیں آسکتا کہ یہ لکھنؤ کے کسی صحبت یافتہ کا کلام ہے قدیم غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہی مستِ حقیقی ہے جو ہیم بزم ساقی میں — شکستِ شیشۂ دل کی صدا پر وجد کرتا ہو
بڑا ہی دل نشیں والے خود بخود جوشِ محبت میں — سرِ پر ناز پر یوں حسنِ دلکش جلوہ آرا ہو
دلیلِ عشقِ صادق سوزِ پنہاں ہو نہیں سکتا — جلے جو شمع کی لَو میں اُسے پروانہ کہتے ہیں
ذوقِ جانبازی میں یہ احساس تک باقی نہیں — دل میں پیکاں رہ گیا یا دل کو پیکاں لے چلا
خاموش دلِ زار تہِ خنجرِ قاتل — شکووں کا ہے یہ وقت کہ تسلیم و رضا کا
گو نظر فنا ہو گئی پروانوں کی ہستی — روشن ہے مگر نام شہیدانِ وفا کا

اس قسم کے اور بھی اشعار ہیں۔ جن سے جناب دلؔ کی سلامتِ مذاق کا کافی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے ہم کو جناب دلؔ کے کلام میں ایک خاص کمی محسوس ہوتی ہے۔ یعنی رقص و سرود اور جوش و مستی کا عنصر بہت کم نظر آتا ہے۔ جو عشق کی اصلی امتیازی خصوصیت ہے۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں۔

حسرت کا ہے نمونہ رنگِ تغزل اپنا — ہم انتہائے غم کی تصویر کھینچتے ہیں

اگرچہ فطری متانت اس موقع پر بھی قایم رہتی ہے۔ یعنی عام لکھنوی شعرا کی طرح جناب دلؔ علانیہ سینہ کوبی اور نوحہ گری کی حد تک نہیں پہنچتے۔ تاہم انہوں نے غم کی جو تصویر کھینچی ہے۔ وہ لکھنویت کے اثر سے بالکل محفوظ نہیں ہے۔ اس کا اندازہ مثالوں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

شبِ غم کی مصیبت بھی قیامت کی مصیبت تھی — یہ عالم تھا کہ اب نکلا مگر نکلا نہ دم میرا
جگہ پھر کیوں نہ دوں لے جوشِ گریہ تجھکو آنکھوں میں — شبِ ہجراں بس اک تو ہے شریکِ رنجِ غم میرا
عشق کا انجام حسرتناک ہے اے اہلِ دل — مٹ گئی ہر آرزو اک نقش دل پر رہ گیا
دل بھی مٹ جاتا تمنائیں اگر مٹنے کو تھیں — رہنے والا کون ہے کس کیلئے گھر رہ گیا
مصیبت در مصیبت میں ہوں ضبطِ غم سے اے ہمدم — ٹپکتا ہے مرے ہر زخم دل سے نوحہ گر ہونا
غمِ پیہم سے گھبرا کر گریبان چاک کرتے ہیں — اسی کو ہم سمجھتے ہیں شبِ غم میں سحر ہونا

مُبارک ہو تجھے او ناشناسِ شانِ خودداری مری بزمِ عزا میں بیٹھ کر اب نوحہ گر ہونا
سینہ شق ہے رنگ فق دل مضطرب چشم اشکبار ایک ضبطِ آہ سے افسوس کیا کیا ہو گیا
عشق میں ایسی ٹھوکر کھائی اُس کا شیشہ ٹوٹ گیا روز نئے دُکھ سہنے سے اے ہمدم اب جی چھوٹ گیا
اس گریۂ پیہم کی وہ ساعتِ آخر ہے جس وقت مرادامن آنکھوں سے جُدا ہوگا
کٹ تک شبِ غم کوئی بدلتا رہے پہلو تسکین کی صورت نہ اِدھر ہے نہ اُدھر ہے
کافی ہے مرمٹوں کے لئے داغِ بیکسی روشن رہے یہ شمع ہمارے مزار پر
زینتِ دل ہیں نہ ارمان نہ شوقِ اُمیدِ گھر ہے اُجڑا ہُوا اس میں کوئی ساکن بھی نہیں
کسی کے ہجر میں ہم یوں بحالِ زار بیٹھے ہیں کہ چہرہ زرد ہے لب خشک ہیں رخسار بیٹھے ہیں
جوشِ نشاط کیا دل سرد ہو رہے ہیں عبرت کا ہے نمونہ افسردگی ہماری

اس قسم کے اور اشعار بکثرت موجود ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جناب دِل کی طبیعت پر یاس و حسرت کا رنگ زیادہ غالب ہے۔ لیکن اتنا غنیمت ہے کہ ماتم سرایان لکھنؤ کی طرح جنازہ بر دوش نظر نہیں آتے۔ بلکہ اکثر دردِ عشق کی بلند اور پاکیزہ اداؤں کی جھلک ان کے کلام میں محسوس ہوتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

نشترِ غم اہل ہوس کے لئے پیام مصیبت ہے۔ لیکن جنابِ دِل کیلئے اسکی خلش رُوح کی تازگی کا سرچشمہ ہے۔

رُوح تازہ ہوگئی اللہ رے ذوقِ خلش دِل کا ٹکڑا بن گیا دِل میں جو نشتر رہ گیا

عشق صرف ایک سطحی اور عامیانہ جذبہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک رازِ عمیق ہے جس کا اندازہ مشکل ہے۔

بارہا ڈوب کے اُبھرا مرے دِل کا نشتر راز پھر بھی نہ کھلا عشق کی گہرائی کا

نشہ عشق پیمانہ و ساغر کا محتاج نہیں ہے۔

جو مست حقیقی ہیں خمخانۂ اُلفت میں اُن کو کبھی پیمانہ درکار نہیں ہوتا

عشق کی اصلی شان خاک ہونے پر جلوہ گر ہوتی ہے۔

خاک ہو جانا نمودِ عشق ہے اے اہلِ دِل جل گیا پروانہ لیکن رنگِ محفل بن گیا

محبوب کے فیضِ نگاہ کا خیر مقدم ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

اے نگاہِ روح پرور آفریں صد آفریں جانِ بسمل بن گیا وہ درد پیدا کر دیا

کاش یہ صدائے آفریں کبھی ماتم کدہ لکھنؤ سے بلند ہوتی۔

عشق کا تقاضا گریہ و بکا نہیں بلکہ پرسکوت سوز و گداز ہے۔

صورتِ شمع جل خموشی سے ہے تقاضائے عشق سوز و گداز

ارباب ہوس تسکین و راحت کے طلبگار رہتے ہیں۔ لیکن ایک نکتہ دانِ محبت اس رمز سے واقف ہے کہ دراصل اضطراب ہی زندگی کی رُوح ہے۔

درحقیقت مضطربِ دل کے لئے وہ موت تھی اصطلاحِ عام میں تسکین جس کا نام تھا

عشق حقیقی جوش کا طالب ہے صرف زبانی شور و غل بے سُود ہے۔

مثالِ نعرۂ منصور جوشش پیدا کر عبث ہے شورِ انا الحق جو حکم دار نہ ہو

عاشق میں استعداد و صلاحیت ہے تو معشوق کی نظر خود بخود اُٹھ جاتی ہے۔ تقاضا پاس ادب کے خلاف ہے۔

اُن کی نظر کبھی تو اُٹھے گی پئے کرم حسنِ طلب یہی ہے تقاضا نہ کیجئے

عشق میں ناکامیوں سے گھبرانا نہ چاہیئے۔

راہِ طلب میں ٹھوکریں کھانیکے بعد بھی کہتا ہے عشق ترک تمنا نہ کیجئے

ذوقِ نیاز عشق کی فطرت ہے اس لئے اس کو دوست کی بے اعتنائی کا گلہ مند نہ ہونا چاہیئے

سنگِ درِ حبیب کو حسن نہ سہی قبول کی فرق نہ آئے اے جبین حوصلۂ نیاز میں

آہ و فریاد عشق کی رسوائی کا نشان ہے۔

آہ سینے میں گھٹے اُف نہ زباں سے نکلے درد اس حد سے گذر جائے تو رسوائی ہے

دردِ دل کا انیس اور پریشانیٔ دل کی تسکین کا سرمایہ ہے۔

درد کی شان یہی ہے کہ رہے مونسِ دل دل کی تسکین بھی ہے کہ پریشان ہو جائے

عاشق کو جان دینا چاہیئے لیکن بستر پر کروٹیں بدل کر نہیں بلکہ اِس طرح کہ محبت کا نام روشن ہو جائے

کوچۂ یار میں مٹنا مگر اک شان کے ساتھ خاک ہونا تو محبت کا نشان ہو جانا

عاشق کی اصلی زندگی راہِ وفا میں اپنے کو قربان کر دینا ہے۔

ہر ذرہ خاکِ دل کا اک رُوحِ منتقل ہے مٹنا راہِ وفا میں ہے زندگی ہماری

اہلِ ہوس کے معشوق کی منزل لبِ بام سے آگے نہیں بڑھتی۔ لیکن جناب دل کے محبوبِ نظر کا مقام لبِ بام کیا عرشِ بریں سے بھی بلند تر ہے۔

کہئے تو کمند دل عرشِ بریں کو مقام دوست ہمت مگر کچھ اور ہے اپنے خیال کی

عام شعرا معشوق سے جس بیباکانہ طریقہ پر اپنی تمناؤں اور خواہشوں کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ محتاجِ بیان نہیں لیکن جناب دل کی آرزو اس قدر نازک اور لطیف ہے۔ کہ نگاہِ شوق بھی اس کو ادا نہیں کر سکتی۔

نگاہِ شوق رہی ہم زبانِ دل لیکن کسی طرح نہ بنا شرحِ آرزو کرتے

عاشق کی حقیقی شمعِ راہ صرف اس کے دِل کی آشفتگی اور ذوقِ جنون کی سرمستی ہے۔ جو بلا کسی ہمدم یا رہبر کی امانت کے عشق کی تمام دشواریوں کو آسان بنا دیتی ہے۔

ہمدم کی نہیں حاجت رہبر کی نہیں پروا　　آشفتگیِ دِل ہے آگے ترے وحشی کے

افسوس ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے ہم کو صرف انہیں چند مثالوں پر قناعت کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اِن مثالوں سے کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے۔ کہ جناب وِلؔ صرف بُتِ بیدرد اور قاتلِ نخوت پسند کی فسوں سازیوں کے اسیرِ دام نہیں ہیں۔ بلکہ عشق و محبت کی لطیف آداؤں کے بھی محرم راز ہیں۔ ان مثالوں سے اُن کے کلام کی اخلاقی اور روحانی بلندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یعنی اُن کا عشق ہوس پرست شعراء کا عشق نہیں جو بُزدلی۔ پست خیالی کم ہمتی۔ بے غیرتی اور نفس پرستی کی مجسم تصویر ہوتا ہے۔ بلکہ وہ عشق ہے جس کی فطرت صدق و وفا ہے۔ خلوص و ایثار جس کی سرشت ہے۔ جو ضبط و استقلال کا مجسمہ ہے۔ جو موت کو زندگی سمجھتا ہے۔ جو خود دار۔ جانباز اور سرفروش ہے۔ جو شجاعت و تہوّر کا درس آموز ہے۔ جو تسلیم و رضا کا لذت شناس ہے۔ جو سراپا ذوقِ شہادت سے لبریز ہے۔ جو ناکامیوں کی ٹھوکریں کھا کر بھی سرشارِ آرزو رہتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ناکامیوں کے بعد بھی چھوٹا نہ ہاتھ سے　　کیا جانے کس خیال سے دامانِ آرزو
خود شعلۂ فنا سے ہم آغوش ہو گئے　　بزمِ وفا میں آج شہیدانِ آرزو

اس کا نام محبت کی بیتابی ہے۔

آسان نہیں مشاہدۂ حسنِ جان گداز　　اس انجمن میں ہمتِ پروانہ چاہیئے

یعنی عشق بازی ہر بوالہوس کا کام نہیں اس کے لئے صبر و ہمت اور ایثارِ نفس کی ضرورت ہے۔

وہ کیا گھبرائے اے ہمدم خرامِ حشر پرور سے　　کہ جس کے شیشۂ دل کی ہے زینت چُور ہو جانا

عشق اسی بلند حوصلگی کا طالب ہے۔

حسن کی عالم فریبی گو بہت مشہور ہے　　ہم مگر ایمان لائے رُوئے جاناں دیکھ کر

یہی وہ روئے جاناں ہے۔ جو دراصل اربابِ ذوق و نظر کی پرستش کا مستحق ہے۔ وہ حسن کیا جو عاشق کے روحانی احساسات کو منور نہ کر دے۔ اور وہ عشق کیا جس میں اتنی بھی لطافت و صلاحیت و استعداد نہ ہو۔

کاش ان کی رہگذر میں پیوندِ خاک ہوتے　　کچھ زندگی نہیں ہے یہ زندگی ہماری

عشق اسی جذبۂ فنا اور ذوقِ ایثار کا متمنی ہے۔ نہ کہ بستر پر کراہنے اور رونے اور چلانے کا۔

امثال مذکورہ بالا سے جناب وِلؔ کے کلام کی معنوی عظمت۔ پاکیزگی اور بلندی کا اب تم بخوبی اندازہ کر سکتے [illegible]

اس وقت ان کے کلام کی خوبیاں اور زیادہ روشن ہوکر سامنے آجاتیں۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ اس قسم کے تفصیلی موازنہ کے لئے ہمارے پاس کافی وقت نہیں ہم کو صرف اس موقعہ پر یہ ظاہر کر دینا ہے۔ کہ جہاں تک عشق و محبت کے اخلاقی پہلو کی پاکیزگی اور خیالات کی شائستگی کا تعلق ہے۔ جناب دلِ اپنے عام معاصرین میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

ممکن ہے کہ ایک نکتہ سنج نگاہ کو جناب دل کے آئینہ سخن میں دقیق مسائل اور حکیمانہ اسرار کے جلوے نظر آئیں لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا۔ کہ قدرت نے ان کو ایک ذوق آشنا قلب عطا کیا ہے۔ چنانچہ اکثر ان کے اشعار میں بادۂ تصوف کی مستی نظر آتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ جلوتِ سرودی کائنات کے ہر ذرہ میں ترنم ریز ہے۔ اس کے لئے کسی مقام کی تخصیص نہیں صرف گوش دل کے وا ہونے کی ضرورت ہے۔

گوشِ دل کے لئے کچھ طور کی تخصیص نہیں — ہر جگہ ہم تری آواز سنا کرتے ہیں

کثرتِ نور بھی مانع نظارہ ہوتی ہے۔

کثرتِ تنویر آخر بن گئی وجہ حجاب — پردہ اُٹھنے پر بھی اک پردہ نظر آیا مجھے

رازِ عشق کی لطافت عوام کے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ اس لئے اس کا اعلان غلطی اور خلافِ مصلحت ہے۔

حق تو یہ ہے کہ خطا تم سے ہوئی اے منصور — تھیں چھپانیکی جو باتیں وہ بآواز کہیں

گو جمالِ حقیقت نگاہوں سے مخفی ہے۔ تاہم کائنات کا کوئی ذرہ بیکار نہیں ہوتا۔

گو رازِ حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا — ذرّوں میں کوئی ذرّہ بیکار نہیں ہوتا۔

جمالِ حقیقی کے بندۂ عقیدت کو دشت و صحرا کی خاک چھاننے کی ضرورت نہیں۔

جو مرجع عالم ہے اسی دَر کی طلب ہے — کیوں دشت نوردی کرے دیوانہ کسی کا

انسان کی حقیقت ترکیب عناصر سے بلند تر ہے۔

گم اپنی حقیقت ہے ترکیب عناصر میں — یہ پیرہن ہستی پردہ نظر آتا ہے

عشق جس قدر جلوۂ حسن سے قریب ہوتا جاتا ہے۔ اُسی قدر اُس کی بیخودی اور وارفتگی بڑھتی جاتی ہے۔ اور جس قدر بیخودی بڑھتی ہے۔ اسی قدر در اصل دوری ہوتی جاتی ہے۔ کیونکہ بیخودی کے عالم میں احساس قرب قائم نہیں رہ سکتا۔

محوِ جمال بےخود و مخمور ہو گئے — یعنی قریب ہوکے بہت دُور ہو گئے

پرستارانِ حقیقت کفر و ایمان کی باہمی جنگ آرائیوں سے ہمیشہ بےتعلق رہتے ہیں۔

دُنیائے حقیقت میں آزادِ تعین ہیں — ہم نے کبھی ٹکرایا کعبہ سے نہ بُت خانہ

ایک پوری غزل اسی رنگ میں ڈوبی ہوتی ہے۔

وہ حسن مطلق ہے جلوہ افگن بغور حسن خوش ادا کو دیکھا
عجیب قدرت کے ہیں کرشمہ جدھر نظر کی خدا کو دیکھا

جو ڈوب کر پھر کبھی نہ ابھرا ہوا وہی آشنائے ساحل
بقاءِ دائم کا اِک مرقعہ غریق بحر فنا کو دیکھا

اسی کا نقشہ جما ہوا ہے اسی کی اب لو لگی ہوئی ہے
نظر میں عالم تھا بے حقیقت جب اُس وفا آشنا کو دیکھا

مشاہدہ ہو تو کس طرح ہو بصارتِ ظاہری ہے عاجز
گذر گیا جو خودی کی حد سے اسی نے اس خود نما کو دیکھا

خبر نہیں انتہا کی ہم کو کیا ہے گم بیخودی نے اے دل
قدم جو رکھا رہ طلب میں تو دور تک رہنما کو دیکھا

اِن مثالوں کے بعد جناب دل کے جذبہ عشق کی لطافت اور حقیقت شناسی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔
جناب دل کی پاکیزہ خیالی تم نے دیکھ لی۔ اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ اُن کے احساس کا کیا عالم ہے۔ یعنی ان میں تڑپنے اور تڑپانے کی قابلیت کس حد تک ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں محض لفظی طلسم آرائی ہے۔ یا اس میں کچھ اثر بھی ہے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک یہی چیز تغزل کی حقیقی رُوح ہے۔ بغیر اس کے ایک غزل گو شاعر کے تمام تخیلات بیکار ہیں۔ بدقسمتی سے لکھنؤ کی بدولت سوز و گداز کا مفہوم گریہ و بکا سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ سوز و گداز کو دراصل سینہ کوبی اور فریاد و ماتم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ صرف رُوح کی ایک لطیف دردمندانہ کیفیت کا نام ہے جس سے شاعر کا کلام عام طور پر لبریز ہوتا ہے۔ اِس حیثیت سے جناب دل اپنے عام معاصرین سے علانیہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ یعنی ان کا کلام صرف ضعف بے حسی اور موت کا افسانہ نہیں ہے۔ بلکہ اپنے اندر احساس کی کافی گرمی اور زندگی کی رُوح رکھتا ہے۔ اس کا اندازہ اشعار مذکورہ بالا سے بھی ایک حد تک ہو سکتا ہے۔ اس موقعہ پر چند اشعار اور ملاحظہ ہوں۔

یہی ہیں سوزِ دلِ عندلیب کے معنی
قفس تو پھونک دیا چمن پر نہیں نہ سہی

یہی وہ ایثار کا شریفانہ احساس ہے جس میں رُوح انسانی کی حقیقی عظمت کا راز پنہاں ہے۔

یہ قفس کیا قفسِ تن کے بھی ٹکڑے اُڑ جائیں
ہم سے اتنا کوئی کہہ دے کہ بہار آئی ہے

احساس کی شدت اور وارفتگی کی کتنی صحیح تصویر ہے۔
موت کے ساتھ اہلِ ہوس کی دُنیائے محبت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن ایک ذوق آشنا اور دردمند رُوح کی سعی طلب کا آغاز فنا سے ہوتا ہے۔

مٹا کے ہستیٔ دل صرف مدعا کرتے
یہیں سے سعی طلب کی ہم ابتدا کرتے

صحرائے محبت کا ہر ذرہ تسکین و راحت کا مرکز ہے۔ اس لئے ایک لذت شناس دیوانگی کا دل منزل کی تلاش و حسرت سے بے نیاز ہوتا ہے۔

جو ذرۂ صحرا ہے وہ ہے محرکِ تسکیں   پابندِ جنوں حسرتِ منزل نہیں رکھتا

عشق اپنے اندر خود ایک مستقل مستی اور زندگی کی روح رکھتا ہے۔ اسکو شراب و ساقی کی ضرورت نہیں۔

رہیں گے مست ہمیشہ شراب ہو کہ نہ ہو   ملے تو ہمت ساقی اگر نہیں نہ سہی

نشترِ عشق کی کاوش تو اہلِ ہوس کے۔ لئے ہمیشہ ایک مستقل مصیبت اور اذیت کا سامان ہے لیکن صاحبِ ذوق کے لئے بالآخر سرمایۂ راحت بن جاتی ہے۔

کاوشِ پیہم بالآخر ہو گئی لطف آفریں   اب وہ نشتر راحتِ دل ہے جو خوں آشام تھا

پردۂ حسن اُٹھتا ہے پھر بھی طالبِ جمال محرومِ نظارہ ہے۔ کیونکہ وہ اس حد تک جوشِ تمنا سے مست اور سرشار ہو جاتا ہے کہ اس کا احساسِ نظر جاتا رہتا ہے۔

گو پردہ اُٹھا پھر بھی حیراں ہوں کہ کیسے دیکھوں   احساسِ نظر گم ہے اب جوشِ تمنا سے

ذوقِ جنون کی شدت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

ہم شستِ جنوں میں یوں خاک اُڑا رہے ہیں   صحرا پہ چھا گئی ہے آشفتگی ہماری

یہ بالکل مبالغہ نہیں ہے ہمارے نزدیک اگر احساسِ محبت میں اتنی بھی شورشِ مستانہ نہ ہو تو وہ عشق کس کام کا اب ہم چند اور اشعار بلا کسی تشریح کے نقل کر دیتے ہیں۔ جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جناب دل اپنے پہلو میں ایک زندہ اور بیدار دل رکھتے ہیں۔ اور ایک غزل گو شاعر کے لئے سب سے مقدم چیز بھی ہے ؎

ہم مستِ عشق ہیں ہمیں ساغر سے کیا غرض   ساقی کی چشمِ مست ہماری نظر میں ہے
ہے نقش ذرہ ذرہ پہ جوشِ سرِ نیاز   کون آج سجدہ ریز تری رہگذر میں ہے
اُٹھے تو محوِ تمنا ملے تو غرقِ نیاز   نگاہِ شوق کو فکرِ مآلِ کار نہ ہو
وہ خدنگِ روح پرور ہے جگر و دل جو اے دلؔ   مجھے اضطراب کیوں ہو مجھے انتشار کیوں ہو
نظارہ سوزِ شمعِ تجلی سہی مگر   تقلید گرمجوشیٔ پروانہ چاہیے
ریاضِ دہر میں ہر شاخِ گل سے لطف اُٹھا   یہ شکل ساعدِ ساقی کی ہے وہ ساغر کی
اُٹھے نگاہ ڈھلے بادۂ نشاط افزا   کہ آرزو ہے اسی کیفِ روح پرور کی
تڑپ تڑپ کے یہ کہتے ہیں کشتگانِ نگاہ   سکونِ قلب ہے جنبش کسی کے خنجر کی
مٹنے پہ بھی ہے دل کا وہ عالم کہ الاماں   دنیا ہر ایک ذرہ میں آباد ہو گئی
دل تھا وہ دلؔ جو خاک ہوا راہِ عشق میں   اکسیر تھی وہ خاک جو برباد ہو گئی
دامانِ دل میں جوشِ تمنا لئے ہوئے   آیا ہوں اک تلاطمِ دریا لئے ہوئے

آئی بہار حاصلِ دُنیا لئے ہوئے　　ہر شاخ و گل ہے ساغر و مینا لئے ہوئے
ابتک تھیں جوشِ عشق کی ہنگامہ خیزیاں　　اُٹھا غبارِ قیس تو صحرا لئے ہوئے
ہر اشکِ خوں کو دیکھ رہا ہُوں محیطِ غم　　قطرے مری نظر میں ہیں دریا لئے ہوئے

ان اشعار کو پڑھو۔ کیا یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ایک زندہ اور کیف آشنا روح آتش فشانی کر رہی ہے۔ ایک صحیح المذاق غزل گو شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ بارگاہِ حسن کا ادب شناس ہو۔ اور اپنی ہستی کو رضائے محبوب پر وقف کر دے۔ اس کو انتہائی جوشِ دیوانگی کے عالم میں بھی یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اسکی حیثیت صرف ایک طالب کی ہے۔ جس کا کام صرف نیاز و عقیدت ہے۔ جناب دلؔ کے کلام میں یہ جذبہ خاص طور پر محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

راہِ طلب میں جوشِ عقیدت کی شرط ہے　　ہو سجدۂ نیاز ہم آغوشِ نقشِ پا

ایک دُوسری جگہ اس شریفانہ جذبہ کو "یعنی ظلم و ستم تو حسن کی عادت ہے لیکن عشق کا فرض یہی ہے۔ کہ رشتۂ وفا ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے" اس طرح ادا کرتے ہیں۔

ہر تمنا امتحانِ عشق میں ہو صرفِ جور　　اے وفائے دل یہ تیرا فرض ہے وہ خوئے دوست

حسن کی محشر خرامیوں کے سامنے جناب دلؔ کے نیازِ عشق کی یہ شان ہے۔

انہیں اس شان سے چلنا کہ اک ہنگامہ برپا ہو　　ہمیں ہر گام پر اے ہم نفس آنکھیں بچھا دینا

اس سے زیادہ اور کیا عقیدت کا جوش ہو سکتا ہے۔ لیکن نہیں آپ کا جوشِ نیاز اس سے بھی آگے بڑھ کر اس حد تک پہنچتا ہے کہ بجائے محبوب کے سنگِ در ہی سے اپنا اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

بس انتہا ہے سنگِ درِ حبیب سے ہم　　بیان کرتے ہیں جو دل کا حال ہوتا ہے

جوشِ عقیدت کی واقعی یہ انتہا ہے۔

وہ ہزاروں ٹھوکریں کھاتے ہیں لیکن اُن کے ذوقِ سر فروشی اور پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی ؎

کسی کے عشق میں ابتک وہی ہے جوشِ جانبازی　　ہزاروں ٹھوکروں پر بھی رہا ثابت قدم میرا

کیوں ـــــ اس لئے کہ وہ اس رمز سے واقف ہیں کہ جس سر نے آستانۂ یار چھوڑ دیا۔ اُس کی قسمت میں حوادثِ آسمانی کی ٹھوکریں کھانا ہے۔

ہمیشہ ٹھوکریں کھاتا رہے سنگِ حوادث کی　　وہ سر جو تیرے سنگِ آستاں سے دُور ہو جائے

ایک دوسری جگہ اپنے ذوقِ نیاز کا اظہار ان سادہ لیکن مؤثر الفاظ میں کرتے ہیں۔

ہم کو ان سے ہے غرض دنیا ہوئی اپنی تو کیا　　وہ اگر نا مہرباں ہوں مہرباں کوئی نہ ہو

محبوب کے جور و ستم کو جس نگاہِ عقیدت سے دیکھتے ہیں۔ وہ حقیقت میں جناب دلؔ کی صحت مذاق کی ایک روشن دلیل ہے وہ اس راز سے واقف ہیں کہ محبوب کا جور و ستم ہی دراصل اس کا لطف و کرم ہے۔ اس لئے وہ کسی قسم کی شکوہ طرازی کو آدابِ عشق کے خلاف سمجھتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

جور و جفائے یار کا شکوہ نہ کیجئے　　عشقِ وفا سرشت کو رسوا نہ کیجئے

اور ان کو اس ننگ کا احساس یہاں تک ہے کہ مرجانا گوارا ہے لیکن شکوہ سنجی کی ذلت پسند نہیں ؎

خلافِ عشق ہے سرگرمِ فریاد و فغاں ہونا　　الٰہی اس سے پہلے بند ہو جائے زباں میری

درد اُٹھتا ہے تو مسرت سے اُچھل پڑتے ہیں کہ یہ کسی دلنواز کا پیامِ کرم ہے۔

جب دل میں دردِ عشق اُٹھا ہم اُچھل پڑے　　سمجھے کہ یہ کرم ہے کسی دلنواز کا

ان کے نزدیک جوشِ محبت کا تقاضا یہی ہے۔ کہ پیکانِ ستم جہاں تک ممکن ہو ذوقِ خلش کو بڑھاتا رہے ؎

خلش افزا رہے پیہم یہ تحریکِ محبت ہے　　ملے پہلو میں گنجائش جہاں تک نوکِ پیکاں کو

خنجرِ قاتل سے جناب دل کو جو ذوق اور شیفتگی ہے اس کی تسکین صرف ایک وار سے نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ آرزو ہے کہ دل کے ٹکڑے پھر کسی طرح باہم مل جائیں اور ذوقِ شہادت کی لذت ایک مرتبہ اور نصیب ہوتی ؎

ابھی اے چارہ گر باقی ہے ذوقِ خنجرِ قاتل　　کسی تدبیر سے پھر پارہ ہائے دل ملا دینا

نگاہِ محبوب سے ناوک اندازیوں کا تقاضا ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

اے نگاہِ قدر انداز چلیں یوں ناوک　　جزوِ دل ہو کوئی پیوست رگِ جاں کوئی

کاش یہ ولولہ ان بیمار دلوں میں بھی پیدا ہو جاتا جنکو اب تک نوحہ خوانی سے فرصت نہیں۔

ذوقِ ستم کی لذت شناسی ان کو اپنے زخم خوردہ دل سے تیر کے ٹکڑوں کے نکالنے کی اجازت نہیں دیتی کہ وہی حقیقت میں ایک شوریدہ مزاج کے دل کی آرائش و زینت کا سامان ہے جو آسانی سے ہر شخص کو ہاتھ نہیں آسکتا۔ اس کے لئے حوصلہ اور غیر معمولی کاوش کی ضرورت ہے ؎

نہ کھینچ اے چارہ گر مجروح دل سے تیر کے ٹکڑے　　سجایا ہے بڑی کاوش سے ہم نے اس گلستاں کو

جناب دل کے اس ذوقِ گلستان آرائی کی داد دینا آسان نہیں۔ اس کی لطافت کو صرف صاحبِ ذوق ہی محسوس کر سکتا ہے۔

وارفتگی کے عالم میں احترامِ حسن کا احساس دل میں موجود ہے۔ چنانچہ آستانِ یار کے قریب پہنچکر دفعتہً سنبھل جاتے ہیں کہ یہ ادب کا مقام ہے ؎

ذروں میں کچھ کشش ہمیں محسوس ہو چلی　　اے دل سنبھل کہ پیشِ نظر کوئے یار ہے

ایک ایک لفظ پر غور کرو کس قدر رُوحانی کیف میں ڈوبا ہُوا ہے ؂

جس اخلاق و عقیدت کے ساتھ آستانِ یار پر حاضر ہوتے ہیں اُس کی تصویر یہ ہے ؂

یوں لے چلا ہے دل ہمیں اس جلوہ گاہ میں　　لختِ جگر ہیں زینتِ دامانِ آرزو

اس سے زیادہ قیمتی اور کیا نذر ہوسکتی ہے۔

محبوب کے نقشِ پا میں بھی اُن کی عقیدت پرست نگاہوں کو کیف و نشاط کے جلوے نظر آتے ہیں ؂

ذراتِ دل نشاط سے معمور ہوگئے　　فردوسِ آرزو ہے کہ آغوشِ نقشِ پا

اپنی ہستی کو رضائے دوست پر وقف کر دینے کو منزلِ مقصود کی دلیل سمجھتے ہیں ؂

سمجھا ہوں اُس کو منزلِ مقصود کی دلیل　　دل ہے کسی کے نقشِ قدم پر مٹا ہُوا

درِ یار پر گرنا ان کے نزدیک عشق کی معراج ہے ؂

درِ دلبر پہ گرا میں تو مقدر نے کہا　　بیخودِ عشق یہ معراج ہے اُفتاد نہیں

لیکن اہلِ ہوس کی طرح ذلیل ہوکر نہیں گرتے بلکہ جوشِ مسرّت اور فخر و ناز کے ساتھ جس کی تصویر یہ ہے ؂

گرے یوں اُن کے سنگِ آستاں پر　　جبینِ عجز پہنچی آسماں پر

پاسِ ادب کا یہ عالم ہے کہ شکوہ طرازیاں تو درکنار اظہارِ مدعا کی بھی جرأت نہیں ؂

حضورِ یار شکووں کا تو کیا ذکر　　گراں ہے مدعائے دل زباں پر

اور اگر کبھی اس کی نوبت بھی آئی تو زبان سے نہیں بلکہ اشکوں کی خاموش روانی سے اپنی رودادِ وفا بیان کرتے ہیں ؂

اشکوں کی روانی ہے رودادِ وفا گویا　　خاموش یہ شکوے ہیں اک شاہدِ رعنا سے

یہ ہے ذوقِ محبت کی وہ متانت اور سنجیدگی جو صرف اہلِ نظر کا خاص حصہ ہے۔

اِن مثالوں سے آپ کو کافی طور پر اندازہ ہوگیا ہوگا کہ جناب دل کے کلام میں نیاز و عقیدت اور اخلاص و وفا کی گرمی کس حد تک موجود ہے اور وہ کہاں تک بارگاہِ حُسن کے ادب شناس ہیں۔ عام شعرا جن کی طبیعتیں نکتہ شناس نہیں ہوتیں عقیدت کے جوش میں اکثر ابتذال اور ذلت و خواری کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور طرح طرح کی عامیانہ اور ذلیل حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ جو عشق و محبت کی شان بلندی کے خلاف ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی کا شعر ہے۔

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل　　میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

لیکن ہم اس حد تک جوشِ عقیدت کے قائل نہیں۔ غیرت و خودداری عشق کی شرطِ اوّلین ہے عقیدت کے

یہ معنی نہیں کہ عاشق اپنے کو بالکل پست اور ذلیل کر دے۔ بلکہ اس کا اصلی کمال یہ ہے کہ حسن کی مرتبہ شناسی کے ساتھ ساتھ عشق کی عظمت کا احساس بھی قائم رکھے لیکن یہ ایسا نازک مرحلہ ہے جس سے صرف محرمانِ خاص ہی کامیابی کے ساتھ گذر سکتے ہیں۔ جناب دل کی حقیقت شناسی اور بلند نظری ناقابلِ انکار ہو جاتی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں۔ کہ انتہائی جوش عقیدت کے عالم میں بھی عشق کی عظمت کا احساس ان کے دل میں موجود ہے۔ ان کے دل کا ذرہ ذرہ جوش نیاز سے لبریز ہے۔ محبوب کی ایک ایک ادا پر مٹ جانے کے لئے ہمہ تن تیار رہیں۔ عجز و افتادگی ان کی معراج آرزو ہے۔ تیر ستم کے ٹکڑوں سے اپنے قلب و جگر کی آرائش کرتے ہیں۔ دوست کا ہر ظلم ان کے لئے پیام رحمت ہے۔ راہ طلب کی ٹھوکر پر اُن کے منہ سے بجائے اُف کے آفرین نکلتی ہے۔ نقش پا اُن کو فردوس آرزو نظر آتا ہے۔ کوئے یار میں ہر ہر قدم پر آنکھیں بچھاتے چلتے ہیں یہ سب کچھ ہے تاہم ان کا آئینہ عقیدت ابتذال و ذلت کی گرد سے پاک ہے۔ بے شبہ وہ بارگاہ حسن کے خادم ہیں لیکن ایسے خادم ہیں جس کو اپنے حسن خدمت پر ناز ہے۔ جن کی جبین عقیدت کے سجدے ذلت و خواری کے سجدے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ سجدہ ہائے شوق و نیاز ہیں جن پر آستانِ یار کو بھی فخر و وجد ہے ؎

کئے ہیں سجدے یہ کس نے کہ فرطِ نخوت سے دماغ عرش پہ ہے تیرے آستانے کا

حسن کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ عشق صرف اس کا ایک پرتو ہے۔ بلکہ اُس کے اندر کچھ مستقل کیفیتیں بھی ہیں۔ اس احساس کو ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں ؎

سراپا شوق ہوں نقش وفا ہوں شکلِ حیرت ہوں مجھے بھی دیکھ او حسن خود آرا دیکھنے والے

یعنی صرف تو ہی نہیں ہے بلکہ میں بھی ایک قابلِ اعتنا چیز ہوں۔ گو ایک ذرۂ حقیر ہی سہی۔

نگاہِ شوق میں وہ صلاحیت و استعداد ہے کہ جب جوش کیف میں اُٹھتی ہے تو حریم حسن کے پردہ ہائے در اُلٹ جاتے ہیں ؎

جلوۂ رعنا کی فطرت ہے اسی حد تک حجاب جب نگاہِ شوق اُٹھی پردہ ہائے در اُٹھے

کاش یہ ذوق نگاہ کی قابلیت ان لوگوں میں بھی پیدا ہو جاتی جو حریم یار میں رسائی کے لئے دربان کی نگاہِ کرم کے محتاج رہتے ہیں۔

نگاہِ شوق بے شبہ اسی لئے ہے کہ جمالِ یار پر قربان ہو جائے لیکن جناب دل اس کو اس شان کے ساتھ نثار کرتے ہیں کہ خود حسن کی رونق و زینت دو بالا ہو جاتی ہے ؎

قربان ہو کے آج کسی کی نگاہِ شوق زینت فزائے حسن خدا داد ہو گئی

ان چند مثالوں سے ظاہر ہے کہ جناب دل نے باوجود جوش عقیدت کے عشق کی شانِ عظمت کو بھی قائم

رکھا ہے۔ اور یہ ان کے حسنِ مذاق کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

تفصیلاتِ مذکورہ بالا کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جناب دلؔ کا تغزل رندی و ہوسناکی کی تصویر نہیں ہے بلکہ قلب انسانی کے بلند اور شریفانہ جذبات و احساسات کا ایک باصرہ نواز مرقع ہے جو ارباب ذوق کے دیدۂ دل کے لئے اپنے اندر بہت کچھ سامان لذت رکھتا ہے۔ انہوں نے غزل گوئی کے پردے میں دراصل بلند ترین اخلاق کی دعوت دی ہے۔ غیرت و خودداری۔ ایثار و وفا۔ اخلاص و عقیدت۔ ضبط و تحمل۔ صبر و استقامت سوز و نیاز۔ ترک خودی۔ ذوق فنا ان کے نہال محبت کے برگ و بار ہیں۔ انہیں فضائل اخلاق کے مجموعہ کا نام حقیقی عشق ہے۔ جو روح انسانی کی حسیات مخفیہ کو بیدار اور منور کرتا ہے۔ جو بزدل کو شجاع۔ رذیل کو شریف پست کو بلند۔ اور کمزور کو قوی بنا دیتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے شعرا کی عام بدمذاقی نے عشق کی اس روحانی اور اخلاقی حیثیت کو بالکل غارت اور برباد کر دیا۔ اور غزل گوئی صرف مادی جذبات کی مصوری تک محدود ہو کر رہ گئی۔ جس کا لازمی نتیجہ ابتذال و پستی ہے۔

پتھرائی ہوئی آنکھیں۔ کٹی ہوئی رگیں۔ ڈوبی ہوئی نبضیں۔ جان کنی کی بے چینیاں۔ شور ماتم۔ گریہ و بکا۔ کیا اس عشق کے یہی آثار و علائم ہیں۔ جو طالبانِ ذوق کو حیاتِ ابدی کا پیغام سنانا چاہتا ہے۔ جس کا مقصد تمہارے جسم کو نہیں۔ بلکہ تمہاری روح اور تمہارے قلب و دماغ کو مشتعل اور بیدار کرتا ہے۔ اس بنا پر موجودہ رنگ تغزل کی اصلاح و تہذیب کے لئے نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عشق کی روحانی اور اخلاقی عظمت و پاکیزگی کو خاص طور پر نمایاں کیا جائے۔ تاکہ مدعیان تغزل کو صاف نظر آ جائے کہ وہ جس چیز کی تصویر کھینچ رہے ہیں اس کو دراصل عشق سے کوئی تعلق نہیں۔

ہم کو نہایت مسرت ہے کہ جناب دلؔ نے بڑی حد تک اس فرض کو خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اور حتی الوسع اپنی غزل گوئی کے دامن کو رکیک اور بازاری جذبات سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے چنانچہ ان کا کلام پڑھ کر عشق کی روحانی عظمت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ انہوں نے رقیب وغیرہ۔ وصل و نفس پرستی کے عامیانہ اور شرمناک جذبات سے اپنے کلام کو پاک رکھ کر لکھنؤ کے مبتذل رنگ تغزل کی ایک بڑی حد تک اصلاح کی ہے۔ اور اگرچہ تقاضائے زمانہ کے لحاظ سے اپنے دامن شاعری کو جناب دلؔ لکھنویت کے اثر سے بالکل محفوظ نہ رکھ سکے۔ جیسا کہ ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ تاہم خصوصیات مذکورہ بالا کی بنا پر ان کا کلام موجودہ ذوقِ تغزل کے لئے ایک حد تک شمع ہدایت کا کام دے سکتا ہے۔

جناب دلؔ کو معلوم ہو یا نہ ہو لیکن ہمارے نزدیک وہ اس پایہ کے شاعر ہیں کہ ان پر مذاق عامہ کی اصلاح و تہذیب کی بہت کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور موجودہ رنگ تغزل میں بہت کچھ تغیر پیدا کرنے کی

استعداد و صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لئے میں آئندہ ان کے نتائج فکر و خیال کو لکھنویت سے قطعاً منزہ اور مبرا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اُستاد اور ان کے زمانہ کے مذاق کی یاد اب چھوڑ دی جائے تو بہتر ہوگا۔ جناب آل حریم محبت کے محرمانِ خاص میں سے ہیں۔ اس لئے ان کی زبان سے اس قسم کے اشعار سُنکر تکلیف ہوتی ہے ؎

انہیں سفاک بننا ہے تو اُٹھیں میان سے کھنچیں یہ کوئی بات ہے باندھے ہوئے تلوار بیٹھے ہیں

بال کھولے ہائے آنا بیکسوں کی قبر پر — حوصلے کچھ بڑھ چلے ہیں خاک دامنگیر کے
کیا یہی انصاف ہے اے قاتلِ پیماں شکن — دل کے اوچھے زخم چرکے ہیں تری شمشیر کے
پہلے پہل یہ شوق ہوا ہے گراں نہ ہو — نازک سی ان کے ہاتھ میں تلوار چاہیئے
جس کی خلقت ہی میں کجی ہو وہ نہیں مٹ سکتی — بل نکل جائے تری زلف کا ممکن ہی نہیں
وہ شبِ غم کا اندھیرا۔ وہ بھیانک منظر — تھا اجل کو بھی تردد مرے گھر آنے میں
یہ انداز نگاہ یہ جور کی عادت نہیں اچھی — بہت مشہور تیری کج ادائی ہوتی جاتی ہے
ملی راحت ہجوم یاس و غم میں غش رو رو کر — لگی دل کی بجھائی ہے تو کچھ کچھ دیدۂ تر نے

ان کو چاہیئے کہ وہ اپنے ذوق و شوق کا یہی غلغلہ بلند کرتے رہیں۔

مشربِ اہلِ ذوق میں ذکر خودی حرام ہے

اور تشنگانِ محبت کو یہی درس دیتے رہیں۔

تقاضائے وفا ہے پیکرِ ہستی مٹا دینا

اور ان کے لئے اسی عالمِ بے خبری و خود فراموشی کی سیر موزوں ہے۔ جہاں

نالے ہیں نہ آہیں ہیں بس اثر ہے نہ دعا ہے۔

شاعر کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ بلکہ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ کیسا اور کیونکر کہتا ہے۔ یعنی اس کے انداز بیان میں کس حد تک ندرت اور دلکشی ہے چونکہ تاثیر شعر کی جان ہے۔ اسلئے شاعر کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کیلئے ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرے۔ جو مؤثر اور دل آویز ہو۔ ورنہ اس کے بلند سے بلند تخیلات بھی ترانہ بے اثر ہو کر رہ جائینگے۔

ہمارے نزدیک شاعر کا اصلی کمال یہی ہے کہ وہ معمولی سے معمولی خیال کو اس دلکش انداز سے ادا کرے کہ سننے والے پر ایک کیفیت طاری ہوجائے۔ حافظ کو دیکھو ان کے خیالات میں فلسفیانہ رفعت اور نکتہ آفرینی بہت کم نظر آتی ہے۔ لیکن ایک ایک شعر ارباب فن کو تڑپا دیتا ہے اس اعجاز و اثر کا حقیقی راز صرف انداز بیان کی جدت و لطافت ہے۔ غرض شاعرانہ حیثیت سے انداز بیان اور طرز ادا کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا

جناب دلؔ کے کلام میں یہ خصوصیت خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے جس کا اندازہ ایک بڑی حد تک ان کے اشعار سے بھی ہوتا ہے۔ جو انکے محاسن معنوی کے سلسلہ تنقید میں اوپر نقل ہوئے ہیں۔ اس موقعہ پر چند خاص مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ایک اسیر قفس کی زندگی جس مجبوری اور بیچارگی کے عالم میں گذرتی ہے اسکی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں ؎

افسوس اک اسیر قفس کی تمام عمر — وقفِ نظر شناسیٔ صیاد ہو گئی

نظر شناسیٔ صیاد۔ کی ترکیب نے ایک معمولی سے خیال کو کس قدر مؤثر اور دلکش بنا دیا ہے اسکو ہر صاحب ذوق محسوس کر سکتا ہے۔

ناکامانِ زندگی جس طرح بہار کامرانی کی خیالی نقش آرائیوں سے اپنے افسردہ قلوب کو تسکین دیتے رہتے ہیں۔ اس کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

بہلا رہے ہیں اپنی طبیعت خزاں نصیب — دامن پہ کھینچ کھینچ کے نقشہ بہار کا

محبوب کے دامن جھٹکنے کا انداز کوئی غیر معمولی خیال نہیں لیکن جناب دل کا پیرایۂ بیان قابل داد ہے ؎

سرِ طور ایک برقِ حسن لہرائی نظر آئی — ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے داماں کو

جناب دل اکثر تشریح کی بجائے اشاروں سے کام لیتے ہیں جس سے طرز ادا میں ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے یہ اُن کا خاص انداز معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً

بیخودِ عشق ہیں دل مائلِ فریاد نہیں — ہم پہ گذرا تو بہت کچھ ہے مگر یاد نہیں

دیکھو "بہت کچھ" کے اشارہ نے اور پھر اس پر "یاد نہیں" کے ٹکڑے نے جو دلکشی اور اثر پیدا کر دیا ہے وہ تشریح کی صورت میں ناممکن تھا ؎

کہنے کی ہے کیا حاجت احوالِ شبِ فرقت — گذرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سنا ہوگا

تم نے بھی سنا ہوگا۔ کے ٹکڑہ نے ایک معمولی سی بات میں غور کرو۔ جان ڈالدی ہے۔ کہا کچھ بھی نہیں لیکن دراصل سب کچھ کہہ گئے ؎

ہم کو بے چین کئے جاتے ہیں — ہائے کیا شئے وہ لئے جاتے ہیں

بجائے کیا شئے کے اگر صاف کہہ دیتے تو شعر کی تمام بلاغت برباد ہو جاتی۔ اپنے لئے محبت کی غیر متعین کیفیت۔ ہائے کیا شئے۔ نے جس خوبی کے ساتھ ادا کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

اگرچہ جناب دل کے انداز بیان میں کوئی غیر معمولی جدت اور ندرت موجود نہیں ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے طرز ادا میں ایک خاص روانی و برجستگی اور صفائی و دلآویزی عام طور پر محسوس ہوتی ہے۔ اس کا ایک خاص سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جو زبان اختیار کی ہے وہ غزل کے لئے نہایت موزوں اور مناسب ہے۔ یعنی صاف۔ شیریں۔ سادہ اور تصنع و تکلف سے پاک ہے۔ اگرچہ فارسیت کے ذوق آشنا معلوم ہوتے ہیں لیکن اس

رمز سے واقف تھے کہ غزل کی لطافت ثقیل اور نامانوس فارسی ترکیبوں کی متحمل نہیں ہو سکتی چنانچہ بجز ہلکی اور شیریں ترکیبوں کے ان کا کلام اس ثقالت سے پاک و صاف ہے لیکن سادگی کے ساتھ ساتھ حتی الوسع شاعرانہ رنگینی کا بھی لحاظ رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ کافی طور پر اشعار مذکورہ بالا سے ہر صاحب ذوق بآسانی کر سکتا ہے۔ مزید مثالوں کی چنداں ضرورت نہیں۔

غزل گو شعرا میں اکثر مسلسل واقعہ نگاری کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے اور یہ اردو غزل گوئی کا ایک بڑا نقص ہے کہ باہم اشعار میں کوئی معنوی تعلق نہیں ہوتا۔ اگرچہ واقعہ نگاری اور تسلسل خیال کے لئے اور اصناف سخن شلاً مثنوی، قصیدہ وغیرہ موجود ہیں۔ تاہم غزل میں تسلسل خیال سے کام لیا جائے تو بہتر ہے۔ جناب ولی کے کلام میں اکثر عشق و محبت کی مختلف کیفیات کی مسلسل مصوری کی مثالیں نظر آتی ہیں جن سے ان کی قوت نظم کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً آپ نے ابتدائے عشق کی ایک کیفیت مسلسل غزل میں بیان کی ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

یاد ہے اے ہمنشیں وہ بھی زمانہ یاد ہے　　دل کا آنا یاد ہے پہلو سے جانا یاد ہے

ایک دوسری غزل میں جس کا مطلع یہ ہے ؎

کسی کی یاد میں آنکھوں سے اشک ڈھلتے تھے　　اسی خیال میں ہم کروٹیں بدلتے تھے

محبوب کی یاد کی تصویر کھینچی ہے۔

اس سلسلہ میں وہ غزل جس میں جناب ولی نے اپنا نذرانۂ خلوص و عقیدت پیک یار کی معرفت بھیجا ہے خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے جس سے ان کے جوش محبت اور گرمیٔ نیاز کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے ؎

شکیب و ضبط بھی اے پیک یار لیتا جا　　پلٹ چلا ہے تو دل کا قرار لیتا جا

افسوس ہے کہ طوالت کے لحاظ سے ہم ان غزلوں کو مکمل نقل نہیں کر سکتے۔ ناظرین خود ملاحظہ فرمالیں۔

اس مجموعہ کے آخر میں چند رباعیات اور مخمس ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب ولی صرف غزل گو نہیں ہیں۔ بلکہ اور اصناف سخن پر بھی قادر ہیں۔ اور اپنے خیالات و جذبات کا اظہار نہایت روانی اور صفائی کے ساتھ مختلف طریقوں سے کر سکتے ہیں۔ چونکہ ان میں کوئی نمایاں خصوصیت نظر نہیں آتی اور طوالت کا بھی خوف ہے۔ اس لئے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں۔ اور جناب ولی سے رخصت ہوتے ہوئے اتنا عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ باوجود ان کے شاعرانہ کمال کے۔ باوجود ان کی متانت اور سنجیدگی کے۔ باوجود ان کی اخلاقی بلندی اور پاکیزہ خیالی کے ان کی لکھنویت اب تک میری نگاہوں میں کھٹکتی ہے۔ جو ان کے عارض کمال کا ایک بدنما داغ ہے ÷

افسانۂ عشق

تضمین بر شعر اعتبار الملک لسان الدہر حکیم الشعرا حضرت دلؔ شاہجہانپوری

(از ڈاکٹر ادیب عثمانی ۔ ایم ۔ ڈی ۔ ایچ)

عشق پھر عشق کی آشفتہ سری اُف توبہ
اس میں رہ رہ گئے مردانِ جری اُف توبہ
سینکڑوں سرکشِ دُنیا ہوئے سرخم اکثر
شہر یاروں سے چھنی سلطنتِ جم اکثر
اسکے اعجاز نے گھر کر دئیے ویراں لاکھوں
اسکے انعام نے بہکا دئیے انساں لاکھوں
وائے قسمت کہ مجھے بھی یہی آزار ہوُا
اسی زنداں میں مرا دل بھی گرفتار ہوُا
دین و دُنیا سے کیا عاشقِ حیاتاں ہوکر
خانہ برباد ہوُا عشق کا مہماں ہوکر
شغلِ عشرت نہ رہا جوشِ مسرّت کے بغیر
لطفِ محفل نہ رہا نغمۂ راحت کے بغیر
نازشِ چشم رہی ایک ہی تصویرِ حسیں
ایک ہی خواب رہا حاملِ تعبیرِ حسیں
خوف آنے لگا ہنگامۂ دنیا سے مجھے
اُنس بڑھنے لگا خاموشیٔ صحرا سے مجھے

دردِ جانکاہ کی شدت سے بنی جاں پر بھی
ہاتھ وحشت میں پڑا چاک گریباں پر بھی
دیدۂ خشک مرا دیدۂ پُرغم بھی ہوُا
میرا عشرت کدہ ماتم کدۂ غم بھی ہوُا
آہ بھی قلبِ پُرارماں سے فغاں بھی نکلی
لبِ خاموش سے فریادِ طپاں بھی نکلی
قیدِ مسکن بھی رہا بادیہ پیما بھی ہوُا
واقفِ زہد بھی لذّت کشِ صہبا بھی ہوُا
ظاہری حسنِ فسوں ساز پہ بھولا بھی بہت
اور گہوارۂ اعجاز میں جھولا بھی بہت
ہر کہیں سے یہ صدا آئی کہ ناممکن ہے
دلِ سرکش کو ملے جامِ محبت سے مے
اس لئے اب سحر و شام بہ اندازِ دگر
"کوچۂ عشق میں ہے خاک کے ذرّوں پہ نظر"
"یہی سمجھائیں گے مفہومِ تمنّا مجھ کو"

تلخ و شیریں

(عالیجناب نواب جعفر علی خاں صاحب آثر لکھنوی ڈپٹی کمشنر ضلع ہردوئی - یو-پی)

آج کل یہ بات فیشن میں داخل ہوگئی ہے۔ کہ جو غیر لکھنوی شخص شاعری یا ایسے شاعر کے متعلق جس کو لکھنؤ سے توسل ہو کچھ لکھنے بیٹھتا ہے وہ لکھنؤ کی شاعری اور وہاں کے شاعروں کو دو چار صلواتیں ضرور سنا دیتا ہے۔ ان لوگوں نے یہ بھی قسم کھائی ہے۔ کہ لکھنؤ کی شاعری میں سوا ابتذال و سوقیت اور دوسری برائیوں کے کوئی خوبی کبھی نہ دیکھیں گے۔ ایسے ہی آدمیوں میں مرزا احسان احمد صاحب بی۔اے بھی ہیں۔ آپ نے نگار کے دو نمبروں میں حضرت دل شاہجہانپوری کے مجموعہ کلام نغمۂ دل پر تنقید کی ہے۔ مگر صرف اس وجہ سے کہ حضرت دل حضرت امیر مینائی مرحوم کے شاگرد ہیں اور امیر لکھنوی تھے۔ قدم قدم پر لکھنؤ کی شاعری اور وہاں کے شاعروں کو تیرِ ملامت کا ہدف بنایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ

"ماحول سے متاثر ہونا تقاضائے فطرت ہے، جناب دل نے آنکھیں کھولیں تو ملک پر امیر مینائی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ زانوئے تلمذ بھی جناب دل نے انہیں کے سامنے تہ کیا، لیکن چونکہ قدرت کی طرف سے طبع سلیم عطا ہوئی تھی۔ اس لئے ان کے کلام میں وہ ابتذال نظر نہیں آتا جو عام طور پر لکھنؤ کا انداز ہے، تاہم لکھنویت کا اثر بہت کچھ نمایاں ہے۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ

"لکھنویت صرف وصل کا نام نہیں۔ جو مضامین عام طور پر لکھنؤ کے غزل گو شعرا کے سرمایۂ خیال ہیں مثلاً شمع تربت، چراغ مزار، بتِ سفاک، گریہ و زاری، ناز و ادا، کوچۂ قاتل، گورِ غریباں وغیرہ ان کی جھلک جناب دل کے کلام میں بھی نظر آتی ہے۔"

اگر لکھنویت اسی سبب سے بدنام ہے تو میں اس رسوائی کا خیر مقدم کرتا ہوں کیونکہ غزل سے اگر یہ مضامین مع "وغیرہ" خارج کر دئے جائیں تو شاعری محض "دہقانیت" یا "تیل بیل چمیلی" یا صرف "ہُو حق" رہ جاتی ہے۔ میرزائے موصوف اس نکتے سے ناواقف ہیں کہ وصل و ناز و ادا، حزن و یاس، گریہ و زاری یا اسی قبیل کے خیالات میں بجائے خود قبح نہیں بلکہ نظم کا سلیقہ نہ ہونا، شاعر کی نگاہ کا ان مناظر یا کیفیات کی روح تک گذر نہ ہونے کے بجائے سطحی مصوری پر قانع ہونا ان کے نامطبوع ہونے کا باعث ہے۔ یہ نقص ایسے ہی خیالات و جذبات پر موقوف نہیں۔ شگفتہ سے شگفتہ، لطیف سے لطیف، بلند سے بلند خیال بھی اگر شاعر کے انفعالی اثرات اپنے

دامن میں نہیں لئے ہے۔ تو شعر سپاٹ اور بے کیف ہوگا۔ مگر وہی خیال حقیقت آشنا قلم سے نکلا ہے تو اپنے میں تاثیر و دلکشی کی ایک دنیا لئے ہوگا۔ کیونکہ سچا شاعر حقیقت کی گہرائیوں تک پہنچ کر صداقت کے ساتھ اس کی ترجمانی کرتا ہے۔۔ ایسا شعر ضرور دل کھینچے گا۔ خواہ نغمۂ شادی ہو خواہ نوحۂ غم۔ شاعر پر یہ کیفیت ہر وقت طاری نہیں رہتی۔ بلکہ شدّت یا کمی کے ساتھ" دَورے پڑتے ہیں،، خوش نصیب ہے وہ شاعر جس کو یہ کیفیت اکثر و بیشتر میسّر ہے بیچارہ اس لالچ میں کہ جیسا شعر اس کیفیت کے ماتحت نکلا ہے ویسے ہی اور کہوں دل کے بجائے دماغ سے کام لینے لگتا ہے۔ ایسے شعر اصلی پھولوں کے بجائے کاغذی گل بوٹے ہوتے ہیں۔ جن میں سے بعض نوک پلک سے درست ہوتے ہیں اور بعض کاواک۔ یہ خرابی لکھنوی شاعروں کی میراث نہیں ہے۔ بلکہ غیر لکھنوی شاعر بھی اس میں برابر کے حصّہ دار ہیں ۞

گفتگو شاعر سے ہے جس کی تخلیق میں فطرت اعتدال برتتی ہے اور اسراف سے کام نہیں لیتی لیکن جو لوگ محض ناظم یا متشاعر پیدا ہوتے ہیں اور حشرات الارض کی طرح بکثرت معرض وجود میں آتے اور فنا ہو جاتے ہیں۔ وہ غریب کیا کریں۔ سوا اس کے کہ سطحی و فرسودہ و پامال مضامین تناسبات لفظی کے سہارے موزوں کردیں اور اسی میں مگن رہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اوّل تو وہ باتیں جن کی مرزا صاحب نے مذمّت کی ہے اور لکھنؤ کا "سرمایۂ خیال" کہا ہے نہ تو کلیتاً لکھنؤ سے مخصوص ہیں اور نہ لکھنؤ کے سرمایۂ خیال کو ختم کردیتی ہیں ۞

پھر فرماتے ہیں کہ

"جناب دل کا کلام لکھنویت سے بالکل محفوظ نہیں ہے اور یہ استاد کے فیض صحبت کا لازمی نتیجہ تھا۔ لیکن چونکہ فطرت متین اور ذوق آشنا تھی اس لئے جناب دل اس حمام میں عام لکھنوی شعرا کی طرح بالکل برہنہ نظر نہیں آتے اور کہیں کہیں اسی قدیم ذخیرۂ سخن میں ذوقِ سلیم کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے جس نے آئندہ چلکر انکے آئینہ کلام کو لکھنویت کی آلائش سے اس حد تک صاف کردیا کہ پڑھنے والے کو یہ بھی یقین نہیں آسکتا کہ یہ لکھنؤ کے کسی صحبت یافتہ کا کلام ہے . . . . .

اگرچہ فطری متانت اس موقع پر بھی قائم رہتی ہے یعنی عام لکھنوی شعرا کی" طرح جناب دل علانیہ سینہ کوبی اور نوحہ گری کی حد تک نہیں پہنچے تاہم انہوں نے غم کی جو تصویر کھینچی ہے وہ لکھنویت کے اثر سے بالکل محفوظ نہیں ہے . . . . .

اس قسم کے اشعار بکثرت موجود ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ماتم سرایان لکھنؤ کی طرح "جنازہ بردوش نظر نہیں آتے "کاش یہ صدائے آفرین کبھی ماتم کدۂ لکھنؤ سے بھی بلند ہوتی . . . .

بدقسمتی سے لکھنؤ کی بدولت سوز و گداز کا مفہوم گریہ و بکا سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ سوز و گداز کو دراصل سینہ کوبی اور فریاد و ماتم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ صرف رُوح کی ایک لطیف دردمندانہ کیفیت کا نام ہے۔ جس سے شاعر کا کلام طور پر لبریز ہوتا ہے۔ کاش یہ ولولہ ان بیمار دلوں میں بھی پیدا ہوجاتا جنکو ابتک نوحہ خوانی سے فرصت نہیں . . . . . .

انہوں نے رقیب و عدو و وصل و نفس پرستی کے عامیانہ اور شرمناک جذبات سے اپنے کلام کو پاک رکھ کر لکھنؤ کے مبتذل رنگ تغزل کی ایک بڑی حد تک اصلاح کی ہے۔ اگرچہ تقاضائے زمانہ کے لحاظ سے اپنے دامن شاعری کو جناب دل لکھنؤ کے اثر سے بالکل محفوظ نہ رکھ سکے جیسا کہ ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔"

یہ انتخاب مضمون کے پہلے حصّہ کا ہے جو ستمبر کے نگار میں شائع ہوا۔ دُوسرے حصّہ میں اور بھی زہر اُگلا ہے۔ وہ پرچہ باوجود تلاش نہیں ملتا اور دوبارہ منگانا طوالت ہے۔

مرزا صاحب نے اپنے مضمون میں کمال کیا ہے کہ شاعری میں جس قدر عیب ہو سکتے ہیں وہ سب تو لکھنؤ کے سر تھوپ دئیے ہیں اور جتنی خوبیاں ہو سکتی ہیں اُن سب کا سہرا غیر لکھنوی شاعروں کے سر باندھا ہے حالانکہ اس گئے گذرے حال میں بھی اگر کوئی انصاف پسند و غیر متعصب شخص ہندوستان بھر کے کہنے والے اردو غزل گو شاعروں کا انتخاب کرے تو نصف سے زیادہ لکھنؤ کے حصّہ میں آئیں گے۔

میں اپنے پیشتر کے متعدد مضامین میں دکھا چکا ہوں کہ ابتذال و سوقیت لکھنؤ والوں کے کلام تک محدود نہیں بلکہ اور لوگوں کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ حاسدوں کی نظر میں اگر کسی لکھنوی کے کلام میں نقص ہے تو موجب ملامت ہے اور دوسروں کے یہاں ہے تو مستحق ستائش ہے۔ ساون کے اندھوں کو لکھنؤ والوں کی شاعری میں معائب اگر آنکھ میں چھینٹ کی طرح ہیں تو پھلی نظر آتے ہیں اور غیر لکھنوی کے کلام میں شہتیر بھی ہوں تو سُوئی سے باریک اور ناقابلِ اعتنا سمجھے جاتے ہیں۔ کسی لکھنوی نے درد انگیز شعر کہا تو وہ گریہ و بکا ہے۔ غیر لکھنوی نے ویسا ہی کہا تو سوز و گداز ہے۔ لکھنوی نے طرب انگیز شعر کہا تو اس میں ابتذال و سوقیت و نفس پرستی کی شق نکلی، غیر لکھنوی نے کہا تو اس میں رقص ناچ رہا ہے۔ سرور تھرک رہا ہے اور مستی ٹپک رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مرزا احسان احمد صاحب جناب اصغر گونڈوی کے بیحد معتقد ہیں۔ جناب اصغر کا ایک مختصر دیوان جس میں مشکل سے پانچ چھ سو شعر ہونگے شائع ہوا ہے۔ یہ کلام بہت سختی سے انتخاب کے بعد چھاپا گیا ہے۔ ورنہ اصغر صاحب کی مشقِ سخن ایک مدت سے جاری ہے اور انہوں نے نہ معلوم کیا کیا نغمہ سرائی کی ہے جس کے نمونے کہیں کہیں نظر آ جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں ان کی ایک غزل رسالہ جام جہاں نما لکھنؤ میں شائع ہوئی تھی جس کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔ فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں ؎

پھانسا ہے دل کو الفت چشم سیاہ میں ۔۔۔ کاجل کی کوٹھڑی میں نظر بند کر گئے

زمانۂ گذشتہ کے سوقیانہ مذاق والے بھی اگر اس شعر کو سُن لیں تو فوراً قبر میں کروٹیں بدلنے لگیں اور کہیں کہ ہائے ہم کو یہ ضلع جگت نہ سوجھا۔

چار شعر خمخانۂ جاوید میں بھی ہیں، وہ اس پایہ کے تو نہیں مگر پھر بھی اسی طرز کے ہیں ؎

ابر اُٹھا ہے، ترشح ہے گھٹا چھائی ہے — ہجوِ مے کرتا ہے زاہد کوئی سودائی ہے
آپ کے چاہنے والے تو مرے جاتے ہیں — اس پہ پھر آپ کو دعوائے مسیحائی ہے
باغ ہے، نہر ہیں، حوریں ہیں، اے کوثر ہے — واعظو مان گئے، کیا سخن آرائی ہے
عہد توڑے، دلِ عشاق بھی توڑے اُس نے — اس نزاکت پہ بھی اس درجہ توانائی ہے

آئیے اب ذرا اُس منتخب کلام کا جائزہ لیں جو غیر لکھنویوں کے قائدِ اعظم حضرت اصغر گونڈوی کا نشاطِ روح کے نام سے شائع ہوا ہے اور دیکھیں کہ وہ کہاں تک ان مضامین سے پاک ہے جن کے نظم کرنے کو مرزا احسان احمد صاحب لکھنویت، وسوقیت اور نہ معلوم کیا کیا خرافات کہتے ہیں :۔

یہ بزرگوار میدانِ نعت میں گامزن ہیں مگر فرماتے ہیں ؎

نگاہ ناز میں پنہاں ہیں نکتہ ہائے فنا — چھپا ہے خنجرِ ابرو میں رمزِ لاموجود
وہ مست، شاہدِ رعنا، نگاہ سحر طراز — وہ جامِ نیم شبی، نرگسِ خمار آلود

وہی شعروں میں ناز و ادا و خنجر سب کچھ آگیا۔ یہ شعر تشبیب میں بھی نہیں ہیں۔ بلکہ گریز کے بعد ہیں اور ان سے پہلے شعر آچکا ہے ؎

وہ سرورِ دو جہاں وہ محمدِ عربی — بہ روحِ اعظم و پاکش درود نامحدود

حضور کی نگاہ کو "سحر طراز" کہنا تو ایسی گستاخی ہے جس کے جواز کی شاید ہی کوئی صورت نکلے۔ اس کو سوقیت کا عیوق کہنا چاہیئے۔ پھر اگر ایسی سرکار میں اظہارِ عشق کو دشنہ و خنجر و نگاہ سحر طراز درکار ہے تو اُس شاعری میں جو تقدس کی مدعی نہیں ہے انہیں باتوں پر کیوں ناک بھوں چڑھائی جائے۔

یہی اصغر صاحب ایک دوسری جگہ "حقانیت" کے ذیل میں فرماتے ہیں ؎

لئے ہیں زلف سے آشفتگی کے سب انداز — نگاہِ مست سے سیکھا ہے حسنِ بے پروا

حضرت "وہی کنگھی چوٹی" کی شاعری !

مرزا احسان احمد صاحب نے لکھنؤ کو ماتم کدہ کہکر یہاں کے نالہ و شیون کو بکھانا ہے۔ اصغر صاحب ہیں۔ ع — رہا نہ ولولۂ آہ نارسا باقی

ایضاً ؎ دلِ حزیں میں تڑپنے کی اب سکت رہی — نہ تارِ اشک کا اب کوئی "سلسلہ" باقی

(یہ "کوئی سلسلہ" کی بھی بہت ہوئی)

اور سنئے۔ وصل بھی پھاندنا پڑا ؎

رہی نہ وصل کی لذت نہ ہجر کی کلفت — دوائے درد نہ اب دردِ بے دوا باقی

عصیاں میں لذت آپ نے کہیں نہ سنی ہوگی، البتہ انفعالِ عصیاں میں لذت ہو سکتی ہے۔ مگر اب سے بے دھڑک گناہ کیجئے اور لذت اندوز ہوجئے، اس میں ابتذال یا دناءت نام کو نہیں۔ ورنہ اصغر صاحب کیوں فرماتے کہ ؎

نہ اب وہ ذوقِ عبادت کی سعی لاحاصل　　نہ اب وہ لذتِ عصیاں کا ولولہ باقی

عشاق کے رخساروں سے آنکھیں سینکئے ؎

اس رخِ رنگیں سے آنکھیں سینکئے　　ڈھونڈھئے اب آتشِ ایمن کہاں

مستی ملاحظہ ہو ؎

مستی میں فروغِ رخِ جاناں نہیں دیکھا　　سنتے ہیں بہار آئی، گلستاں نہیں دیکھا

لفظِ مستی جس طرح آیا ہے اور یہی مستی کی غمازی کرتا ہے علاوہ بریں یہ مطلع غالب کے ایک مصرع کا دست نگر ہے

ع　چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

اور مستی ملاحظہ ہو جس میں عریانی بھی شامل ہے ؎

کچھ دعویٔ تمکیں ہیں ہے معذور بھی زاہد　　مستی میں تجھے چاک گریباں نہیں دیکھا

زاہد نے نہیں دیکھا لہذا معذور رہے، انہوں نے دیکھا اور تمکین سے ہاتھ اٹھا کر ہاتھ بڑھایا اور کیوں ایسی جرأت نہ کریں جب خود معشوق مارے مستی کے چاک گریبان ہو جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ابتذال و سوقیت کیا ہے۔ اگر یہ تہذیب و متانت ہے۔

دقیانوسیت بھی دیکھئے ؎

حقیقت کھول دیتا ہیں جنوں کے رازِ پنہاں کی　　قسم دیتا ہے لیکن قیس نے چاک گریباں کی

ایک گھنگرج آہ بھی سن لیجئے ؎

اسیرانِ بلا نے آہ کچھ اس درد سے کھینچی　　نگہباں چیخ اٹھے ہل گئی دیوارِ زنداں کی

حسرت و یاس خالص غیر لکھنوی ؎

اسیرانِ بلا کی حسرتوں کو آہ کیا کہئے　　تڑپ کے ساتھ اونچی ہوگئی دیوارِ زنداں کی

وبلبل۔ لکھنوی شاعری ایک جماعت میں اس بدعت پر بھی مطعون ہے ؎

ادھر وہ خندۂ گلہائے رنگین صحنِ گلشن میں　　ادھر اک آگ لگ جانا وہ بلبل کے نشیمن میں

ہوشیار ہوجائیے وصل پھر آرہا ہے ؎

تپش جو شوق میں تھی وصل میں بھی ہے وہی مجھ کو　　چمن میں بھی وہی اک آگ ہے جو تھی نشیمن میں

دونوں مصرعوں کا ربط اور شوق کی جگہ ہجر نہ کہنا یہ رموز خود اصغر صاحب یا اُن کے شارح مرزا احسان احمد صاحب سے دریافت کیجئے۔

عشوہ، نگاہ، وغیرہ اور سب بیہودگی کے ساتھ ؎

عشووں کی ہے نہ اس نگہ فتنہ زا کی ہے ساری خطا مرے دل شورش دوا کی ہے

لطافتِ جسم معشوق کا نظارہ اور پھر معشوق سے خطاب۔ ملاحظہ ہو ؎

جلوۂ رنگیں اُتر آیا نگاہِ شوق میں ہم لطافت جسم کی اے سیمتن دیکھا کئے

لحد، چراغ مزار لکھنوی بدعتیں جنہوں نے لکھنؤ سے باہر نکلتے ہی چولا بدلا ؎

وہ دستِ ناز جو معجز نمائیاں نہ کرے لحد کا پھول چراغ سرِ مزار نہ ہو

صبح وصل و شام انتظار ؎

دکھا دے بیخودیٔ شوق وہ سماں مجھ کو کہ صبح وصل نہ ہو، شام انتظار نہ ہو

کبھی معشوق کے ہونٹ حیات جاوید بخشتے تھے، معجز نما ہوتے تھے، اب وہ سب ابتذال ہے، آج سے ہونٹ بلا ہیں اور تبسم برق بلا ؎

ہونٹوں پہ تبسم ہے کہ اک برق بلا ہے آنکھوں کا اشارہ ہے کہ سیلاب فنا ہے

لیجئے صاحب، ناصح مشفق بھی آ گئے ؎

ناصح مشفق مگر یونہی تڑپنے دے مجھے مجھ کو بھی معلوم ہے سُود و زیانِ اضطراب

بات یہ ہے کہ "مگر" نے جدّت پیدا کر دی۔ اگر لکھنوی کے یہاں ہوتا تو حشو قرار پاتا۔

ہمت افزا شاعری ؎

یہ بھی فریب سے ہیں کچھ دردِ عاشقی کے ہم مر کے کیا کرینگے، کیا کر لیا ہے جی کے

اصغر قبل الذکر کی ایک شاندار مثال جس میں کوئی بُرا پہلو نکل ہی نہیں سکتا ؎

سب کی بقدر حوصلۂ دل نظر میں ہے جلوہ تمہارا ذوقِ طلب کے اثر میں ہے

مطلب آپ سمجھئے یا سمجھائیے۔

گریبان کا گھاؤ بھی دیکھ لیجئے ؎

پھر گئی آنکھوں کے نیچے وہ ادائے برق حسن چیخ اُٹھے سب مرا چاک گریباں دیکھ کر

بات یہ ہے کہ آجکل چیخ پکار تو داخل وضع ہے، مگر آہ و زاری، نالہ و بیقراری یکسر مردود و مطرود ہیں۔ عریانی بھی فیشن میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ چیخ پکار سے پھیپھڑوں میں خوب ہوا

بھرتی ہے۔ اور عریانی میں غسلِ آفتاب کا عمل ہوتا ہے۔ اس طرح صحت درست ہوتی ہو جسکا اخلاق پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے
اسی ارتقا کا نتیجہ ہے کہ بلبل جو کبھی ایک خفیف منتِ پر تھی۔ اب اس قدر تنو مند و توانا ہو گئی ہے۔ کہ بجائے ایک شاخ کے کئی کئی شاخوں پر پھیلا کر آشیانہ بناتی ہے۔ اور "حاجی لق لق" یا شیخ یہودی کو چیلنج دیتی ہے۔ کہ دیکھوں تیرے گھونسلے سے کے من لکڑی نکلتی ہے۔ اور میرے گھونسلے سے کے من ؎

قفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل معاذ اللہ   کہ میں نے توڑ کر اِک ایک شاخِ آشیاں رکھدی

(حاجی لق لق جس کو شیخ یہودی بھی کہتے ہیں۔ عراق کی طرف ایک طائر ہوتا ہے۔ جو زیارت گاہوں کے قبّوں پر اپنا آشیانہ بناتا ہے۔ یہ آشیانہ اتنا بڑا ہوتا ہے۔ کہ اس سے کئی کئی من لکڑی نکلتی ہے۔ ش م)

افسوس بتِ سفاک نہیں ملا، مگر ظالم، تیغِ خوں فشاں، اور رقصِ بسمل ل گئے وہی حاضر ہیں ؎

کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاید رقصِ بسمل میں   بہت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغِ خوں فشاں رکھدی

زلف و رخ کو اگر لکھنؤ والا شام و سحر کہدے تو قیامت آ جائے۔ اصغر صاحب کہتے ہیں تو پتا بھی نہیں کھڑکتا ؎

زلف تھی جو بکھر گئی، رخ تھا کہ جو نکھر گیا   ہائے وہ شام اب کہاں ہائے وہ اب سحر کہاں

"کہ" کو حشو نہ کہئے اور یہ ہائے ہائے لکھنوی جنس سے بالکل علیحدہ پیداوار ہے جس کی سرگرم موٹر کار کی ہوٹنگ پر قائم کی گئی ہے۔

اسی طرح درد اگر درد ہے تو لکھنؤ کے لئے مخصوص ہے، اگر فقط درد ہے تو اصغر صاحب کا پیٹنٹ ہے۔ یہی حال بے آواز کے درد کا ہے ؎

صرف ایک سوز تو مجھ میں ہے مگر ساز نہیں   میں فقط درد ہوں جس میں کوئی آواز نہیں

یہیں سے اس راز کا بھی انکشاف ہوا کہ درسِ بصیرت کے لئے بھی آواز کی ضرورت ہے۔ کمبخت لکھنؤ والے نہیں سمجھتے۔ اسی سے خراب و خستہ حال ہیں ؎

مجھ سے جو چاہئے وہ درسِ بصیرت لیجے   میں خود آواز ہوں، میری کوئی آواز نہیں

میر کا ایک مصرع سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آج اس کا مطلب حل ہوا۔ ع کہتے ہیں اندھوں کو بصیر ہوئے۔

یعنی کا نادر صرف ملاحظہ ہو، تعقید پہ لعنت بھیجئے ؎

آشوبِ دہر و فتنۂ محشر لئے ہوئے   پہلو میں یعنی ہوں دلِ مضطر لئے ہوئے

یہ بھی خیال نہ کیجئے کہ مضطر کے معنی مجبور کے ہیں نہ کہ بیقرار کے اور ایسی صورت میں دل کو آشوب زا یا ہنگامہ گستر نہیں کہہ سکتے اب وہ زمانہ آگیا ہے۔ کہ معشوق آپ کی چھاتی پر چڑھ کر خنجر مارے تو آپ بھی خنجر چلائیے۔ یہاں تک کہ دو دھڑ ہو جائے ؎

قاتل نگاہ یاس کی زد سے نہ بچ سکا خنجر تھے ہم بھی اک تہ خنجر لئے ہوئے

یہ تھوڑی کہ تعشق افسوس کر رہے ہیں ؎

وُہ بھیرے تھا مُنہ ذبح میں ہو رہا تھا خدا جانے ہنستا تھا یا رو رہا تھا

میدان رست خیز میں جست وخیز ملاحظہ ہو ؎

نام ان کا آگیا کہیں ہنگام باز پرس ہم تھے کہ اُڑ گئے صفِ محشر لئے ہوئے

معشوق کو کلیجی اور دل کی ضرورت ہے۔ غالبًا خون کی کمی کے علاج کو۔ اب چیتھڑوں کی حاجت نہیں ہے ؎

ان کو مطلوب ہیں کچھ قلب وجگر کے ٹکڑے جیب و دامن نہ کوئی پھاڑ کے دیوانہ بنے

تڑپنا اور فریاد کرنا عیب نہیں بشرطیکہ دلِ ناشاد کی شکل نہیں' پوری شکل دکھلا دیجئے ؎

سامنے اُنکے تڑپ کر اس طرح فریاد کی میں نے پوری شکل دکھلا دی دلِ ناشاد کی

پوری غزل میں رونا ہی رونا ہے۔ دس شعر ہیں' پانچ فریاد کے قافیہ میں۔ مطلع کا پہلا مصرع بھی شامل کر لیجئے۔ تو چھ عدد فریادیں ہو جاتی ہیں۔ مگر فرماتے ہیں کہ ؏ مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ وفریاد کی

معشوق کے گالوں کو گل کہہ دیجئے اُس کے بعد پورا اختیار ہے۔ کہ ان کو چھیڑیئے' چھوئیے۔ غرضیکہ تمام تجرباتِ لمس ختم کر دیجئے کوئی تعارض نہ ہوگا ؎

عارض نازک پہ اُن کے رنگ سا کچھ آگیا ان گُلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

مسلمانی کا رونا' بقول شخصے مسلمانان در گور و مسلمانی در کتاب ؎

ان بتوں کی صورت زیبا کو اصغر کیا کہوں پر خدا لگتے وائے ناکامی مسلماں کر دیا

یہ حقائق ومعارف ہماری آپ کی سمجھ سے بالا ہیں۔

طائرِ قدس کو دام تزویر میں پھانسنا کسی لکھنؤ والے کو نصیب نہیں ہوا۔ یہ شکار اصغر صاحب کے لئے رہ گیا تھا ؎

اے دل شوخ وحیلہ جو' زیرِ مکینِ رنگ و بو طائر قدس کو بھی لے' دامگہِ مجاز میں

پردہ حرمان معؑ اے خوشادردے ؎

پہ دُہ حرماں میں آخر کون ہے اُس کے سوا اے خوشادردے کہ نزدیکی بھی ہے دوری بھی ہے

اے خوشادردے دمعؑ بائے مجہول کی داد وہی ہو سکتی ہے۔ جو سودا نے میر سوز کو" اُپاہے" پر دی تھی۔ کہ میر صاحب یا تو یہ لفظ عہد طفلی میں لشور کی ڈومنیوں سے سُنا تھا یا آج آپ کی زبانِ اقدس سے سُنا۔

عصیاں کی لذت پہلے سن چکے اب عصیاں کی رعنائی ملاحظہ ہو ؎

رحمتِ حق نے بہت دیکھ لی ایمان کی بہار اب ذرا سامنے رعنائی عصیاں کر دیں

جیسا کسی انگریز نے کہا ہے اتر جمہ میں لطف نہیں۔ A GAUDY PIECE OF DEFORMITY
ساغر کا ٹپکنا جو مقامی رنگ میں ڈوبا ہوا یعنی آہ کے ٹپکنے سے مشتق ہے ؎
یارب مجھے مطلب ہے شیشے سے نہ مینا سے ساغر کوئی ٹپکا دے اس اوج ثریا کو
غالبًا الیبانہ ہونے پر زبان پہ جاری ہوا ہوگا۔ کہ "شعر فہمی عالم بالا معلوم"
شورش و فریاد جو نالہ و فریاد سے ایک بالکل الگ چیز ہے ؎
آتنا کہ اذنِ شورش و فریاد دیجئے مجھکو سوال کی نہ ضرورت جواب کی
"آتنا" کے بے ڈھنگے پن پر نہ جائیے۔ غالبًا اصغر صاحب کا تکیہ کلام ہے۔ لہذا حشو کا الزام عائد نہیں ہوتا
یہ بھی آپ حضرات یاد رکھیں کہ مضراب اور زخمہ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، ان کو مرادف سمجھنا سخت غلطی ہے
؎ مضراب محبت سے اک زخمہ لا ہوتی پھر جوش ترنم سے بیتاب رگ جاں ہے
"طفلکِ عالم" غالب کے "برخوردار بستر" کا چھوٹا بھائی ؎
ہستی غیب سے گہوارۂ فطرت جنباں خواب میں طفلکِ عالم ہے سراسر مدہوش
یہ شعر اصغر صاحب نے ناسخ کی طرح اس لئے کہہ رکھا ہے۔ کہ امتحانًا سنا ہیں اگر کوئی بے سوچے سمجھے تعریف کر دے تو بیاض بند۔
حسنِ رہگزر کی تعریف۔ غالبًا مرزا احسان احمد صاحب کی مُراد "بازاری فتنہ گر" سے کچھ اور ہے ؎
حقیقت ایک ہے صد ہا لباس رنگین میں نظر بھی چاہیئے کچھ حسنِ رہگزر کے لئے
یہ سمجھ لیجئے تو جائز ہے ورنہ "بابا گنا ہگار ہوگا"
لذیذ عذر۔ لذت نظر ؎
بتوں کے حسن میں بھی شان ہے خدائی کی ہزار عذر ہیں اِک لذتِ نظر کے لئے
سچ ہے لکھنو والے ایسی گراں پایہ سوقیت ایسا بلند رتبہ ابتذال کہاں سے لائیں۔ ملاحظہ فرمایئے
عشق متبسم (ت ساکن) بھی ہوتا ہے ؎
عشق متبسم کہ یہ راز جہاں کی کائنات عقل سرگرداں کہ ہر ذرہ جہان راز ہے
آپ جانتے ہوں گے کہ "بے جگری" بزدلی کی مرادف ہے، مگر یہی لکھنو سے باہر کسی میں ہو تو کچھ سے کچھ اور قابل تحسین و آفرین ہو جاتی ہے ؎
نہ مدعا کوئی میرا نہ کچھ ہراس مجھے کہ عاشقی ہے فقط بے دلی و بے جگری
مدعا نہ ہونے سے بیدل ہوئے۔ اور ہراس نہ ہونے سے بے جگر، سبحان اللہ!

اور سنیئے اور ایسی شرمناک ناکامی کو اس فخر کے ساتھ علانیہ بیان کرنے کی داد دیجئے ؎

کچھ نہ ہم سے ہو سکا اس اضطراب شوق میں　　ان کے دامن کو مگر اپنا گریبان کر دیا

لکھنو کی تمام سوقیت تمام ابتذال تمام بوالہوسی۔ تمام نفس پرستی و فحاشی ایک طرف اور یہ شعر ایک طرف جس کی بہترین تنقید یہ مثل ہے "کھسیانی بلی کھمبا نوچے"! ایک شعر اور شامل کر دیجئے تو سوقیت بھی کانوں پر ہاتھ رکھ کے بھاگ کھڑی ہو ؎

کچھ غنیمت ہوگئے یہ پردہ ہائے آب و رنگ　　حسن کو یوں کون رہ سکتا تھا عریاں دیکھکر

حسن عریاں ہے۔ اور ایسی حالت میں جس کی طرف شاعر نے پردہ ہائے آب و رنگ سے اشارہ کیا ہے۔ انہیں موانع کی وجہ سے فاعل کو مجبوراً اپنی خواہشات کی باگ ڈور روکنا پڑی ورنہ ؏

حسن کو یوں کون رہ سکتا تھا، عریاں دیکھکر

حسن کی یہ نمائش اور رسوائی، اس بے حیائی اور بے حجابی پہ ناپذیرائی کا یہ عذر کہ "پردہ ہائے آب و رنگ حائل تھے" جن کے لئے ہے اُن کو مبارک رہے۔

اور سنئے ؎ دل میں ایک بوند لہو کی نہیں رونا کیسا　　اب ٹپکتا نہیں آنکھوں سے گلستان کوئی

یہ رونا لفظاً و معناً دونوں طرح مصنوعی ہے۔ کیونکہ یہ نوحہ گری مستعار ہے۔ اور ظہوری کی رُوح کو تڑپاتی ہوگی جو کہہ گیا ہے ؎

نظارہ راز خونِ دلم گل در آستین　　خونش مگو، بگو کہ زچشمِ چمن چکید

غالب کہتا ہے ؎ مستانہ طے کروں ہوں رہ وادیٔ خیال　　تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے

اصغر صاحب فرماتے ہیں ؎

مستانہ کر رہا ہوں رہ عاشقی کو طے　　کچھ ابتدا کی ہے نہ خبر انتہا کی ہے

اور یہی غالب و مومن و حسرت و اقبال سب پر فضیلت لے گئے!

تان اس شعر پر ٹوٹتی ہے ؎

مطرب فتنہ نوا نغمۂ پُر درد نہ چھیڑ　　نکلا پڑتا ہے مرے سینہ سے باہر کوئی

دوسرے مصرع پر ہنسئے یا روئیے، سب روا ہے، ادب اردو میں اس کے آگے ترقی یا تنزل کی گنجائش نہیں۔

مرزا احسان احمد صاحب جیسا پیشتر ہو چکا ہے۔ فرمائیں گے کہ اصلی درد و سوز و گداز اور چیز ہے۔ جو لکھنؤ والوں کے حصہ میں نہیں آیا۔ وہ فقط رونا پیٹنا جانتے ہیں۔ اور غیر لکھنوی رقص و سرود و مستی میں

سرشار ہیں۔ ان کا رونا بھی گریۂ مستانہ ہے۔ میں عرض کرونگا کہ یہی رونا ہے۔ تو لکھنؤ والے اس سے محروم ہی اچھے۔

یہانتک اُن حملوں کا جواب تھا جو مرزا احسان احمد صاحب نے بلا کسی اشتعال کے لکھنؤ والوں پر کئے۔ اب میں حضرت دلؔ کے بعض اشعار کے متعلق اپنا خیال ظاہر کرتا ہوں۔ ان کی شاعری پر مفصل بحث کے لئے نہ تو میں اہلیت پاتا ہوں نہ اتنی فرصت ہے۔

یہ بھی عرض کردوں کہ گفتگو منتخب اشعار سے ہوگی ورنہ حضرت دلؔ کے کلام میں جہاں جواہر پارے ہیں۔ سنگریزے بھی ہیں۔ محاسن کے ساتھ لغزشیں بھی ہیں۔ البتہ یہ چیزیں خال خال ہیں اور خوبیوں کی افراط ہے۔ اگر میرا یہ بیباکانہ قول اُنہیں یا اور کسی صاحب کو ناگوار ہو۔ تو میری بدقسمتی۔ اس کا اظہار نہ کرنا دیانت کے خلاف تھا۔ اصل یہ ہے کہ کسی بشر کا کلام ایسے تسامحات سے پاک نہیں ہو سکتا۔

حضرت دلؔ کا شعر ہے ؎

اثرِ عشق سے ہوں صورتِ شمع خاموش یہ مرقع ہے مری حسرتِ گویائی کا

دیکھئے اچھے شعر میں کتنے پہلو خوبیوں کے ہوتے ہیں۔ عشق و شمع دونوں میں سوز و گداز ہے، عشق جب رگ و پے میں ساری ہو کر درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے تو ہر جذبے کو حتیٰ کہ حسرت گویائی کو بھی اپنے سوز و گداز میں شامل کر لیتا ہے۔ پھر وہ منزل آتی ہے جس میں ہر حسرت و ارمان کا خلاصہ ایک داغ ہوتا ہے، شمع میں فسردہ اور عشق میں فروزاں۔ شمع میں نمایاں اور عشق میں پنہاں۔ شمع جب تک جلتی ہے خاموش نہیں سمجھی جاتی، عشق ہر حال میں خاموش ہے۔ شمع میں قوت گویائی مفقود ہے۔ مگر زبانِ حال سے حسرت گویائی کا اظہار کرتی ہے۔ عشق کو گویائی کا مقدور ہے تاہم مُہر بر لب ہے۔ شمع سرِ محفل جلتی ہے۔ غیرتِ عشق اس ننگ کو گوارا نہیں کرتی اور عشق اندر اندر ہی جلتا ہے۔ شمع کے جلنے میں غرور و سرکشی کا پہلو نمایاں تھا جس پر متنبہ ہونے پر اشکِ ندامت بہائے اور رشتۂ جان جلایا۔ پھر بھی بجھنے پر ایک کھلا ہوا داغ رسوائی رہ گیا۔ عشق سراسر جذبۂ نیاز و فناوگی ہے جس میں نمائش کو دخل نہیں۔ شمع جس منزل پر جلنے کے مراحل طے کر کے پہنچی۔ عشق نے انہیں ابتدا ہی میں ختم کیا۔ شمع جب تک جلتی رہی ضبطِ نفس ممکن نہ ہوا، کانپی بھی، تھرائی بھی۔ تن بدن میں سنسنی بھی رہی۔ عشق جلا اور پوشیدہ جلا۔ اور اس احتیاط کے ساتھ کہ ع دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا۔ بلاغت کا معجزہ دیکھو کہ سوزِ عشق کا تفوق سوزِ شمع پر اس طرح بھی ثابت ہو گیا کہ ناقص طور پر جلنے والی شمع سے عشق کے سوزِ کامل کو سمجھانا چاہا۔ کیونکہ عشق اپنی مثال آپ ہے۔ قریب ترین صورت شمع کی تھی اسی کے پردے میں شاعر نے سوزِ عشق کی چیرہ دستیاں بیان کرنا چاہیں ؎

حسنِ خود بیں کو ہُوا اور سوا نازِ حجاب شوق جب حد سے بڑھا چشمِ تماشائی کا
اس شعر میں جو خاص لطف ہے یہ ہے کہ نازِ حجاب کے اظہار کا اور کوئی طریقہ ہی نہیں سوا اس کے کہ حجاب میں اضافہ ہو۔ یہ ایسی انوکھی حقیقت ہے جس کی طرف غالباً حضرت دِل پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اشارہ کیا۔ مطلب یہ ہُوا کہ جتنا عاشق کا شوق دید بڑھتا ہے حسنِ خود بیں کا حجاب بڑھتا ہے کیونکہ اتنا ہی اپنی تجلیوں کے مشاہدہ میں سرگرم ہوتا ہے تجلیوں کا حلقہ وسیع ہو جاتا ہے اور محویتِ حسن ہر جلوے کو حجاب بنا دیتی ہے ؛

نعت میں یہ شعر بہت ہی خوب ہے ؎
اُدھر سے آنے والو میں بھی مشتاقِ زیارت ہوں ذرا تم پائے خاک آلود آنکھوں سے لگا دینا
نشستِ الفاظ ایسی ہے کہ ایک ایک لفظ سے اشتیاق ٹپکتا اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ احترام ہے کہ زیارت سے مشرف ہونیوالوں کے قدموں کو آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں اور ان کی خاکِ پاکو توتیائے چشم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ اعتقاد ہے کہ اِس خاک میں وہ تاثیر ہے کہ درمیان سے حجاب اُٹھ جائیں گے اور منزلِ مقصود پیشِ نظر ہو جائے گی۔ یا اُن قدموں کا آنکھوں پر رکھ لینا اور ان کی خاک آنکھوں سے لگا لینا اُس ارضِ پاک کی زیارت کے برابر ہے کیونکہ وہاں کے فیض نے اُسے بھی پاک و مطہر کر دیا ہے ؎
ہر دم ہے اپنی محوِ تغافل کا تصوّر عشق اور کسی کام کے قابل نہیں رکھتا
اس شعر میں نفسیات کا یہ نازک مسئلہ حل کیا ہے کہ ایسے تصوّر میں جو کسی محوِ تغافل کا ہو صرف شانِ تغافل ہی غالب و نمایاں ہوگی یعنی اور کسی ادا یا کیفیت سے بھی محروم ہیں۔ ایسی صورت میں دوسرا مصرع۔ عشق اور کسی کام کے قابل نہیں رکھتا۔
اپنے دامن میں ایک دنیائے معنی لئے ہوئے ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اس شان کا مصرع جو حسن سے اس قدر لبریز ہو وہ شخص جو زبانِ لکھنؤ کا لذّت کش نہ ہو نہیں کہہ سکتا ؛
شرع میں حکم ہے کہ دعا رو رو کے مانگنا چاہیئے۔ اس کا فلسفہ کس خوبی سے نظم ہُوا ہے ؎
تا بابِ اثر اس کا پہنچنا ہے یقینی گریہ بھی معاون ہے غریبوں کی دُعا کا
غریبوں کے لفظ نے وہ تمام سامان مہیّا کر دیا جو دُعا و گریۂ بے اختیار کے لئے ضروری ہے ؛
اس غزل کا یہ شعر اپنی سجاوٹ اور معنی دونوں لحاظ سے بہت حسین ہے ؎
گو نذرِ فنا ہو گئی پروانوں کی ہستی روشن ہے مگر نامِ شہیدانِ وفا کا
اس میں یہ شاندار رس بھی ہے کہ وہ فنا جو نام روشن کر دے ہستی سے بہتر اور بقا کی ضامن ہے ؛
ایک شعر جو اپنے رنگ میں بے مثل ہے ؎

یہ بھیگی رات، یہ ٹھنڈا سماں، یہ کیفِ بہار   یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اُٹھ کے جانے کا

مرزا احسان احمد صاحب کو اس میں مادّی وصل اور ابتذال کا پہلو نظر آتا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ عاشق کی آرزو کی انتہا نہیں اور نہ معلوم کتنے منصوبے دل سے باندھا کرتا ہے۔ یہ اس کا تصور ہے جس نے معشوق کو جو ان سب رعنائیوں کی جان ہے پہلو میں لا بٹھایا ہے اور راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں۔ دلیل میں خود حضرتِ دل کا ایک اور شعر سُن لیجئے ؎

وہم باطل تھا مگر وہ منظرِ عیش و نشاط   پہلوئے عاشق میں ہنگام سحر کوئی نہ تھا

اندازِ بیان کی نُدرت جس نے صحیح مفہوم میں جوش و خروش پیدا کیا ہے ؎

ہر دم وہ نگاہِ گرم ساقئ خوش خو   ہر جام پہ وہ نعرۂ مستانہ کسی کا

یہ جام کیا ہے؟ وہی ساقی کی نگاہ کرم! ساقی کے ساتھ لفظ خوش خو نے شعر کا معیار جس قدر بلند کیا ہے۔ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

ایک شعر میں اشکوں کو "بہار کا نقشہ" کہا ہے۔ یہ شعر منظر اور جذبہ دونوں کی محاکات عجب خوبی سے کرتا ہے ؎

بہلا رہے ہیں اپنی طبیعت خزاں نصیب   دامن پہ کھینچ کھینچ کے نقشہ بہار کا

خزاں نصیب آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے گھُٹنے سے سر جھکائے بیٹھے ہیں آنکھ سے کچھ آنسو جن میں خونِ تمنا شامل ہے ٹپکتے ہیں اور بہار کے نقشہ کا خاکہ تیار ہو جاتا ہے، اس کے بعد اور نقش و نگار بنائے جاتے ہیں۔ غنچے، شگوفے، اشکوں میں پانی کا جزو کم ہوتا جاتا ہے اور خون کا حصہ بڑھتا جاتا ہے۔ آخر میں چند قطرے خونِ ناب کے گلہائے تازہ شگفتہ بن کر ٹپک پڑتے ہیں اور بہار کا نقشہ تیار ہو جاتا ہے ؀

روح کا اپنی تمام رعنائیوں میں نمودار ہونا ترک لباس ہستی پر منحصر ہے اور یہ مدعا عشق کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا ؎

اے دلؔ یہ چند روزہ ترکیب جان و تن تھی   ترک لباس ہستی عاشق کا مدعا تھا

کوچۂ یار میں مٹنا محبت کی یادگار قائم کرنا ہے ؎

کوچۂ یار میں مٹنا مگر اک شان کے ساتھ   خاک ہونا تو محبت کا نشاں ہو جاتا

لفظ شان نے امتیازی صورت پیدا کر کے محبت کا نشاں ہو جانا ثابت کر دیا۔

عشق مجازی و حقیقی میں یہ فرق ہے کہ مجازی عشق کو لاکھ پاک و بے لوث ہو سہارے اور وسیلے کی ضرورت ہے، بخلاف عشق حقیقی کے جس میں بجائے خود مستی و سرشاری ہے اور قید سبو و ساغر سے مبرا ہے ؎

جو مست حقیقی ہیں خمخانۂ الفت میں ان کو کبھی پیمانہ درکار نہیں ہوتا

یہ تین شعر آبِ حیات کے گھونٹ ہیں ؎

ہائے وہ دل کہ جس نے بے سمجھے تیرے وعدے کا اعتبار کیا
وقتِ رخصت تسلیاں دے کر اور بھی تم نے بے قرار کیا
تیرے مشتاق اور منتظرِ حشر کس قیامت کا انتظار کیا

آخری شعر کی نشست الفاظ بتاتی ہے کہ مشتاقوں کو قیامت کا جو تصور تھا اُس کے خلاف وقوع پذیر ہوُا۔ یہ دیدار کو حشر سے تعبیر کرتے آئے تھے لیکن وہاں بھی سامنا نہ ہوُا لہذا حشر محض ایک ہنگامہ زار بن کر رہ گیا۔ اگر معلوم ہوتا کہ حشر سے یہی مراد ہے تو انتظار کیوں کرتے، ایسے ہنگامے دنیا میں ہر روز برپا کر سکتے تھے، افسوس کہ کس قیامت کا انتظار کیا۔

طرزِ نگاہ یار کو "نازک پنکھڑی" یا افسانۂ دل میں ایک نئے ٹکڑے کا اضافہ کہنا جس قدر جدید ہے اُسی قدر لطیف ہے ؎

یاد ہے، ہاں یاد ہے، طرزِ نگاہ مستِ یار ایک نازک پنکھڑی سے پارہ پارہ دل ہوُا
چلتے چلتے کس نظر سے اُس نے دیکھا، کیا کہوں دل کے افسانہ میں اک ٹکڑا نیا شامل ہوُا

مست کہہ کر پنکھڑی میں رنگینی پیدا کر دینا، یا پارہ پارہ کہہ کر دل کے ہر ٹکڑے کو نگاہ کی طرح پنکھڑی میں منتقل کر دینا شاعری کا سحر ہے۔ اسی طرح معشوق کی آخری نگاہ کو جو دیگر تاثرات سے علیحدہ اور غیر متوقع طور پر چلتے وقت افسانۂ دل میں شامل ہو گئی "نیا ٹکڑا" کہنا وہ اختراعات ہیں جن تک نقلی یا نقالی شاعروں اور ان کی سنگت کے نقادوں کی جو رقص و مستی کے مدعی ہیں نظر بھی نہیں پہنچتی، وہ ان لطائف کو سمجھ ہی نہیں سکتے ؎

اُس کی ہمت اب اگر پامال کر ڈالے کوئی خاک ہو جانا محبت میں ہمارا کام تھا

یہ خاک وہ ہے جس کو بڑے بڑے جابر پامال کرنے کا نپتے ہیں عشق کی یہ منزلت ہمیشہ ان لوگوں کی نگاہ سے مخفی رہے گی جو ہرزہ گفتاری کو رقص و سرود و جوش و مستی کا مرادف سمجھے ہوتے ہیں ؎

معمورِ تجلی ہو تحیر کا اثر آج آئینہ بنا دے مجھے اے ذوقِ نظر آج

حیرت میں تجلی پیدا کرنا اور ایسی تجلی جو مشتاق کو سراپا آئینہ بنا دے ذوقِ نظر کی معراج ہے ؎

پھر ذوقِ خلش مشغلۂ اہلِ وفا ہے کرنا ہے ابھی خون تمنا کوئی دن اور

ذوقِ خلش سے وابستگی بھی اہلِ وفا میں گناہ ہے کیونکہ آلودگی تمنا کی دلیل ہے۔ تمنا کا شائبہ باقی ہے لہذا

ع کرنا ہے ابھی خونِ تمنا کوئی دن اور

میں نے سامنے کا مطلب چھوڑ دیا کہ اہلِ وفا کو ذوقِ خلش کا مشغلہ اس لئے ہے کہ ابھی کچھ دن اور خونِ تمنا کرنا چاہیئے۔ دونوں مطالب میں نازک فرق ہے ؂

ایک مزے کا شعر بھی سنتے جایئے ؎

او عہد شکن حشر میں بھی وعدۂ فردا　　آنے کو ہے اس دن کے سوا کیا کوئی دن اور

دوسرے مصرع کا انداز بتاتا ہے کہ اگر ایسا ہو۔ تو اعتمادِ عشق اس کے لئے بھی تیار ہے ؂

ایک ایسا شعر جس کا مفہوم عام ہے مگر طرزِ ادا نے عجب لطف پیدا کیا ہے ؎

حضورِ یار شکووں کا تو کیا ذکر　　گراں ہے مدعائے دل زباں پر

گراں کا صرف استادانہ ہے ؂

آدمی یہاں تک تو حریصِ لذتِ آزار ہو ؎

اف رے جنوں کا جوش کہ تلووں کے آبلے　　دیوانہ وار ٹوٹ پڑے نوکِ خار پر

معشوق کا سامنا، شوق کی بیتابیاں اور بجبوریاں، نگاہ سے شرحِ آرزو کی ناکام التجا، خدا کی پناہ! ؎

تو ہی نگاہِ شوق کر اظہارِ مدعا　　جو دل میں ہے وہ آ نہیں سکتا زباں پر

ہوائے چمن کو چھیڑ اور چھیڑ کو تحریکِ پرواز کہنا کس قدر دلکش اندازِ بیان ہے ؎

چھیڑتی ہے عبث ہوائے چمن　　اب کہاں ہم میں ہمتِ پرواز

اسی طرح حقیقت کو حسن اور مجاز کو زینتِ حسن کہہ کر بے حقیقت اور فریب کہنا کس قدر لطیف پیرایہ ہے ؎

زینتِ حسن بے حقیقت ہے　　ہو نہ آلودۂ فریبِ مجاز

محرومِ اثر ہونے پر بھی نعرۂ مستانہ سے باز نہ رہنا عشق کی وہ حدیں ہیں جن تک بہت کم شاعروں کی رسائی ہوئی ہے ؎

نہ سنے کوئی مگر اے دلِ محرومِ اثر　　پھر اسی جوش سے اک نعرۂ مستانۂ عشق

اس شعر میں مصرعوں کا ربط دیکھئے، یہ لکھنؤ والوں کے سوا کسی دوسرے کو آ ہی نہیں سکتا ؎

ہزاروں حسرتیں لیکر چلے ہیں جانبِ منزل　　نہیں معلوم پہنچیگا ہمارا کارواں کب تک

اس شعر میں لکھنوی شاعری معشوق بنکر مجسم ہو گئی ہے ؎

وہ بانکپن، وہ شوخ ادائیں کہ الاماں　　ناوک برس رہے ہیں کہاں بچ کے جائے دل

اسی معشوق کو دوسرے روپ میں بھی دیکھ لیجئے ؎

چشمِ جاناں کا یہ ایما ہے ستم ڈھائینگے ہم — جانِ عاشق کہہ رہی ہے آج مٹ جائینگے ہم

یہ درجہ وہ ہے جہاں حسن و عشق ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہو گئے ہیں کہ مساوات قائم ہو گئی ہے ۔

اس غزل کا یہ شعر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے ؎

کس قدر دلچسپ ہوگا منظر ناز و نیاز — تیر برسائیگا کوئی، پھول برسائینگے ہم

اس قرب و آشناسی کے بعد حسن و عشق کا امتیاز مٹ کر تمام عشق حسن اور تمام حسن عشق ہو جاتا ہے ؎

ادائے حسن نگارش ہوں، نیازِ عشقِ کامل ہوں — کہیں میں نکہتِ گل ہوں، کہیں شورِ عنادل ہوں

انسان کی عظمت، اللہ اکبر! ؎

مٹانا ہے مجھے کچھ سوچ کر نقاش خود لے دل — بیاضِ عالمِ ایجاد پر وہ نقشِ باطل ہوں

انسان کو خدا سے اس قدر قریب کر دینا کہ اس میں بھی شانِ خدائی نظر آئے، جو باطل ہے۔ مگر اس شان کا حقیقت سے اس قدر مشابہ ہونا کہ خدا "احسن تقویم" کو مٹا دینے ہی میں مصلحت سمجھے شاعر کا وہ شاندار کارنامہ ہے جس پر زبان و بیان جس قدر فخر کرے بجا ہے۔ اور یہ سب کرشمہ لفظ وہ کا ہے جو نقشِ باطل کے قبل آیا ہے ۔

یہ دو شعر بھی جو لکھنؤ کی طرز سے واقف نہ ہو نہیں کہہ سکتا۔ زبان کی تیغ ہے کہ بجلی کی طرح کوند رہی ہے اور کیسی تڑپتا ہے ؎

دمِ گریہ خلش افزا ہے جو ہر سو دل میں — اتر آیا ہے کوئی آنکھ سے آنسو دل میں
ایک ہی نور سے ہوں ظاہر و باطن روشن — تیرا انداز نگاہوں میں رہے تو دل میں

ان تین شعروں پر تغزل کو جس قدر ناز ہو زیبا ہے ؎

نہ وہ آرامِ جاں آیا، نہ موت آئی شبِ وعدہ — اسی دھن میں ہم اٹھ اٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں
ادھر انداز بے مہری جو پہلے تھا وہ اب بھی ہے — ادھر یہ حال جب دیکھو پسِ دیوار بیٹھے ہیں
ہم اٹھتے ہیں تو اٹھتے ہیں غبارِ راہ کی صورت — جو بیٹھے ہیں تو محوِ شوخیِ رفتار بیٹھے ہیں

اس شعر کی تازگی و لطافت صرف اہلِ ذوق کے لئے ہے ؎

کوئی لیلیٰ شمائل جلوہ فرما ہونے والا ہے — مری آنکھوں کے پردے شکلِ محمل ہوتے جاتے ہیں

ایک لفظ محمل سے نقشِ پا کو نطق سے اس قدر قریب کر دینا کہ انسان گوش بر آواز ہو جائے شاعری کی بیحد مؤثر و درس آموز کرامات ہے ؎

ذرّے ذرّے میں ہے پنہاں از سعیٔ ذوقِ نگاہ　　　سُن! زبانِ حال سے کچھ نقشِ پا کہنے کو ہیں

مقطع بھی نقل کئے بغیر دل نہیں مانتا ؎

آخری طعنے مبارک ہوں ضمیرِ جاں بلب　　　اب کوئی دم میں وہ تجھ کو بتانے کہنے کو ہیں

ذیل کا مطلع وہ ہے جس کا مطلب بیان کرنے کو ایک دفتر درکار ہے، خاص خوبی یہ ہے کہ چونکہ افسانے میں بلا تکلف و تصنع درد پیدا ہو گیا ہے لہٰذا۔ تو تڑپنے میں باک ہے اور نہ تڑپانے میں۔ نہ یہ فعل کسی مطلب یا آرزو کا تابع ہے نہ [illegible]۔ اب [illegible] دوسرا مصرع [illegible] کرنا نہ تو منافیٔ شانِ عشق ہے نہ خلافِ آدابِ حسن ؛

سُنئے اور تڑپئے ؎

اب تڑپنے میں تکلف ہے نہ تڑپانے میں　　　عشق نے درد بھرا ہے مرے افسانے میں

حسنِ مطالب کے علاوہ اس شعر کا بےساختہ پن قیامت ڈھا رہا ہے ؎

بڑھ گئی بیخودیٔ شوقِ طلب جب حد سے　　　ہم نے گھبرا کے پکارا انہیں بتخانے میں

مَیں تھک گیا اور نون کی ردیف بھی ختم نہیں ہوئی۔ گو بلا مبالغہ بیسیوں عمدہ شعر بنصرے سے رہ گئے۔

مضمون تشنہ ہے مگر مجبوراً یہیں پر ختم کرتا ہوں ؛

مَیں نے جو کچھ دوسروں کی مخالفت میں لکھا ہے ان کی دل آزار باتوں کا جواب ہے اور اُسی تلخ لہجہ میں، یہ حصّہ مضمون کا انہیں تک محدود ہے۔ حاشا او رکسی کی طرف روئے سخن نہیں ہے۔ آخر میں ایک مخصوص انتخاب نغمۂ دل کا شامل کیا جاتا ہے۔ اس سے وہ شعر نکال دیئے گئے ہیں۔ جن پر تبصرہ ہو چکا ہے ؛　　　(اثرؔ)

مختصر انتخاب نغمۂ دل

کیا جانے کس خیال سے چھوڑا بحالِ زار　　　مجھ پر بڑا کرم ہے مرے چارہ ساز کا

وہ اپنے مجرموں کو دیکھ کر مُنہ پھیر لیتے ہیں　　　اگر لے دل اُنہیں منظور ہوتا ہے سزا دینا

نیا منظر دکھاتا ہے ہمیشہ جوشِ غم میرا　　　طریقِ عشق میں پہلا قدم ہے ہر قدم میرا

خاموش دلِ زار! تہ خنجرِ قاتل　　　شکووں کا ہے یہ وقت کہ تسلیم و رضا کا

نارسائی کا سبب کیا ہے؟ یہی جوشِ طلب　　　بڑھ گئے ہم اس قدر آگے کہ رہبر رہ گیا

قفس میں بھول گیا ہم کو لطفِ آزادی
خیال تک نہیں آتا اب آشیانے کا

جب کوئی آیا تو آئی قالبِ بے حس میں جاں
جب کوئی پہلو سے اُٹھا حشر برپا ہو گیا

دلِ ناکام کاش اُس بانیٔ بیداد کے در پر
خدا کا نام لے کر پھر مقدر آزما ہوتا

تھا تذکرۂ حسن بھی اس ضمن میں شامل
وہ غور سے سنتے رہے افسانہ کسی کا

اے چارہ ساز وجہ خلش بن گیا وہی
اب تک سکون تھا جو دلِ بیقرار کا

گوارا حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا
ذرّوں میں کوئی ذرّہ بیکار نہیں ہوتا

سمجھا ہوں اس کو منزلِ مقصود کی دلیل
دل ہے کسی کے نقشِ قدم پر مٹا ہوا

وہ بھی کیا دن تھے کہ ہر ایذا ہمیں تھی خوشگوار
خوں چکاں جو آبلہ تھا اِک چھلکتا جام تھا

مصیبت ہے ادھر جوشِ طلب بڑھتا ہی جاتا ہے
اُدھر منزل کا مایوسی کی حد تک دُور ہو جانا

حقیقت میں وہ اک نیرنگیٔ بحرِ محبت تھی
نہ موجیں تھیں نہ طوفاں تھا نہ کشتی تھی نہ ساحل تھا

رہنما کی کیا ضرورت عشق کامل چاہیئے
دل جہاں تڑپے سمجھ لینا یہی ہے کوئے دوست

کب تک شبِ غم کوئی بدلتا رہے پہلو
تسکین کی صورت نہ ادھر ہے نہ اُدھر آج

ہو گئی رخصت چمن سے فصلِ گُل
کیا اُداسی ہے در و دیوار پر

ہیں انہیں کے یہ کرشمے مگر انداز جُدا
عشق دل سوز کہیں، حسن فسوں ساز کہیں

کوچۂ عشق میں ہر ذرّہ دل ہے پامال
جو وفادار ہیں مٹ کر بھی وفا کرتے ہیں

مثالِ نعرۂ منصور جوش پیدا کر
عبث ہے شورِ انا الحق جو حکمِ دار نہ ہو

اٹھے تو محوِ تمنا، ملے تو غرقِ نیاز
نگاہِ شوق کو فکرِ مآل کار نہ ہو

جو بے بسی کبھی بڑھ جائے قلبِ مضطر کی
کرشمۂ نگہِ فتنہ زا کو یاد کرو

تسکینِ روح و قلب ہے پیکانِ آرزو
بسمل خلش پسند ہیں، قربانِ آرزو

اللہ رے کیفِ مے، ہے اور ہی عالم میں
معراج تھی بیخودی کی اک لغزشِ مستانہ

دب نہیں سکتا ہے اب غنچوں کا جوشِ انبساط
رک نہیں سکتی ہے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی

کہاں کا لطف مجھ پر غنچہ و گل نے غضب ڈھایا
بہار آئی تو شاخیں جھک گئیں میرے نشیمن کی

عمر بھر رویا کریں گے دِل کو ہم
اب کہیں یہ نوحہ خوانی جائے گی

کوئے دلبر میں ٹھہرنا تھا محال
کام آئی آج حیرانی میری

کہئے تو ہم کہہ دیں عرشِ بریں کو مقامِ دوست
ہمت مگر کچھ اور ہے اپنے خیال کی

ہر ذرّہ خاکِ دل کا اِک روحِ مستقل ہے — مٹنا رہِ وفا میں ہے زندگی ہماری

ذرہ نواز اُن کی طبیعت نہیں رہی — اب خاک میں بھی ملنے کی حسرت نہیں رہی
برپا ہوا ہے حشر بس اتنی سی بات پر — اک نالہ کش کے بس میں طبیعت نہیں رہی

اُن کے در پر جس کو دیکھا شاداں دیکھا خنداں دیکھا
جانتے ہیں اب ہم بھی اے دل تیری میری دیکھا دیکھی

ممکن نہیں ہے جلوۂ خودبیں کو دیکھنا — کچھ ہمتِ نگاہ تو پیدا کرے کوئی

قربان ہو کے آج کسی کی نگاہِ شوق — زینت فزائے حسنِ خداداد ہو گئی

تلاشِ یار میں خود کھو گئے مگر اے دل — یہ حوصلہ ہے ابھی اور جستجو کرتے
کھینچے شبیہ تو یہ دلکشی بھی پیدا ہو — کہ ہو بہو نظر آئیں وہ گفتگو کرتے
دیا تھا عشق تو ہمت بھی یہ خدا دیتا — کہ ایک وقت میں ہم ترکِ آرزو کرتے

کوئے الفت میں دل کے مٹنے سے — مدعا ترکِ مدعا بھی ہے

عالم سے جدا زندگیٔ اہلِ وفا ہے — دنیائے محبت میں فنا ہے نہ بقا ہے
کس وہم میں ہیں توڑنے والے مرے دل کے — یہ عہدِ محبت ہے یہ پیمانِ وفا ہے
کیا جانیے سمجھا اُسے کیا میری جبیں نے — عالم کی نگاہوں میں جو نقشِ کفِ پا ہے

نگہ لطف سے محروم نہ کر اے ساقی — شیشے نہ ٹوٹنے دے کہ جام سے پینے کے لئے

ہم سرِ منزل گرے غش کھا کے یہ تو یاد ہے
کیا خبر کس نے اُٹھایا، کب اُٹھے کیوں کر اُٹھے

شرحِ الم بجا ہے مگر اے دلِ حزیں — ہمت بقدرِ طاقتِ گفتار چاہیئے
رہتا ہے روز تازہ مصیبت کا سامنا — ہر وقت اِک نیا مجھے غم خوار چاہیئے

اے ضبط الوداع کہ گھبرا رہا ہے جی — اے صبر الفراق کہ اب دورِ حشر ہے

کدھر سے آئی دمِ امتحان یہ اُف کی صدا — شکستِ دل کا مجھے احتمال ہوتا ہے

آہ سینے میں گھٹے اُف نہ زباں سے نکلے — درد اس حد سے گزر جائے تو رسوائی ہے

اُف کی جگہ نکلتی ہے ہر بار آفریں — کیا زخم ہم زبان ترے خنجر کے ہو گئے

کیا جانے کس خیال میں ہیں مست مے پرست — دنیا یہ جانتی ہے کہ مخمور ہو گئے
جھگڑا تو روز ٹھوکریں کھانے کا مٹ گیا — اچھا ہوا کہ خاک نشین خاک ہو گئے

روتے روتے ہو گئے چپ شامِ غم — یہ ہماری آخری فریاد ہے
طے ہو کیونکر جادۂ مہر و وفا — ہر قدم پر اک نئی اُفتاد ہے
کیا خطر طوفانِ بحرِ عشق سے — اب تو لب پر ہرچہ بادا باد ہے

بن چکے دل کی تمنا کر چکے وہ دل میں گھر — اب حیا آتی ہے اُنکو سامنے آتے ہوئے

جان آدھی رہ گئی ہے اب ہوا پلٹی تو کیا — ہنس پڑے بادِ صبا پر پھول مرجھاتے ہوئے

کیوں نہ ہو وہ چشم کیف افزا نشاطِ زندگی — بھر دیا پیمانۂ دل روح پرور جام نے

مصیبت ہے نگاہِ شرمگیں سے واسطہ دل کا
نہ آہ سرد بھرنے دے نہ منہ سے اُف نکلنے دے

دل آشنائے جلوۂ جانانہ چاہیئے — ہر سانس ذکرِ غیر سے بیگانہ چاہیئے
نظارہ سوزِ شمعِ تجلی سہی، مگر — تقلیدِ گرم جوشیِ پروانہ چاہیئے

پھر ہوا جوش سے سر آبلۂ دل لبریز — پھر اُبھارا خلشِ بادیہ پیمائی نے

گم اپنی حقیقت ہے ترکیبِ عناصر میں — یہ پیرہنِ ہستی پردا نظر آتا ہے

اے غم نصیب دل تیرے شکوے بجا، مگر — سب کا جواب اک نگہِ شرمسار ہے

دامانِ دل میں جوشِ تمنا لئے ہوئے — آیا ہوں اک تلاطمِ دریا لئے ہوئے

وہ ناکامِ تمنا ہوں وہ برگشتہ مقدر ہوں
سرِ منزل اگر پہنچوں تو منزل دور ہو جائے

گو پردہ اُٹھا پھر بھی حیران ہوں کہ کیا دیکھوں — احساسِ نظر گم ہے اب جوشِ تمنا سے
اشکوں کی روانی ہے روداد وفا گویا — خاموش یہ شکوے ہیں اک شاہدِ رعنا سے

مٹا کے ہستیِ دل صرفِ مدعا کرتے — یہیں سے سعیِ طلب کی ہم ابتدا کرتے

افسردہ دل ہوں مَے سے سروکار بھی نہیں — لیکن وہ جام دیں تو کچھ انکار بھی نہیں

روز آ آ کر تسلی دل کو دے جاتا ہے کون — کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ سمجھاتا ہے کون

دل کو تھا شوقِ فنا، خاک ہوا آخر کار — مگر اس خاک کے ذرّوں سے محبت نہ گئی

(خانصاحب نواب جعفر علی خاں اثر بی۔اے ڈپٹی کمشنر ضلع ہردوئی)

اور اگر جدید سائنس کی جدید تحقیقات کا یہ نظریہ مدِنظر رکھیں۔ کہ ہر چیز ذی حس ہے۔ خواہ وہ درخت ہو یا پتھر تو جس وقت کسی سل کو تراشتے ہیں۔ اور لوہے کی چھینی ہتھوڑی کے زور سے اس پر ضرب و زخم لگاتی ہے۔ وہ اس سے بسبب احساس و جذبات تپش و حرارت کا اظہار ہوتا ہے یعنی شرارے اُڑتے ہیں۔ تو وہ سل ایک مستقل و بہترین شاعر ہے۔ جو سنگلاخ زمین میں شعر کہتی ہے۔ جبر یہ نتائج تو اُن عبارتوں کے ہیں۔ جو غیر منطقی دماغ اور غیر ادبی انشاد سے پیدا ہو گئے ہیں۔ وگرنہ شرط نطق لگانے کے بعد یہ پہلو پیدا نہیں ہو سکتے۔ اس پر بھی الجھن باقی رہتی ہے۔ کہ اگر شاعری میں جذبات و احساسات انسانی اور ان کا جوش و اظہار ادبی شعریت کا اصل جوہر ہے۔ تو پھر ان جذبات میں سے درد و غم رنج و ملال اور گریہ و موت کیوں جدا و مستثنیٰ کر دیئے جائیں۔ اور علاوہ اس کے جب خود مرزا صاحب اور اُن کے ہم خیال شاعری میں درد و تپش اور سوز و گداز و بیتابی تسلیم کرتے ہیں۔ تو یہ کون سا نظریہ اور کیا مذاق جدید ہے کہ دل میں تو جذبات و فطرت اور سوز و گداز کے کیفیات اور احساسات مشتعل موجود ہوں۔ مگر شعر میں ان کا اظہار نہ ہو۔ مرزا صاحب اور دیگر حضرات صاحبان مذاق جدید کے خیالات بشکل صرف اس قدر معلوم ہوتے ہیں کہ شاعر باطن میں تو جذبات اور کیفیات انسانی رکھتا ہو۔ مگر اس کا کلام قرآن شریف کے مانند ہو۔ بشرطیکہ یوسف زلیخا کا قصہ اس میں سے نکالا جائے۔ یا کم سے کم وہ باتیں ہوں۔ جو ملائکہ قدس کیا کرتے ہیں۔

بات اصل یہ ہے۔ کہ جن حضرات نے اپنی زندگی کا بیشتر اور بہتر حصہ انگریزی زبان پر صرف کیا ہے۔ وہ نہ تو ایشیائی شاعری اور یورپ کی شاعری کا فرق سمجھ سکتے ہیں نہ ادبیات ایشیائی کے ماہر ہیں۔ انہوں نے مغربی فضا میں آنکھ کھولی ہے۔ اب کالج سے نکلنے کے بعد ان کو تمام دینی اور دنیوی علوم کا ادعا ہو گیا ہے۔ وہ اس دنیا کے بھی فاتح بن جانا چاہتے ہیں۔ جس کی سیر بھی انہوں نے نہیں کی۔ وہ یہ کوشش کرتے ہیں۔ کہ اردو میں اپنے خیالات کو صحیح ثابت کریں۔ لیکن وہ اس قدر اردو نہیں جانتے۔ کہ اپنے ما فی الضمیر کو صحیح طور سے ادا کر سکیں۔ اس لئے مضحک اور غلط مطالب پیدا ہو جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ سنہ ۱۸۹۰ء میں لکھنؤ سے دو رسالے نکلتے تھے۔ ایک خدنگِ نظر ایک معیار ان دونوں کے آراکین نے ایک ادبی انجمن قائم کی۔ آراکین انجمن کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ موجودہ مذاق شعری میں چند نفرت انگیز عیوب ہیں۔ ان کو رفع کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلا مضمون علامہ ابو العلا ناطق کا شائع ہوا۔ جس میں چند خیالات و مضامین کا ترک کرنا ضروری قرار دیا۔ اور اس کلام کو مذاق سلیم کے منافی تعبیر کیا جس میں یہ نقائص ہوں۔ مثلاً رقیب کی کامیابی اور اپنی ناکامی پھر طرہ یہ کہ اس کا اظہار۔ پیغمبروں کی حقارت۔ عورتوں کا عشق۔ اور خصوصاً ایسی حسرتوں کا اظہار جو عیاشی کے قریب ہوں۔ ان اعضا کی تعریف جو عورتوں کے لئے مختص

ہوں۔ معاملات عریاں۔ ایسے جذبات کا اظہار جو اخلاقاً معیوب ہوں۔ مثلاً معشوق کا ہرجائی پن۔ بوسہ بازی۔ غرضیکہ ایسے تمام مضامین وخیالات ترک کرنے کی ہدایت کی گئی جن کو شرفا اپنے گھر میں نہ پڑھ سکیں۔ لکھنؤ میں ان خیالات کے موجد و عامل مولانا صفی جناب علی محسن خاں تیر مرحوم۔ آغا مظہر مرحوم۔ جناب آرزو و منشی نوبت رائے نظر۔ اور جناب عزیز لکھنوی وغیرہ تھے۔ رفتہ رفتہ لکھنؤ کے اکثر شعرا ہم آہنگ ہو گئے۔ اور لکھنؤ کے باہر جن شعرا نے اس تجدد و اصلاح میں سب سے زیادہ حصہ لیا وہ جناب اقبال الملک حضرت علی شاہجہان پوری ہیں۔ انہوں نے ان تمام متروکات کے علاوہ اور بہت سی خوبیاں شعر و شاعری میں پیدا کیں۔ اور اپنا ایک خاص اور سنجیدہ رنگ متانت ولطافت کو باہم سمو کر ایسا دکھایا کہ لکھنؤ کے شعرائے کاملین ان کے خاص مداح ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ لکھنؤ کے اہل فن صرف اسی شاعر کو شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ جو صاحب فن وتحقیق ہو۔ گو وہ کسی کی منقصت نہیں کرتے مگر دل میں اسی کو مانتے ہیں۔ جو مستند اور صاحب فن ہو ذیل میں ہم وہ خطبہ صدارت نقل کرتے ہیں جس میں علامہ حضرت مالک نے یہ بتا دیا ہے۔ کہ مذاق جدید و مذاق قدیم کا فلسفہ کیا ہے۔ اور دونوں میں کون کون سی باتیں اچھی اور بُری ہیں۔

(مدیر حصہ نظم وشعبہ ادبیات)

حضرات صاحبان سخن وقدردانِ سخن!

میں اس عزت صدارت کا جس قدر کم مستحق ہوں۔ اسی قدر زیادہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور اجازت چاہتا ہوں کہ شعر کے مذاق قدیم و مذاق جدید کے متعلق مجھ سے جن حضرات نے فرمائش کی ہے ان کے حکم کی تعمیل کروں۔

شعر وشاعری کی تعریفیں جو اہل ایشیا اور اہل یورپ نے کی ہیں۔ تقریباً سو سے زیادہ میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ مگر ان میں سے شاید ہی کوئی تعریف جامع ومانع اور مکمل ہو۔ نہ آئندہ کوئی امید ہے۔ اول تو بالغ النظر فلسفیوں کا قول ہے۔ کہ کسی چیز کی صحیح اور مکمل تعریف نہیں ہوسکتی۔ یہ قول بالکل مسلم ہے۔ کیوں کہ نہ کسی شے کا عرفان مکمل ہوسکتا ہے۔ نہ تعریف۔ شاعری کی تعریف پر ناکامی کا ایک اور رنگ بھی ہے جو اس سے زیادہ گہرا ہے۔ وہ یہ کہ شاعر کا تعلق ماحول سے ہے۔ ماحول ہر ملک ہر زمانے کا مختلف ہے۔ اس لئے شاعری کی تعریفیں بھی مختلف ومتعدد ہیں۔ ان سب پر طرہ یہ کہ ایک ہی زمانے اور ایک ہی ملک میں ایک منفرد شاعر آتا ہے۔ وہ ایک نیا رنگ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اور شعر وشاعری میں ایک انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ صفاتِ قدیم بدل جاتے ہیں۔ اور اوصاف جدید تعریف شاعری میں داخل کر لئے جاتے ہیں

مگر اصولی اور اصلی ارکان کسی چیز کے کبھی نہیں بدلتے۔ شاعری کے اصول یہ ہیں (۱) جذبات اور کیفیات انسانی جس وقت جوش میں آتے ہیں اگر وہ ادبی پیکر اختیار کرلیں تو شعر بن جائیں گے۔

دوسری اصولی بات یہ ہے۔ کہ خیالات ومضامین تخییل ومحاکات اور وزن وقافیہ کے ساتھ ادا ہو جائیں۔ تو یہی شاعری ہے۔ بعض ناواقفوں نے وزن وقافیہ کو ارسطو کے اس قول سے سند لیکر شعر سے خارج کرنا چاہا ہے۔ کہ

شاعری صرف محاکات ہے۔ یہ لوگ اس بات کو نہ سمجھے کہ شعر اور چیز ہے۔ شاعری اور چیز ہے۔ محاکات بلا وزن وقافیہ بےشک شاعری ہے۔ مگر شعر نہیں ہے۔ شعر جبھی ہوگا۔ جب وزن وقافیہ صحیح ہو۔

شاعری کے یہ دو اصول جو میں نے ابھی عرض کئے ہیں۔ ان کی مزید شرح یہ ہے۔ کہ شعر میں یا جذبات ہوں گے یا خیالات۔ جذبات کے لئے شرط ہے۔ کہ ذاتی ہوں۔ اور خیالات میں دوسروں کے واقعات یا جذبات ہونگے یا مضامین خیالی غ۔۔ شاعروں کا تمام تغزل ذاتی جذبات سے معمور ہے۔ کیونکہ وہ شعر میں بھی جھوٹ کم بولتے ہیں۔ خیالی شاعری سے مراد مثنویاں ہیں۔ خواہ دوسروں کے واقعات ہوں یا غیر تاریخی مضامین سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے۔ کہ شاعر کے دماغ میں بعض خیالات ایسے پیدا ہوتے ہیں۔ جو نہ تو خود اس کے جذبات ہوتے ہیں۔ نہ دوسرے کے نہ واقعات اصلی ہوتے ہیں۔ نہ فرضی۔ بلکہ یا تو کسی راز کا انکشاف ہوتا ہے۔ یا کوئی نظریہ۔ یا کوئی جدید توجیہہ۔ اور حسن تعلیل یا ایسا ہی کوئی انشائیہ مضمون مثلاً نصیحت و عبرت وغیرہ

لیکن شعر میں اگر تخئیل یا محاکات نہ ہو تو وہ شعر نہیں بلکہ نظم ہے۔ اور اگر تخئیل و محاکات ہو مگر وزن وقافیہ نہ ہو یا غلط ہو۔ تو وہ محض شاعری ہے۔ مگر شعر نہیں ہے۔ ان مقدمات کے عرض کرنے کے بعد اب میں اصل مقصد کو کسی قدر وضاحت سے بیان کرسکوں گا۔ قدیم مذاق یہ تھا۔ کہ بازاری عشق اور فحش و بداخلاقی سے عاریہ تھا۔ ۔۔۔ دلم معدوم تھے۔ اور تشبیہات پامال کی تکرار عورتوں کے اعضا کا بیان۔ رقیبوں کی کامیابی۔ پیغمبروں کی توہین ۔۔۔ کے ساتھ چوما چاٹی۔ غرضیکہ بہت سے معنوی خیالی جذباتی اور اخلاقی نقائص تھے۔ اور لفظی عیوب بھی تھے ۔۔۔ تعقید کا یہ عالم کہ شعر یا تو سمجھ میں نہ آئے۔ یا مضحک ہو جائے۔ جیسے ؎

کرتے جو نہ مرتے کوئی دن آہ و فغاں اور

ع حنا بھلائے گا شوخی مرا لہو تیری

ع اُلٹ منبر چکے ہوتے

اس قسم کے تمام لفظی و معنوی عیوب ہم لوگوں نے تقریباً چالیس سال سے ترک کر دیئے ہیں۔ ۔۔ یہ متروکات عام ہو گئے ہیں۔

مذاقِ سلیم کی خوبی یہ ہے۔ کہ غزل کے اشعار یا وصف اظہار عشق و محبت باپ بیٹے اور شاگرد و استاد باہم ایک دوسرے کے سامنے پڑھ سکتے ہیں۔ گو ابھی چند ایسے لوگ نظر آتے ہیں۔ جن کے دل و دماغ تک یہ روشنی پہنچی ہے۔ مگر وہ خال خال ہیں۔ اور ستاروں کی طرح ڈوب رہے ہیں۔ اب وہ کسی شمار قطار میں نہیں ایک بڑا گروہ اور ہے۔ جو زیادہ تر انگریزی دانوں کا ذہین اور قابل طبقہ ہے۔ ان پر ہمارے ملک کی ترقی و تنزلی کا انحصار ہے۔ کیونکہ ان کی تعداد بھی ماشاء اللہ زیادہ ہے۔ اور ان کے کلام کی اشاعت ہم لوگو

سے بیزار چند ہے۔ ملک کے ادبی انقلابات کے ذمہ دار یہی نوجوان ہیں۔ اور مذاقِ فن کار وبدل انہی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اِن ذمہ داریوں کی وجہ سے ان کو ہم سے زیادہ احتیاط کرنی چاہیئے۔ اگر انہیں اپنے وطن سے ذرا بھی محبت ہے۔ اور اپنے بزرگوں کی یادگار کا ذرا بھی احترام ہے۔ تو اُن کا فرض ہے کہ اردو زبان اور اس کے ادبیات کی طرف سے بے پروائی نہ کریں۔ اور ان سے جو کوئی صاحبِ فن اپیل کرے۔ وہ اس کو سنیں اور اگر قابلِ عمل ہو تو عمل کریں۔ مہمل اور لغو نصیحت ہو تو اسے بھلا دیں یہ نہ خیال کریں۔ کہ پرانے لوگ جو کچھ کہیں وہ غلط ہے۔ اور یہ زعم رکھیں کہ بی اے (B.A.) ہونے کے بعد دین و دُنیا کے ہر علم و فن میں وہ ماہر ہو گئے ہیں۔ مجھے اُن سے گنتی کی چند باتیں کہنا ہے۔ اور وہ میں پیش کرتا ہوں۔

(۱)۔ السنۂ ایشیا خصوصاً فارسی اردو میں ہر نوع مضمون کے لئے جداگانہ صنف ہے۔ مثلاً غزل۔ قطعہ رباعی مثنوی۔ قصیدہ واسوخت وغیرہ۔ غزل اظہارِ عشق و محبت اور معشوق کی تحسین و توصیف کے لئے بنائی گئی ہے۔ اگر ایک آدھ شعر کسی اور مضمون کا ہو۔ تو مضائقہ نہیں۔ مگر یہ اصول بالکل بے اصول اور غلط ہے۔ کہ معشوق کی بُرائی غزل میں کی جائے۔ اس کے لئے واسوخت ہے۔ غزل کا ہر شعر جداگانہ ہوتا ہے۔ قدیم شعرا نے کبھی کبھی کسی کسی غزل میں دو تین شعر کے قطعے نظم کئے ہیں۔ یا کسی مسلسل مضمون پر غزل کے تمام اشعار باہم منسلک و مربوط کئے ہیں۔ اگر ایسی غزل کہی جائے جس کا ہر ایک شعر مابعد لینے ماقبل کا محتاج یا متعلق ہو۔ تو وہ غزل نہیں بلکہ قطعہ ہے۔ قطعہ کہنا بھی شاعر ہی کا کام ہے جسطرح غزل قصیدہ وغیرہ کہنا۔ مگر غزل کو قطعہ یا قصیدہ کہنا یا بنا دینے کی کوشش کرنا ایک جاہلانہ تصرف بے جا ہے۔ اگر کسی شخص کے دل میں تغزل کے جذبات نہیں ہیں۔ تو اس کو غزل کہنا کیا ضرور ہے۔ اور اگر کسی شاعر کے تمام جذبات عشق و محبت ہی کے دائرے میں ہیں۔ اور دوسری قسم کے کیفیات و احساسات اس کے دل و دماغ میں نہیں ہیں۔ تو اس کو غزل گوئی سے روکنا فطرت کے سیلاب کو روکنا ہے۔ لیکن ایک صورت یہ بھی ہے۔ کہ گو ذاتی جذبات عشق و محبت کے نہیں۔ مگر صرف ادبی نقطۂ نظر سے یا محض دلچسپی کے لئے یا فن شعر میں مشق کرنے کی غرض سے غزل کہنا مقصود ہے۔ تو یہ امر بھی علم و فن کے خلاف نہیں کیونکہ غزل میں انتہائی قوت فکر اور تحقیق ادبی اور ان تمام علوم و فنون کی ضرورت ہے۔ جن کی احتیاج شاعری میں ہوتی ہے۔ بلکہ بعض محققوں کا مقولہ ہے کہ جب تک غزل میں مشق نہ ہو جائے کسی صنفِ شاعری میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اِسی وجہ سے آجکل اکثر نوجوان انگریزی دان بغیر مشق غزل اپنی نظمیں جو شائع کرتے ہیں۔ اُن میں بکثرت غلطیاں ہوتی ہیں۔ غزل سے زیادہ نہ کوئی صنفِ شاعری آسان ہے نہ مشکل۔ ہر قسم کی لغوی احتیاط کے ساتھ ذاتی معلومات فن کے اظہار کا موقع غزل ہی پر منحصر ہے۔ آسان اس قدر ہے کہ مبتدی کو الف بے اور مشکل اس قدر کہ معیارِ کمال ہے۔ دلچسپی کا یہ عالم ہے۔ کہ مشاعروں کی انتہائی مخالفت ہم لوگ کر رہے ہیں۔ اور یہ چاہتے

ہیں کہ مشاعروں کے عوض کوئی اس سے بہتر و کار آمد ادبی مجلس کا قیام و رواج دیا جائے۔ تاکہ ملک و قوم کے لئے باعلمی دُنیا کے واسطے مفید ہو۔ مگر پھر بھی مشاعروں کی وہ کثرت ہے۔ کہ پاٹ شالوں میں بھی مشاعرے ہونے لگے۔ اور عجب نہیں کہ اس سے بھی زیادہ ترقی ہو۔ کیونکہ اردو شعرا سے دلچسپیاں ایک خاص مدت تک بڑھتی رہیں گی۔ بکثر رہنمایانِ قوم اور بہی خواہان ملک یہ نصیحت کیا کرتے ہیں۔ کہ غزل کہنا چھوڑ دو۔ اور قومی و ملکی نظمیں کہو۔ مگر اس میں خرابی یہ ہے کہ نصیحت کا مزہ تلخ ہے۔ اور غزل کا شیریں۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان نصیحت سننے اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ ملک خوش نصیب تھے۔ جو شاعروں کی نظموں کا اثر لیتے تھے۔ ہم لوگوں میں سے اکثر نے تو ایسی نظمیں کہی ہیں۔ مگر ان کا اثر اسی دن رہا ہے جس روز وہ پڑھی گئیں۔ میری ایک ملکی نظم چھ ہزار روپیہ کو بکی (فروخت ہوئی) اور وہ روپیہ چندے میں دیا گیا۔ اور بعض نظموں پر آنسوؤں کے موتی نثار کئے گئے۔ مگر ان نظموں بہاسے کسی نظم کے کسی شعر کا یہ اثر نہ ہوا۔ کہ ایک آدمی بھی اس پر عمل کرتا۔ اکثر نوجوان شعرا کا یہ خیال ہے کہ شاعری ایک فطری چیز ہے۔ اس میں اصلاح اور استادی شاگردی کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ ایک مغالطہ ہے۔ شاعری میں جس قدر حصہ فطری ہے۔ وہ بہت قلیل ہے۔ یعنی روش اور طرز ادا یا کسی خاص صنف کی طرف رجحان باقی شعر و شاعری کے تمام ارکان و اجزا محتاج اصلاح ہیں۔ خواہ وہ خیالات سے متعلق ہوں۔ یا الفاظ سے اگر کوئی ہندوستان بھر میں یہ دعویٰ رکھتا ہو۔ کہ اس نے کسی سے اصلاح نہیں لی ہے۔ اور شاعری میں دوسرے درجہ کا بھی کمال حاصل کر لیا ہے۔ تو میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ اس کی ہر غزل میں جتنے شعر ہیں کم سے کم اتنی غلطیاں نکلیں گی۔ میں ایسے مشاہیر کو جانتا ہوں جو خود رَو ہونے کی وجہ سے بامعنی شعر کہنے پر قدرت نہیں رکھتے ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ کہ شعر مہمل نہ ہو۔ وہ اپنے ضمیر کو ادا نہیں کر سکتے۔ ان کے خیالات عالی ہوتے ہیں اور ادبیت پست ہوتی ہے۔ ہر چیز کی غلطی بتقاضائے بشریت ہر بشر میں ہوتی ہے۔ اور اسے تمام سنجیدہ صاحبِ اخلاق اساتذہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مگر اکثر خود رَو شاعروں میں اتنی غلطیاں ہوتی ہیں کہ ان کو ادب اردو اور فن شعر کو سخت مجروح اور ہلاک کر رہی ہے۔ خود رَو شاعروں کا کلام عموماً تین قسم کا ہو۔ یا تو غالب کی تقلید میں فارسی کے غلط اور بے موقع ٹکڑے لگاتے ہیں۔ یا تصوف و فلسفہ بگھارتے ہیں۔ شاندار اور ذی وقار الفاظ سے تمام شعر مرکب ہوتا ہے مگر معانی بالکل ردی اور ہیچ۔ اکثر شعرا جو مذاق جبر حال ہیں ہمیشہ اپنے اشعار میں ایک ہی قسم کے خیالات اور چند متعینہ الفاظ ہیر پھیر کے لاتے ہیں۔ اور مرتبہ کہی ہوئی باتوں کو بار بار دہراتے ہیں۔

بعض حضرات کا خیال ہے۔ کہ غزل میں گریہ و زاری اور موت و ہلاکت کی گرم بازاری شاعری کا بدترین پست درجہ ہے۔ اور اس کا ارتکاب قدیم مذاق کے شاعروں سے ہوتا ہے۔ اب یہاں دو تقسیمیں ہیں۔ اول یہ

مذاق کے شاعروں کو مرگ و گریہ پر اصرار و تکرار ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کیوں اور یہ کہ ان خیالات کی کثرت صرف اردو شعرا کے یہاں ہے۔ یا تمام ایشیا میں ان تنقیحوں کے جوابات حسب ذیل ہیں۔ اول۔ یہ کہ قدیم اخلاق کے موجودہ شاعروں میں ان مضامین کی تکرار ہرگز نہیں ہوتی۔ غزل میں ایک دو شعر اس قسم کے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ بارہا آپ نے صفی۔ آرزو۔ سائل۔ دِل۔ بے باک اور میری غزلیں دیکھی سُنی ہوں گی۔ اگر یہ اتفاق نہ ہوا ہو۔ کیونکہ یہ لوگ پروپیگنڈہ پھیلانے کے عادی نہیں ہیں۔ تو ارادہ کر کے ہر ایک کی دس بیس غزلیں دیکھئے۔ دوسرا امر یہ ہے کہ اس گریہ و مرگ کا رواج صرف اردو یا ہندوستان ہی میں نہیں۔ بلکہ تمام ایشیا اور ایشیا کے علاوہ یونان میں بھی ایسے فلاسفر گزرے ہیں۔ جن کا عقیدہ یہ تھا۔ کہ دُنیا میں جو شخص تکلیفیں اُٹھائے گا۔ مرنے کے بعد آرام پائیگا۔ افلاطون کا قول ہے۔ کہ رونا انسان کی اصلی حالت ہے۔ اور ہنسنا ایک احمقانہ عارضہ ہے۔ پیغمبر آخرالزمان صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ موت سے پہلے مر جاؤ۔ اور دنیا قید خانہ ہے۔ ہر مومن کے لئے اور کافر کے لئے جنت ایک راحت کدہ ہے۔ اور ہر روز اپنی موت کو یاد کرو۔ اور نفس امارہ کو قتل کرو۔ اور رونے سے قلب صاف ہوتا ہے۔ عرب سے چین تک تمام حکمانے ہنسنے پر رونے کو اور زندگی پر موت کو ترجیح دی ہے۔ لیکن یورپ اس کے خلاف ہے۔ وہ یہ کہتا ہے۔ کہ ہم دن بھر کے تھکے ماندے کاروبار کے مارے اور خانگی صدمات سے مجروح و مغضوب ہو کر جب تفریح یا آرام کے لئے سوتے وقت شعر و اشعار پڑھتے ہیں۔ تو حزن و ملال کے مضامین سے ہماری تکلیفیں بڑھ جاتی ہیں۔ لہٰذا موجودہ زمانہ کے اہلِ یورپ اپنے ماحول کی وجہ سے جیسے مذاق کی تلاش کرتے ہیں۔ موجودہ انگریزی طبقہ انہی کی تقلید میں ہندوستان کے مذاق کو بدل دینا اور شعر و شاعری سے مسخروں یا بھانڈوں کا کام لینا چاہتا ہے۔ یا کم سے کم ایک ایسا ذریعہ تفریح بنانا چاہتے ہیں جس پر اغراض معنوی اور جذبات مضطربانہ نہ ہوں۔ بلکہ علم و فن کی ماتحتی سے بھی آزاد ہو۔

میں عرض کرتا ہوں کہ یورپ اور ایشیا کے عشق میں جیسا فرق ہے۔ ویسا ہی امتیاز دونوں کے تغزل اور اظہار عشق میں بھی لازمی ہے۔ یورپ میں محبت کا دل میں پوشیدہ رکھنا جس قدر حماقت ہے۔ ہندوستان میں اس کا اظہار اتنا ہی شرمناک ہے۔ بجز اس صورت کے کہ کسی طوائف سے عشق ہے۔ وہاں پردہ بھی نہیں ہے اور دیدار و گفتار ممکن ہے۔ یہاں ان دونوں نعمتوں کے حاصل کرنے میں لوہے لگ جاتے ہیں۔ ان دونوں باتوں نے یورپ اور ہند کی عاشقانہ دُنیا کو بالکل ایک دوسرے سے جُدا کر دیا ہے۔ وہاں کے عشاق اپنے دل میں کوئی ایسا مادہ نہیں رکھتے۔ جس کے بخارات غزل میں نکالیں۔ یہاں عشق کے پنہاں جذبات رکھنے سے دلِ میں ایک عظیم الشان دنیا جذبات و اضطراب کی آباد ہو جاتی ہے۔ جس کا اظہار غزل میں ہوتا ہے۔ یہاں کے تغزل یہاں کی حالت کے بالکل مطابق ہے۔ اور وہاں تغزل کے لئے کوئی مواد نہیں ہے

اس لئے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں سے میری گزارش ہے کہ اس ملک کا مذاق تغزل بدلنے کے لئے اتنا انتظار کریں۔ کہ جب یہاں سے بھی بالعموم پردہ اُٹھ جائے گا۔ اور ہر ایک لڑکی کے ساتھ کورٹ شپ ہو سکے گا۔ اور وصل و دیدار میں کوئی مشکل حائل نہ رہے گی۔ تو یہاں کے تغزل کا بھی وہی رنگ ہو جائے گا۔ بلکہ نہ صدمات رہیں گے نہ عشق رہے گا۔ صرف یہ واقعہ رہ جائے گا۔ کہ طالب و مطلوب سکے والدین راضی ہوئے۔ لہذا دونوں نے چپ چپ کر نکاح کر لیا۔ اگر چند ہی روز کے بعد عیاشی کا بھوت اُتر گیا۔ تو دونوں نے جدا ہو کر اور کسی کو پھانس لیا۔ اور اگر زیادہ دن کے بعد جدائی ہوئی۔ یعنی لڑکی ادھیڑ ہو گئی تو اسکول ماسٹرس ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ عامیانہ واقعات عام ہو جائیں گے۔ اور غزل میں نظم ہونے کے قابل نہ رہیں گے۔ لہذا غزل بھی نہ رہے گی۔

خاص بیماریوں کا غذا کے ذریعہ علاج

دمہ۔ انجیر۔ شہد۔ نارنگیاں۔
پھوڑے۔ شہد۔ انجیر۔
سرطان۔ دارچینی۔ پیاز۔ لہسن۔
پھنسیاں۔ لہسن۔ پیاز۔ لیموں۔ مولی۔
ہیضہ۔ کافور۔ قہوہ۔ لیموں۔ پیاز۔
نزلہ۔ زکام۔ سیاہ انگور۔ شہتوت۔ مولی۔ آلوچہ۔ لسوڑے۔ آلو بخارا۔
قبض۔ روغن بادام۔ مکھن۔ کسٹرآئل۔ گرم پانی۔ روغن زیتون۔
دق۔ ساگ۔ دارچینی۔ کھجور۔ لہسن۔ انگور۔ شہد۔ زیرا۔ گاجر۔
کھانسی۔ سیاہ انگور۔ انجیر۔ شہتوت۔ آلو بخارا۔ لسوڑے۔ مولی۔
اسہال۔ سیب۔ قہوہ۔ رس بھری۔ چاول۔ سونف یا تخم لیموں۔ الائچی۔
غشی۔ سیب۔ ہینگ۔ انجیر۔ انار۔ پودینہ۔
خارش۔ لیموں۔ زیرہ۔ اخروٹ۔ کیلا۔
خفقان۔ آملہ۔ سیب۔ لیموں۔ اناس۔ انار۔

(ماخوذ)

انجامِ بہار

حضرت دلؔ کے ایک مصرع پر تخمیس

لطفِ صحبت حسرتِ دیدار بن کر رہ گیا　　تیرِ تبسم آہِ رنجش بار بن کر رہ گیا
دل میں جو ارمان تھا آزار بن کر رہ گیا　　پھول جو پھولا چمن میں خار بن کر رہ گیا
کیا اسی دن کے لئے فصلِ بہار آنے کو تھی

انقلابِ آسماں ہے گردشِ ایام ہے　　اب ساقی ہے نہ محفل ہے نہ دورِ جام ہے
کیا تمنائے مسرت اک خیالِ خام ہے　　کیا جہانِ رنگ و بو اجڑے چمن کا نام ہے
کیا اسی دن کے لئے فصلِ بہار آنے کو تھی

کیا سرورِ کامرانی کا یہی انجام تھا　　کیا وفورِ شادمانی کا یہی انجام تھا
کیا نویدِ نوجوانی کا یہی انجام تھا　　کیا امیدِ زندگانی کا یہی انجام تھا
کیا اسی دن کے لئے فصلِ بہار آنے کو تھی

کیا الم انجام دیکھا ہم نے آغازِ طرب　　آہ بن کر رہ گئی ہر ایک آوازِ طرب
اب وہ نغمے مسرت کے نہ وہ سازِ طرب　　آسماں اتنا ہوا کیوں رخنہ اندازِ طرب
کیا اسی دن کے لئے فصلِ بہار آنے کو تھی

خاک اڑاتی پھرتی ہے بادِ خزاں چاروں طرف　　چھا گئی ہیں باغ پر بربادیاں چاروں طرف
منتشر ہیں بلبلوں کے استخواں چاروں طرف　　دیکھتی ہے آنکھ عبرت کے نشاں چاروں طرف
کیا اسی دن کے لئے فصلِ بہار آنے کو تھی

جوش ملسیانی

غزل کا معیار اور مذاقِ سلیم کی تعریف

(عالیجناب اعتبار الملک لسان الدہر حکیم الشعراء جناب دلؔ شاہجہانپوری کے قلم سے)

ہمارے محترم جناب دلؔ نے اس استفسار کے جواب میں کہ غزل کا صحیح معیار کیا ہے۔ اور مذاقِ سلیم سے کیا مراد ہے۔ ذیل کا مضمون مرحمت فرمایا ہے۔ ناظرین کو اس مضمون کے مطالعہ سے معلوم ہو سکے گا۔ کہ موصوف نے رنگِ قدیم کیوں متروک قرار دیا۔ اور رنگِ جدید کن حالات اور کن خیالات کے زیرِ اثر اختیار کیا۔ اور نیز یہ کہ رنگِ جدید کی خصوصیات کیا کیا ہیں اس میں شک نہیں کہ اس خاص نمبر میں معیارِ غزل اور مذاقِ سلیم کی صراحت حضرت دلؔ ہی کے قلم سے موزوں تھی۔ کوئی اور ادیب اس موضوع پر قلم اٹھاتا۔ تو اس کے ارشادات جناب دلؔ کے کلام کے متعلق اظہارِ حقیقت میں شمار نہ ہوتے۔ اور انہیں زیادہ تر قیاس آرائی پر مبنی خیال کیا جاتا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ ادارہ نے اس صراحت کے لئے جناب دلؔ کو تکلیف دی۔ اور ایسے خاص نمبر کے لئے جو انہی کے نامِ نامی سے منسوب ہے موصوف کے ذاتی خیالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ہمیں امید ہے کہ ناظرین اس مضمون کو جو جناب دلؔ کی شاعرانہ روش کا آئینہ ہے۔ دلی رغبت سے ملاحظہ فرمائیں گے۔

(جوشؔ ملسیانی مدیر حصّہ نظم و شعبہ ادبیات)

میری فطرت ہی جذبات نگاری۔ اثر پسندی۔ واقعہ نویسی کی حامل تھی۔ تصوف اور فلسفیانہ اندازِ بیان بھی میں جزوِ تغزل سمجھتا ہوں۔ اکثر صوفیوں کی بارگاہ میں باریابی رہی ہے اسلئے گو خود صوفی نہیں ہوں۔ مگر اس رنگ سے آشنا ضرور ہوں۔ میں غزل کے اس شعر کو شعر نہیں سمجھتا جس میں تصنع ہو۔ اور دماغ سے پیدا کیا گیا ہو۔ بلکہ دل سے نکلا ہوا شعر سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ الفاظ جن کو غزل برداشت نہ کر سکے میری رائے میں پسندیدہ نہیں۔ کنایہ مجھ کو بہت پسند ہے۔ وہ اندازِ بیان میرا خاص رنگ ہے۔ جو الفاظ سے ظاہر نہ ہو مگر ذہنِ سامع اس کی سماعت سے حسنِ تخئیل تک بادنیٰ سماعت پہنچ جائے۔ اِس قول کی تصریح کے لئے مومن کے چند اشعار مثالاً لکھے جاتے ہیں۔

مومن خاں مومنؔ دہلوی ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم   کہیں پامالِ سر نہ ہو جائے
مرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو   کہیں دامان تر نہ ہو جائے

تشریح شعر نمبر ۳:۔ یقیناً میرے آنسو پونچھنے سے ان کا دامن تر ہو جائے گا۔ لیکن اِس نشتر کو دیکھئے جو اس شعر کے لفظ لفظ میں پوشیدہ ہے۔ میں رو رہا ہوں۔ وہ دیکھ رہے ہیں۔ اِتنا نہیں ہوتا

کہ اپنے دامن سے میرے آنسو پونچھ کر مجھے تسلی دیں۔ وہ میرے آنسو پونچھنا گناہ سمجھتے ہیں شعر کا مختصر الفاظ میں مطلب یہ ہُوا۔ کہ وہ بیٹھے دیکھتے میرے آنسو نہ پونچھیں گے۔ کہیں آپ گناہ گار نہ ہو جائیں کہیں دامان تر نہ ہو جائے سہ

دکھاتے آئینہ ہو اور مجھ میں جان نہیں کہہ گئے پھر بھی کہ میں تجھ سے بدگمان نہیں

جناب دِل کے مخصوص رنگ کی توضیح کے لئے چند الفاظ اور اپنی طرف سے لکھے دیتا ہوں۔ کسی واقعہ کے بیان میں وہ درمیانی کڑیوں کو چھوڑ جاتے ہیں۔ تمام حالات یا واقعات کو سلسلہ وار بیان نہیں کرتے بلکہ کوئی کوئی بات لے کر انہیں منسلک کر دیتے ہیں۔ اور درمیانی کڑیوں کو ملانے کی خدمت ذہن سامع کے سپرد کر دیتے ہیں۔ پھر بھی ایسا ہوتا ہے۔ کہ سننے والا نہایت آسانی کے ساتھ اس خلا کو پُر کر کے مفہوم تک پہنچ جاتا ہے:۔

(عابد شاہجہان پوری)

باوجود لکھنؤ اسکول کی تعلیم حاصل کرنے کے میں نے دہلوی رنگ اختیار کیا۔ دہلوی رنگ سے میرا مقصود میر و غالب و مومن کی شاعری ہے۔ جذبات نگاری میں عریانی پسندیدہ نہیں۔ مذاقِ سلیم کا دلدادہ ہوں اکثر اشعار جو دَورِ گذشتہ میں حاصلِ غزل تسلیم کئے گئے تھے۔ میں نے نغمۂ دِل سے خارج کر دیئے ہیں۔ انشاءاللہ تعالےٰ بوقت طباعت ثانی ان پھولوں میں جو کانٹے باقی رہ گئے ہیں۔ وہ بھی چن لئے جائیں گے۔ میں حُسن پرست ہوں۔ حُسن کی قدر کرتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی احترام منزلتِ حسن میری فطرت میں داخل ہے۔ حُسن کی بےاعتنائی کا شکوہ عاشق مظلوم کا دستور رہا ہے لیکن میں حتی الامکان اس حد تک روا رکھتا ہوں۔ جہاں تک حُسن منفعل نہ ہو۔ میں اس محبوب کا دلدادہ ہوں جس کی بارگاہ میں رقیب کا گذر نہیں۔ میرا محبوب معصوم ہے۔ میرے حسن و عشق کی داستان میں شکوۂ دشمن بھی شامل نہیں۔ میں ہمیشہ مہجور رہا۔ اس لئے وصل سے بھی ناآشنا ہوں۔ وصل کی تمنا فطرتِ عشق ہے۔ لیکن اس کا اظہار اور اس تمنا کی صراحت میری ہمت سے بالا ہے۔

باوجود رنگِ قدیم مطالعہ کرنے کے میری طبیعت خود رہنما ہوئی اور میں نے وہ رنگِ تغزل اختیار کیا۔ جو میری رائے میں حسنِ غزل ہے۔ میری رہنما ایک ایسی حسین پاکیزہ ہستی بھی ہے جس کے خیال نے مجھ کو صحیح حسن پرست بنا دیا۔ چونکہ باوفا عاشق ہوں ہمیشہ احترامِ حسن کرتا رہا۔ عشق کی نیازمندی بھی پیشِ نظر رہی میرا ہادی وہ ہادی ہے جس نے میری رگ رگ میں جوشِ محبت خلوص اور وفاداری کا اثر پیدا کر دیا۔ میں اکثر نالہ و فریاد کرتا ہوں۔ بیشتر انقلابی مضامین نظم کرتا ہوں۔ کہیں کہیں میری شگفتگی طبع مجذوب کی بڑ ہو جاتی ہے جسکو حقیقت سمجھنا چاہیئے۔ عیش و مسرت فطرتِ انسان ہے مگر مجبور ہوں میں نے اس ماحول میں پرورش پائی ہے جہاں نالے کے سوا نغمہ کی آواز کم محسوس ہوتی ہے۔ میرے اشک ہمیشہ اپنے ہی دامن پہ ٹپکتے ہیں۔ محبوب کا خیالی دامن بھی اس سے اثر پذیر نہیں۔ اپنے رہنما کے نام کا اظہار پسندیدہ نہیں۔ لیکن جو کچھ کہہ رہا ہوں حقیقت ہے۔ میں صنم خانۂ سخن میں قدیمی

بادہ پرست ہوں۔ جس کے کیف کے اثر سے حافظ شیراز۔ اور خیام مخمور نظر آتے ہیں۔ میں اس کا بھی متوالا ہوں ۔ رندانہ مذہب مذاق میری رائے میں پسندیدہ ہے بشرطیکہ جوش بوالہوسی تک نہ پہنچ جائے۔ بادہ جوش بادۂ طہور کا لطف دے۔ گندگی نمایاں نہ ہو ۔

میری رائے میں جب تک شاعر نے کوچۂ حسن کی ٹھوکریں نہ کھائی ہوں۔ شاعر کا دل درد آشنا نہ ہو۔ اس کی غزل میں اثر نہیں پیدا ہوگا ۔

جہاں تک غور کیا جاتا ہے۔ شعرار دہلی کے رنگِ تغزل میں اثر کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات نے اس عہد میں نشو و نما پائی۔ جب سلطنتِ مغلیہ برباد ہو چکی تھی۔ اس وقت سوائے نالہ و بکا کے کوئی سامان عیش و عشرت پیش نظر نہ تھا۔ اس کے علاوہ شعرار دہلی صوفیانِ عظام کی صحبت سے بھی مستفیض ہوتے رہے ہیں۔ اس صحبت نے ان کے رنگِ تغزل میں تصوف اور عرفان کی جھلک بھی پیدا کر دی ۔

شعرائے لکھنؤ کی شاعری کا زمانہ شباب شاہانِ اودھ کے عروج کا زمانہ تھا اس لئے وہ محض اپنے سطحی خیالات کی حد میں رہے۔ تشبیہ و استعارات کو حاصلِ شاعری سمجھے۔ درد و اثر سے ان کا کلام بیشتر تشنہ نظر آتا ہے۔ اس ثبوت کی دلیل قوی یہ ہے۔ کہ جب سلطنتِ اودھ بھی پامالِ حوادث ہوگئی۔ تو دَورِ حاضر میں شعرائے لکھنؤ کا رنگ بھی بدلا۔ ایک وقت تک ان کے کلام کا حاصل صرف واہ واہ تھا لیکن اب انقلابِ زمانہ سے اثر پذیر ہو کر آہ آہ بھی کرنے لگے ہیں ۔

مجھ سے بعض سخن سنج استفسار فرماتے ہیں۔ کہ با یار سخن گفتن تعریفِ غزل ہے۔ پھر آپ کے کلام میں بوس کی آرزو اور وصل کی تمنا کیوں نہیں۔ جواباً عرض ہے۔ کہ مجھ کو اس سے انکار نہیں ہے۔ یہ آرزو اور تمنا اظہار جذباتِ عشق کی حد میں ہے لیکن مجبور ہوں۔ حسنِ غیور کی بارگاہ میں یہ جرأت نہیں کر سکتا۔ خود بوسکی نہیں میرے معصوم محبوب کے لب و رخسار اس گستاخانہ جذبے سے بے نیاز ہیں۔ بوجوہ مذکور جب بوسہ ہی میرے مذہب میں ناروا ہے تو وصل کی طلب انتہائی گستاخی کیوں نہ سمجھوں ۔

انوکھے چٹکلے

(۱) نیک چلنی بردباری کی پہلی منزل ہے۔ بردباری سے دلاوری کی عظمت ہے۔
(۲) تم ہمیشہ نئے اور سچے کام کرتے رہو اور سچائی کو کسی حالت میں ہاتھ سے نہ جانے دو۔
(۳) جن لوگوں سے ہمیں محبت ہے۔ اُن کے لئے ایثار کرنا اور تکلیفیں اٹھانا حقیقی مسرت ہے۔
(۴) ہمت ہے تو آدمی سب کچھ کر سکتا ہے۔ ہمت ہی وہ چیز ہے جو غیر ممکن کو ممکن بنا دیتی ہے۔
(۵) گھر کے چھوٹے چھوٹے اخراجات میں بھی کفایت شعاری کا خیال رکھا جائے تو مفلسی اور قرضداری سے نجات مل جائے گی۔
(۶) اگر دوستوں سے دوستی قائم رکھنی ضروری ہے تو ان سے قرض کا لین دین نہ کرنا چاہیئے ۔ (اپیکاکی بھوشن۔ اردو سکول ٹیچر۔ جہلم)

جناب دلؔ شاہجہانپوری

(از جناب سید عبدالسلام ندوی مصنف شعراء ہند و ایڈیٹر رسالہ معارف اعظم گڑھ)

یہ ایک بڑی نازک تاریخی اور ادبی بحث ہے۔ کہ دلی اور لکھنؤ کے دو مختلف شاعرانہ انداز قائم ہو گئے تھے ان کا جغرافیائی اور قومی حیثیت سے کیا اثر پڑا۔ جہاں تک میں پتہ لگا سکا۔ مراد آباد۔ بریلی۔ بدایون۔ شاہجہانپور وغیرہ زیادہ دلی کے رنگ سے متاثر ہوئے۔ اور کانپور۔ فیض آباد اور الہ آباد وغیرہ پر لکھنؤ کا اثر پڑا اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے۔ کہ جو مقامات دلی سے قریب تھے۔ انہوں نے دلی کا رنگ اختیار کیا۔ اور جو مقامات لکھنؤ کے آس پاس تھے۔ وہ لکھنؤ کی روش پر چلے۔ اس جغرافیانہ اثر کے علاوہ قومی حیثیت سے روہیلکھنڈ کے پٹھانوں کی مخصوص طبیعت جب شاعری کی طرف متوجہ ہوئی تو اس نے سنجیدگی کے قالب میں ظہور کیا جس کے لئے اساتذہ دہلی کا رنگ کلام زیادہ موزون تھا۔ اس لئے جناب دلؔ کے کلام میں سب سے پہلی جو خصوصیت ذوق سلیم کے سامنے آتی ہے وہ متانت اور سنجیدگی ہے۔ قومی جغرافیانہ حیثیت کے علاوہ ممکن ہے کہ جناب دلؔ کی ذاتی متانت و سنجیدگی اخلاق کا بھی اثر ہو۔ بہرحال ان کے کلام میں کوئی غیر مہذب غیر سنجیدہ مبتذل و رکیک لفظ یا عریان مضمون نہیں مل سکتا۔ یہانتک کہ وصل اور رقیب کا لفظ جس سے غزل میں لطیف و خوشگوار مضامین شامل ہو گئے ہیں۔ ان کے کلام میں سرے سے موجود نہیں ہے شاید یہ خیال ہوا ہو۔ کہ یہ موجودہ دور کی شاعرانہ اصلاحات کا اثر ہے لیکن قدیم غزلوں میں بھی اس قسم کے الفاظ و مضامین نہیں ملتے۔ اس لئے حضرت نیاز فتحپوری کے نزدیک ان کے قدیم و جدید کلام میں امتیاز پیدا کرنا سخت مشکل ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک لکھنؤ کی صرف یہی خصوصیت نہیں ہے کہ وہاں کی شاعری میں متانت و سنجیدگی کم پائی جاتی ہے۔ بلکہ اس کی ایک خصوصیت اس کا وہ شاعرانہ استدلال بھی ہے۔ جو جذبات کی آمیزش سے بالکل خالی ہے۔ اس لئے اس کو صرف ایک خشک شاعرانہ منطق کہہ سکتے ہیں اور اس کی مثالیں بعض بعض جگہ ان کی قدیم غزلوں میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً

ابرو پہ آئینے میں نگاہیں ہیں بار بار　　برسا رہی ہیں تیر وہ اپنی کمان پر

ابرو کا کمان اور نگاہوں کا تیر ہونا شاعرانہ حیثیت سے مسلم ہے۔ اور چونکہ آئینہ میں ابرو ہی پر نگاہیں پڑ رہی ہیں۔ اس لئے یہ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ ؎

برسا رہے ہیں تیر وہ اپنی کمان پر

۵ دلِ صد چاک میں دیکھا رُخِ روشن اُن کا ہم نے نظارہ کیا ڈال کے چلمن ان کا

دلِ صد چاک کی تشبیہ چلمن کے ساتھ بالکل مکمل ہے۔ اور دل میں معشوق کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اسلئے دعویٰ خود بخود ثابت ہو گیا ۵ ہم نے نظارہ کیا ڈال کے چلمن اُن کا

جدید شاعری کی خصوصیت صرف متانت و سنجیدگی نہیں ہے۔ بلکہ خاص قسم کی ترکیبیں اور الفاظ ہوتے ہیں جن سے ان کا مجموعہ کلام معمور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب ولی کا کلام بڑے تاریخی دَور کا نچوڑ ہے۔ رامپور میں آکر دلی اور لکھنؤ کے رنگ میں آمیزش ہوئی۔ اس بیگانگی کے دُور ہونے کے بعد کچھ دنوں تک داغ۔ امیر۔ اور جلال۔ باہم حریف رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ زمانے نے اس بیگانگی کو بھی دُور کیا۔ اور اب ہر ایک کے تلامذہ نے بے تعصبی کے ساتھ ان تینوں استادوں کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف کیا اور تینوں کے رنگ کلام سے متاثر ہوئے۔ اس کے بعد جدید شاعری کا غلغلہ بلند ہوا۔ تو اس کا بھی اثر ان لوگوں پر پڑا۔ اس لئے ان مجموعی اثرات نے ایک خاص رنگ پیدا کر دیا۔ جس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مبتذل اور عریاں الفاظ و مضامین سے اجتناب۔

(۲) خارجی مضامین یعنی خال و خط کے مضامین سے احتراز۔

(۳) صفائی، برجستگی، اور سادگی۔

(۴) رفعت مضامین۔

امیر کے اور مشہور تلامذہ میں بھی اگرچہ رنگِ جدید کی یہ خصوصیتیں اقتضائے زمانہ سے پیدا ہو گئی ہیں لیکن جناب ولی نے اقتضائے زمانہ کے علاوہ بالقصد بالارادہ بھی یہ خصوصیتیں اپنے کلام میں پیدا کی ہیں۔ اور ان کی سنجیدہ فطرت۔ اور ماحول کے اثر نے بھی اس میں ایک اعانت کی ہے: اس لئے ان کا کلام امیر کے اور تلامذہ سے مختلف ہو کر شعرائے دَورِ جدید کے کلام سے مشابہ ہو گیا ہے۔ تاہم یہ فرق قائم ہے۔ کہ جدید شعراء کے کلام میں بے معنی الفاظ۔ بے معنی ترکیبوں بلکہ مہمل مضامین کا جو انبار پایا جاتا ہے۔ ان سے اُن کا کلام پاک اور لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے حدود تغزل کے اندر اپنی شان لئے ہوئے ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

جی ڈوب گیا جب یہ حقیقت ہوئی ظاہر جس بحر میں کشتی ہے وہ ساحل نہیں رکھتا
نارسائی کا سبب کیا ہے یہی جوشِ طلب بڑھ گئے ہم اس قدر آگے کہ رہبر رہ گیا
نکتہ سنجانِ وفا نے رکھ لیا دل اس کا نام کچھ ہو جو سینۂ بسمل میں جم کر رہ گیا
ادھر گھبرا کے غمخواروں کی مایوسانہ سرگوشی ادھر بیمار کا کچھ کہہ کے سب سے بے خبر ہوتا
بارہا ڈوب کے ابھرا مرے دل سے نشتر راز پھر بھی نہ کھلا عشق کی گہرائی کا

ترے ٹھوکروں کو ظالم عبث آج سمجھ ہے　　جسے کل مٹا چکی ہیں وہی تھا مزار میرا
ہاتھ دل پر رکھ کے یہ کہنا کسی کا یاد ہے　　اب اسے اپنا نہ کہنا یہ ہمارا ہو گیا
جو طالبِ جمال بڑھا آئی یہ صدا　　بجلی ابھی تو کوند رہی ہے جلال کی

یہ متین و سنجیدہ رنگ صوفیانہ خیالات کے اظہار کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ اور جناب دل کے کلام میں بھی جابجا اس کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ مثلاً ؎

وہ حسنِ مطلق ہے جلوہ افگن بغور جس خوش ادا کو دیکھا　　عجیب قدرت کے ہیں کرشمے جدھر نظر کی خدا کو دیکھا
جو ڈوب کر بھی کبھی نہ ابھرا ہوا وہی آشنائے ساحل　　بقائے دائم کا اک مرقع غریق بحرِ فنا کو دیکھا
مشاہدہ ہو تو کس طرح ہو بصارتِ ظاہری ہے عاجز　　گزر گیا جو خودی کی حد سے اسی نے اس خود نما کو دیکھا
خبر نہیں انتہا کی ہم کو کیا ہے گم بیخودی نے اے دل　　قدم جو رکھا رہِ طلب میں تو دور تر رہنما کو دیکھا

اردو غزل گوئی کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں شعر کا مضمون الگ الگ ہوتا ہے۔ کوئی مسلسل خیال پوری غزل میں نہیں ادا کیا جاتا۔ لیکن جناب دل نے بعض غزلوں میں ایک ہی خیال ادا کیا ہے۔ اور نہایت پرلطف مسلسل طریقے سے ادا کیا ہے۔ مثلاً یہ غزل قابلِ تعریف ہے ؎

شکیبِ ضبط بھی لے پیکِ یار لیتا جا　　پلٹ چلا ہے تو دل کا قرار لیتا جا
لکھا ہے خون کے قطروں سے حالِ روزِ فراق　　مرقعِ خلش و اضطرار لیتا جا
بجائے مُہر ہوئی ثبت چشمِ پُر حسرت　　یہ نقش ہے ہمہ تن انتظار لیتا جا
بدھے ہیں لختِ جگر تارِ اشک رنگیں ہیں　　یہ دل پسند یہ خوش رنگ ہار لیتا جا
کسی کے زیرِ قدم آج ہی بچھا دینا　　سکونِ جانِ محبت شعار لیتا جا
تمام عمر کا حاصل ہے جوشِ عجز و نیاز　　متاعِ ہستیِ ناپائدار لیتا جا
تجھے ہے عذر ادا داستانِ عشق طویل　　مری زبان بھی اے غمگسار لیتا جا
وفورِ شوق جو سرمایۂ محبت ہے　　بصد نیاز پئے نذرِ یار لیتا جا
یہ چیز وہ ہے جو فائق ہے لاکھ چیزوں پر　　خلوصِ عشق کا تو اعتبار لیتا جا
رہا سہا ہے جو تسکینِ دل کا سرمایہ　　مرے رفیق مرے رازدار لیتا جا

انیسِ حضرت دل آہ جو تمنا تھی
ملی ہے خاک میں اس کا غبار لیتا جا

حضرت دِل اور خوش اخلاقی

(سحابِ سخن حضرت ابرؔ احسنی گنوری)

خلاقِ عالمین نے دُنیا کی بنیاد محبت پر رکھی ہے۔ اور محبت خوش اخلاقی کا اعلےٰ عنصر ہے۔ یہ وہ مدلل دعوےٰ ہے جس کی تردید آج تک نہ ہو سکی نہ آئندہ ہو سکے۔ حیوانی انواع پر جب نظر ڈالئے اس جذبہ کو کارفرما پائیگا۔ ذی رُوح تو پھر ذی رُوح ہیں۔ اکثر نباتی اجناس ایسی ہیں جو اپنے ہمدم کی موت پر زندگی کو الوداع کہہ دیتی ہیں۔ حیوانات میں حضرتِ انسان بھی ہیں۔ جو افضل الکائنات کہے جاتے ہیں۔ یقیناً اس لازوال نعمتِ محبت میں ان کا حصہ زیادہ اور بہت زیادہ ہے۔ عام انسانوں کی محبت خاص حدود تک محدود ہوتی ہے لیکن اس نوع میں ایک متبرک وجود۔ قابلِ صد افتخار وہ ہستی ہے۔ جس کو شاعر سے خطاب کیا جاتا ہے۔ شاعر کیا ہے؟ پیکرِ محبت ہے اور محبت کا پجاری بھی۔ مجسمۂ الفت ہے۔ اور الفت کا پرستار بھی۔ عام عوام کی طرح اس کی محبت اولاد و خویش۔ زر و زمین وغیرہ تک محدود نہیں ہوتی۔ وہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ سے محبت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ محبت کی موجیں اس کے بحرِ دل سے اُٹھ کر اس کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہیں۔ اور سرمدی و ابدی عیش کی نیند سلا دیتی ہیں۔ شاعر کیا ہے؟ محبت کا پیغمبر۔ وہ انسانی قلوب میں خفتہ جذبہ محبت کو بیدار کرتا ہے۔ اور درسِ محبت دیتا ہے۔ وہ تعلقات اور شناسائی کی بیرونی حدوں میں بھی اُسی طرح محبت پاشی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جس طرح اندرونی حدود میں۔

یہ ہے میرے نزدیک حقیقی شاعر ہونے کا معیار۔ لیکن ہر گروہ میں۔ ہر طبقہ میں۔ کچھ منافق۔ کچھ دُنیا ساز اور گندم نما جَو فروش بھی ہوتے ہیں۔ افسوس کہ شعراء کا معزز طبقہ بھی اس قابلِ نفرت بلا سے محفوظ نہ رہ سکا۔ یہ وبا اتنی متعدی ہو گئی کہ شعراء کی بڑی تعداد۔ غرور و نخوت۔ تکبر و تمکنت۔ خودنمائی و خودپرستی کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویر بن کر رہ گئی۔ تکبر کس بات پر ہے؟ اس پر کہ ہم بڑے شاعر ہیں۔ ہمارے کئی درجن شاگرد ہیں۔ ہمارا کلام مقبولِ عام ہے۔ ہمارے مُنہ سے نکلے ہوئے الفاظ منثور و منظوم مدیرانِ جرائد خاص خاص نوٹوں کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ افسوس اس مرنے سے پہلے واقع ہونے والی موت پر افسوس اس معزز گروہ کی جبیں پر داغ بدنما لگانے والی ہستیو۔ ان لوگوں کو دنیا شاعر کہے مگر میں تو متشاعر ہی کہتا آیا ہوں اور متشاعر ہی کہتا رہوں گا۔

چاہے ناظرین اِسے شرارت ہی سمجھیں مگر آج میں اس کو ظاہر کئے بغیر نہ رہوں گا۔ کہ بیرونجات کے مشاعروں کا شرکت کے علاوہ مجھے جب کوئی دوسری قسم کا سفر پیش آیا ہے۔ تو وہاں کے مقامی مشاہیر شعراء سے اپنے نام کو چھپا کر ضرور ملا ہوں۔ اور اس ملاقات کی غرض و غایت صرف اتنی رہی ہے۔ کہ اُن کے اخلاق کا جائزہ لیا جائے۔ تاکہ فیصلہ

کیا جا سکے کہ یہ صاحب موصوف بھی شاعر ہیں یا متشاعر۔ میں نہایت ملال کے ساتھ یہ ظاہر کرتا ہوں کہ میں نے بڑی تعداد متشاعر حضرات کی ہی نہیں بلکہ مجنونانہ خصائل کی حامل پائی۔ بعض تو مجھے ایسے ملے کہ دروازے پر تاش کھیل رہے تھے۔ اور باہم نہایت فحش و عریاں مذاق کے ساتھ بازاری قہقہے لگا رہے تھے۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ ایک اجنبی دور سے ہماری طرف آ رہا ہے۔ تو جھٹ پٹ کھیل برخاست کر کے دیوانہ وار گھر میں گھس گئے اور اپنے ہم جلسہ احباب کے کان میں نہ معلوم کیا افسون پھونک گئے۔ کہ وہ سمٹ سمٹا کر نہایت مہذب بن کر بیٹھ گئے۔ اب میں نے جا کر دریافت کیا۔ کہ فلاں صاحب ہیں؟ تو جواب ملا جی ہاں ہیں تو مگر ابھی باہر نہیں آ سکتے۔ آپ کو ذرا تکلیف تو ہوگی تشریف رکھئے۔ ان کو آج فلاں جلسہ میں ایک نظم پڑھنی ہے۔ اور اُسی کو ارقام فرما رہے ہیں۔ ارے صاحب میں اُن کے شوقِ ملاقات میں بڑی دور سے حاضر ہوا ہوں ذرا بلا دیجئے۔ نہیں صاحب ہماری مجال نہیں جو ہم آواز دے سکیں۔ آپ سمجھئے بڑے شاعر ہیں اور بہت بڑے۔ نازک مزاج زیادہ ہیں اگر خفا ہو گئے۔ تو کپڑے چھڑانے دشوار ہو جائیں گے۔ میں دل ہی دل میں خدایا یہ شاعر نہیں یا فیس کے جانشین جو کپڑے پھاڑ ڈالیں گے پھر صاحب کوشش تو کیجئے۔ ممکن ہے لکھ چکے ہوں؟ اچھا بچے کو بھیجتے ہیں۔ غرض بہ ہزار تصنع وہ صاحب جو ابھی ابھی مجھے آتا ہوا دیکھ کر زنان خانہ میں تشریف لے گئے تھے۔ برآمد ہوتے ہیں۔ اور بڑی تمکنت سے بیٹھ جاتے ہیں۔ بات کرنی اور خوش اخلاقی سے بات کرنی ناگوار ہے۔ بڑی نزاکت سے منہ بگاڑ بگاڑ کر اپنی طرح لیکن انکسار کا پہلو لئے ہوئے فرما رہے ہیں۔ ان کے حوارین ان کے شاعرانہ وقار کے قصیدے باآواز بلند پڑھ رہے ہیں۔ اور وہ نہایت بے پروائی سے آسمان کو تکنے لگتے ہیں۔ "کچھ سنائیے" کی فرمائش پر میری طبیعت علیل ہے۔ آواز گرفتہ ہے۔ اس وقت ایک ضروری نظم لکھنی ہے۔ آپ پھر شام کے وقت تشریف لائیں ——

ایاذاً باللہ۔

بعض ایسے بھی ملے جنہوں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اپنے شاگردوں سے دریافت کرایا کہ "کیا آپ مولانا کے شاگرد ہونا چاہتے ہیں۔ ضرور ہو جائیے۔ آپ ایسے باکمال ہیں اور ایسے ہنرمند ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔

۵ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو بدایوں میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا جس کی طرح تھی۔ "زمین کو چیخ جلاؤ کہ بھی آسمان کہئے" اس میں دیگر مشاہیر کے علاوہ حضرتِ دل بھی مع عابد صاحب کے تشریف لائے تھے۔ میں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ میں اس سے زیادہ کوئی تفصیلی ملاقات نہ کر سکا کہ مشاعرہ میں میں نے بھی غزل پڑھی۔ اور مولانا نے بھی۔ مگر رات کا مشاعرہ کیونکر ممکن ہے کہ پہلی ہی مرتبہ کسی شخص کو چند منٹ اسٹیج پر دیکھنے کے بعد کوئی زندگی بھر یاد رکھے اور کیسے کیسے یاد رکھتے مشاعرہ میں تو سینکڑوں شاعر ہوتے ہیں دوسرے روز میں گنور چلا گیا۔ اور مولانا شاہجہان پور تشریف لے گئے۔ اور دوبارہ کوئی ملاقات نہ ہو سکی۔

چونکہ میں ایس ایس بواۓ سکاؤٹ ماسٹر اور اسکاؤٹ ہند بھی ہوں اسلئے ۳۴ء میں نمائش شاہجہان پور اور اسکاؤٹ

ریلی کے سلسلے میں مجھے اپنا ٹروپ لیجانا پڑا میں نے یہ چلتے وقت ہی تہیہ کر لیا تھا۔ کہ اس مرتبہ حضرتِ دل سے شرفِ نیاز حاصل کرونگا۔ اور یہ جذبہ میرے دل میں بڑی شدت سے موجزن تھا۔ اسلئے اور بھی کہ مولانا برادرم عزیزی ماسٹر عبرت صاحب سلمہ بریلوی کے استاد ہیں ۔ اسکاوٹس اور اسکاوٹ ماسٹر اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ ریلی میں پہنچکر کسی کو ایک لمحہ کی فرصت نصیب نہیں ہوتی مگر میں نے کسی نہ کسی طرح وقت نکالا اور شاہجہانپوری اسکاوٹس دوستوں کی رہبری میں مولانا کے یہاں پہنچا۔ اس وقت آپ مکان پر نہ تھے آپکے صاحبزادہ سے معلوم ہوا کہ آج ہی نمائیش میں مشاعرہ ہے۔ اور مولانا اسی سلسلے میں کہیں تشریف لے گئے ہیں میں اپنا نام اور پتا بتا کر چلا آیا — مگر سچ پوچھئے تو مجھے اسوقت ندامت سی محسوس ہو رہی تھی اسلئے کہ شاید میری حاضری کے یہ معنی نہ ہوں کہ میں مشاعرہ میں غزل پڑھنا چاہتا ہوں اور اس غرض کے تحت میری حاضری عمل میں آئی ہے۔

شب کو خیال ہوا کہ مشاعرہ میری قیام گاہ سے قریب ہی ہو گا شعرائے لکھنو کی بھی آمد سنی گئی ہے لاؤ مشاعرہ ہی سن لوں چنانچہ کیمپ انسپکٹر کی اجازت سے چند شاعر اسکاوٹس کی معیت میں باب مشاعرہ پر جا پہنچا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ مشاعرہ کے داخلہ کی عام اجازت نہیں ہے ۔ دروازہ پر چند ایسے مقامی شعرا مل گئے جنہوں نے مجھے باہر کے مشاعروں میں دیکھا تھا وہ نہایت عزت سے مشاعرہ میں لے گئے اور ہر شخص اظہار تعجب کرنے لگا۔ کہ آپ کب اور کس طرح آگئے ۔ آپکے آنے کی تو کوئی خبر بھی نہ تھی ۔ میں نے اصلیت سے آگاہ کر دیا۔

اتنے میں مولانا بھی تشریف لے آئے ۔ اور اصغر صاحب شاہجہانپوری نے (جواب تک یہ سمجھے ہوئے تھے کہ میں غزل پڑھنے آیا ہوں) مولانا سے میرا تعارف کرایا — اس وقت مولانا کی شانِ التفات دیدنی تھی — اس محبت اس خوش اخلاقی اس شاعرانہ جذبہ کو میں زندگی بھر دل سے فراموش نہیں کر سکتا — حقیقتاً حقیقی شاعر کی یہی خصوصیات ہونی چاہئیں — مشاعرہ شروع ہوا اور اختتام پر پہنچا۔ مجھ زبردستی کے مہمان کو مولانا بار بار بان کی تواضع سے شرمندہ فرماتے تھے ۔ غزلیات۔ نظمیں خوب خوب ہوئیں ۔ مگر ایک مقامی شاعر صاحب اس بلا کی نقادی ایک خود ساختہ ٹولی میں بیٹھے ہوئے فرما رہے تھے ۔ کہ الامان الحفیظ۔ کوئی شعر ان کے معیار سخن پر بھرے مشاعرہ میں ٹھیک نہ اترا ۔ انہیں ہر شاعر سے کچھ اس قدر ضد تھی ۔ کہ اگر کوئی سر ممبر یہ کہہ دے کہ خدا ایک ہے۔ تو فوراً چیخ اٹھیں ۔ کہ نہیں غلط بالکل غلط خدا دو ہیں بلکہ تین — اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ یہ بزرگ کیا فرماتے ہیں ۔ چنانچہ انکی باری پر معلوم ہوا ۔ کہ آپ طبل تہی ہیں ۔ اور آواز دینے پر مجبور ۔ خدا ان کا دماغی توازن درست فرمائے ۔

دوسرے روز مولانا نے دو مرتبہ اپنے آدمی میرے پاس اس لئے بھیجے کہ میں کھانا مولانا کے یہاں کھاؤں۔ مگر بدنصیبی کہ میں ریلی کی مصروفیت میں دوبارہ حاضری کی جرأت نہ کر سکا ۔ شعرا اس خوش اخلاقی سے سبق حاصل کریں۔

حضرت دل شاہجہانپوری

(از خسرو سخن ہارون صاحب انصاف سرپرست "رسالہ گراموفون ریویو کلکتہ" شاگرد قدیم حضرت نوح مدظلہ صدیقی ناروی جانشین جناب داغ دہلوی)

شہر حیدرآباد دکن میں خدائے سخن منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی لکھنوی کی وفات ۱۹۰۰ء میں اور استاد جہاں نواب فصیح الملک داغؔ دہلوی کی وفات ۱۹۰۵ء میں ہوئی۔ ساری دنیائے شاعری جانتی ہے کہ جناب امیرؔ مینائی لکھنوی اور حضرت داغؔ دہلوی آفتاب و ماہتاب شاعری تھے۔ اور ان دونوں کے گہرے تعلقات عمر بھر رہ چکے ہیں۔ حضرت امیرؔ مینائی لکھنوی نے اپنے انتقال کے بعد ذیل کے شاگرد بطور یادگار دنیا میں چھوڑے :-

جناب اخترؔ۔ ضمیرؔ مینائی لکھنوی۔ حضرت ریاضؔ۔ مضطرؔ۔ وسیمؔ۔ برہمؔ خیرآبادی۔ آثمؔ بریلوی۔ دلؔ شاہجہانپوری۔ جگرؔ بسوانی۔ نزاہدؔ سہارنپوری۔ آثرؔ رئیس دیوان۔ حافظ جلیلؔ مانک پوری۔ حفیظؔ جونپوری۔ رضاؔ فرنگی محلی۔ نواب صفدرؔ رامپوری۔ قرارؔ شاہجہانپوری۔ آہؔ امیٹھوی۔ طاہرؔ علی فرخ آبادی۔ شبیرؔ رامپوری۔ بسملؔ خیرآبادی۔ شادؔ رئیس بمبئی۔ پنڈت نظرؔ لکھنوی۔ وغیرہم ⁂

ان کے علاوہ اور بھی شاگرد ہونگے لیکن مشہور و معروف یہی ہیں۔ ان حضرات میں حضرت ریاضؔ۔ مضطرؔ۔ برہمؔ خیرآبادی شادؔ رئیس بمبئی۔ حافظ جلیلؔ مانک پوری۔ جگرؔ بسوانی۔ حفیظؔ جونپوری کی ملاقات کا شرف مجھے بھی نصیب ہو چکا ہے اور حضرت حفیظؔ۔ ریاضؔ۔ مضطرؔ صاحبان کی باتوں کو میں اب تک یاد کرتا ہوں ⁂

"اخبار ہمدم لکھنؤ" کے ایڈیٹر سید بشارت علی جالبؔ دہلوی شاگرد حضرت داغؔ دہلوی تھے۔ انہیں کے دفتر میں پہلے پہل حضرت حفیظؔ جونپوری سے اتفاقاً ملاقات ہوئی۔ حفیظؔ مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے اپنے استاد امیر مینائی کے جنت نشین ہو جانے پر اپنا بہت سا کلام حضرت داغؔ دہلوی کو دکھایا ہے۔ میری طرح میرے چند استاد بھائیوں نے بھی اپنے اپنے کلام میں حضرت داغؔ سے مشورۂ سخن لیا ہے ⁂

جناب محمد الدین صاحب فوقؔ کشمیری "ایڈیٹر پنجۂ فولاد لاہور" شاگرد حضرت داغؔ دہلوی کا دیوان "کلام فوق" ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا ہے۔ ان کے دیوان کے پچھلے صفحات پر حضرت داغؔ دہلوی کے چند نامور شاگردوں کی فہرست اور ان کا مختصر حال بھی درج ہے۔ اسی میں حکیم ضمیر حسن خاں صاحب دلؔ شاہجہانپوری کا نام بھی لکھا ہوا ہے ⁂

میری تالیف "کرشمۂ داغؔ" تذکرۂ شاگردان داغؔ دہلوی) زیر ترتیب ہے۔ اکثر شاگردان داغؔ سے میری

خط و کتابت ہے۔ اس مد میں عم بزرگوار طوطئ ہند۔ ثانی داغؒ۔ وقار الملک۔ ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل مدظلہٗ رئیس اعظم دہلی اور استاذی قبلہ تاج الشعراء۔ زینت الملک حضرت نوحؔ مدظلہٗ صدیقی ناروی جانشین داغؔ دہلوی سے خصوصاً تحقیق کر لیتا ہوں۔ حضرت دلؔ شاہجہان پوری کے متعلق میں نے اپنے استاد سے دریافت کیا تھا حضرت نے اس طرح جواب تحریر فرمایا:۔

عزیزی الصاف صاحب سلمہٗ۔ بہت بہت دعا

تمہارا سعادت نامہ پہنچا۔ حالات مندرجہ سے آگاہی ہوئی۔ میں اپنے استاد حضرت نواب فصیح الملک داغؔ دہلوی کے پاس حیدرآباد دکن میں بہت دنوں تک رہ چکا ہوں۔ جناب دلؔ شاہجہانپوری کو حضرت امیرؔ مینائی لکھنوی سے فخر تلمذ حاصل ہے۔ انہوں نے میرے استاد سے کبھی اصلاح نہیں لی۔ خدا جانے حضرت فوقؔ کشمیری نے کن معلومات پر اپنے دیوان میں جناب دلؔ شاہجہان پوری کو حضرت داغؔ دہلوی کا شاگرد لکھ دیا

دعا گو۔ نوحؔ از نارہ ضلع الہ آباد

جسٹس سر عبدالقادر نے رسالہ مخزن لاہور کا "فصیح الملک نمبر"۔ نیرنگ رام پور نے "امیر نمبر" اور نگار بھوپال نے "مومن نمبر" نکالا۔ اور نہایت آب و تاب سے نکالا۔ ان کے دیکھا دیکھی سردار جگت سنگھ صاحب مالک "رہنمائے تعلیم لاہور" کو یکایک کیا سوجھی کہ اپنے رسالے کا "دل نمبر" نکالنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس سے پیشتر انہوں نے اپنے رسالے کا "جوبلی نمبر" "فسانہ نمبر"۔ اور "ریڈر اس نمبر" نہایت کاوش سے نکالا جو اپنی مثال آپ ہے۔

"دل نمبر" میں حضرت دلؔ شاہجہانپوری کے متعلق دنیائے ادب کے بہترین اہل قلم حضرات اور شعرائے کرام کے مضامین نظم و نثر درج ہوں گے۔ اور یہ نمبر بھی دنیائے ادب میں بطور یادگار رہے گا۔ حضرت دلؔ شاہجہانپوری حکیم ہیں۔ ان کے شعر میں حکمت کا ہونا ضروری ہے۔ کلام میں آمد اور روانی کی بھرمار ہے۔ ان کا شمار چوٹی کے شاعروں میں ہے۔ ہندوستان کے اکثر رسالوں میں کلام دلؔ برسوں سے شائع ہوا کرتا ہے ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ میرے پاس ہے لیکن وہ کاپی یہاں موجود نہیں۔ شہر رنگون ملک برما میں رہ گئی۔ اگر یہاں موجود ہوتی۔ تو کم از کم دلؔ صاحب قبلہ کی کسی غزل پر مصرع لگا کر ناظرین کی تفریح طبع کے لئے خمسہ حاضر کرتا۔

الصاف

نوٹ:۔ خط و کتابت کرتے وقت چٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

(مینجر)

اعتبار الملک حضرت دلؔ کے متروکات زبان و متروکات شعری پر

تبصرہ

قبل اس کے کہ ہم ذاتی رائے پیش کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بطور تمہید اس موضوع پر جناب دلؔ کے ذاتی خیالات کا اظہار کر دیا جائے۔ ۱۹۱۹ء میں لسان الملک مرزا عزیز لکھنوی مصنف گلکدہ نے موجودہ رنگِ شاعری پر جناب دل مدظلہ سے تبادلہ خیالات کیا تھا جس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ یہ مسودہ مرزا عزیز لکھنوی نے سالنامہ عالمگیر ۱۹۲۲ء میں طبع کرایا تھا۔ حضرت دل فرماتے ہیں:۔

عموماً ہمارے شعراء مذاقِ ملک کے پیرو ہیں اور ان کا دستور العمل مبنی بر تقلید رہا۔ صنائع بدائع واقعات سے دور کثرتِ مبالغہ اور رعایت لفظی کو اصلی شعر سمجھا گیا۔ کسی دور میں بوالہوسی نفس پرستی اور مذاق سلیم کے خلاف اندازِ بیان پسند کیا گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ذاتی شہرت یا امراکی دربار داری تخریبِ مذاق کی باعث ہوئی۔ حالانکہ شاعر کا فرض ہے کہ ملک کے مذاق کی اصلاح کرے۔ مخرب اخلاق باتیں اور بدمذاقی کی گندگی دماغوں سے دور کرے۔ شاعر ناصح کی صفت سے بھی متصف ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس فرض کو ہمارے شعراء ادا نہ کر سکے۔ بلکہ بجائے فرضِ تبلیغ کے اس تاریک راستہ کی طرف قدم اٹھایا۔ جو نہایت خطرناک ہے۔

شاعر کے دماغ میں فلسفیانہ قابلیت کی صلاحیت ہے۔ وہ ادق اور نازک مسائل سلجھا سکتا ہے شعر مصوّر ہے اور اپنی قوتِ تخیل سے خوشنما تصویر کھینچکر قوت احساس کی مدد سے اس میں دلکش اور برمحل رنگ آمیزی کر سکتا ہے جو دراصل شاعری کا موضوع ہے۔ شاعر اخلاق۔ تمدن۔ طرز معاشرت کا جائز مصلح ہے۔ شاعر تصوف کے رنگ میں حقیقت کی روح اور عارفانہ جوش پیدا کر سکتا ہے۔ شاعر جب بلند پروازی کی طرف رجوع ہوتا ہے تو فلکِ حقیقت کے تارے توڑ لاتا ہے۔ شاعر جب دقیق نگاہ سے کام لیتا ہے تو بحرِ معانی کے نادر موتی چن لاتا ہے۔

دوسرے مقام پر اعتبار الملک قبلہ فرماتے ہیں کہ:۔

مجھ کو اس امر سے اختلاف نہیں ہے۔ کہ نظم میں رعایت لفظی۔ استعارہ و تشبیہ قطعاً نازیبا ہیں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ وجہ شعر تخیل ہو۔ اور اس کی تحت میں وہ صنائع پیدا کئے جائیں۔ جن کو حقیقتِ شعر تحمل

کر سکے ۔ اور تصویر کی اعلےٰ صورت زینت میں پنہاں نہ ہو جائے ۔ شاعر کی فنی غلطی اس کی عدم واقفیت پر مبنی ہے ۔ مگر مبتذل خیال کا موزوں کرنا ایسا بدنما داغ ہے ۔ کہ جس سے اسکا دامن کبھی پاک نہیں ہو سکتا ۔

بالفعل ملک میں ایک مسئلہ اور زیر بحث ہے ۔ بعض اہل الرائے فرماتے ہیں کہ تغزل میں محض سادگی ۔ اور زبان کی خوبیاں مدنظر رہیں ۔ بعض اہلِ مذاق کا خیال ہے ۔ کہ شاعری کے لئے تخیل روح ہے ۔ اور شکوہ الفاظ نادر تراکیب مابعد ۔ گو قدرتی حسن کا مقابلہ ظاہری آراستگی نہیں کر سکتی ۔ مجرد سادگی اکثر مقامات پر وہ تیر برساتی ہے ۔ اور اس سے اہلِ ذوق کے دل ایسے مجروح ہوتے ہیں ۔ کہ جو کسی قدر انداز کے کمان کے تیر نہیں کر سکتے ۔

شاعر اپنی قوتِ متخیلہ کے ذریعہ سے غور و خوض کے بعد تخیل کے لباس سے آراستہ کر کے عالم ظہور میں لاتا ہے ۔ مگر سماعت اس کے برعکس ہے تخیل الفاظ کے ذریعہ سے سامع کے ذہن نشین ہوتی ہے ایسی حالت میں اگر اغلاق ہوگا تو مفہوم کا ذہن نشین ہونا دشوار ہے ۔ مگر شاعر جو ایک اعلےٰ شے ہے تخیل کی گرہ کو نہ کھول سکی ۔ تو وہ چند مخصوص الفاظ وقت سماعت ادائے مطلب کیلئے کیونکر کافی ہو سکتے ہیں ۔ لہذا ایسے انداز بیان کی ضرورت ہے ۔ جو مغلق اور مبہم فی بطن الشاعر نہ قرار پائے ۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ اردو شاعری میں پیچیدہ تراکیب فارسی الفاظ کی کثرت اردو شاعری پر بہت بار ڈالتی ہے ۔ اردو وہ ہے جس میں فارسیت کی شان نہ ہو ۔ دوسرا گروہ کہتا ہے ۔ کہ فارسی ۔ عربی ۔ بھاشا وغیرہ الفاظ کے اشتراک کا نام اردو ہے ۔ لہذا فارسی تراکیب اور شکوہ الفاظ سے کیوں احتراز کیا جائے میں جہاں تک اس مسئلہ پر غور کرتا ہوں بقول ابن رشیق ۔ شاعر سادگی حقیقت اور اثر پر مبنی ہے ۔ مگر فارسی تراکیب کا صرف اس حد تک کہ شعر میں کوئی ثقل نہ پیدا ہو ۔ حقیقتاً شعر کا زیور ہے ۔

نامانوس لفظوں ۔ پیچیدہ ترکیبوں بعید از فہم استعاروں سے احتراز لازم ہے ۔ لیکن اوقات بغیر فارسی ترکیب اور صرف اضافات کے شاعر کو چارہ کار ہی نہیں ہوتا ۔ اور اکثر موقعوں پر ترکیب فارسی حاصل شعر سمجھی جاتی ہے ۔ فارسی ترکیب کی خوبیاں اور صرف اضافات کی دلفریبیاں وہی حضرات خوب سمجھ سکتے ہیں ۔ کہ جن کا دائرہ علم وسیع ہے ۔ اور وہ محل استعمال کو ذہن نشین کر چکے ہیں ۔ فارسی ترکیب طویل مفہوم کو مختصر الفاظ میں ادا کرتی ہے ۔ فارسی ترکیب تذکیر و تانیث کی پیچیدگیوں سے نکال کر شاعر کو منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے ۔ فارسی ترکیب ایسا کنایہ پیدا کرتی ہے ۔ کہ جس سے شعر کے مفہوم میں اور وسعت پیدا ہو چکتی ہے ۔

فارسی ترکیب پست خیال کو اعلےٰ لباس پہنا کر اہلِ نظر کے سامنے پیش کرتی ہے ۔

مثالاً ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
عرض و نیاز عشق کے قابل نہیں رہا — جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
اے دل آہستہ آؤ ناب شکن — دیکھ ٹکڑے جگر نہ ہو جائے
دشنام یار طبعِ حزیں پہ گراں نہیں — اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

اکثر موقعوں پر ردیف و قافیہ کے اختلاف سے بعض قافیہ ترک ہو جاتا ہے۔ مگر ترکیب فارسی اس مشکل کو آسان کر دیتی ہے مذکورۂ ذیل شعر ملاحظہ ہو ؎

افسوس اک اسیرِ قفس کی تمام عمر — وقفِ نظر تناسی صیاد ہو گئی

ظاہر ہے کہ اس موقع پر ردیف مونث اور قافیہ فکر واقع ہوا تھا۔ اگر ترکیب فارسی اختیار نہ کی جاتی۔ تو نظم شعر کے لئے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

اکثر مقامات پر محل حرف کا احساس نہ ہونے کی وجہ سے شاعر غلطی کر جاتا ہے۔ مثلاً لفظ حرمگاہ جو اہلِ فارسی نے ظرف دُیظرف کر کے بمعنی بزم گاہ استعمال کیا ہے۔ اور اس لفظ کو ترکیب دیگر حرم گاہِ آئینہ۔ حرم گاہِ ناز۔ حرم گاہِ صنم استعمال کیا ہے۔ اس کی مثالیں اساتذۂ فارسی کے کلام میں بکثرت ملتی ہیں۔ فصحا نے اسے ان الفاظ کو معاف قرار دیا ہے۔ جو غیر ذوی العقول ہیں۔ لہٰذا اس ترکیب سے ذہن سامع بجز بزم گاہ اور کسی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ اگر لفظ حرمگاہ۔ حرمگاہِ یار کی ترکیب سے استعمال کیا جائے تو یقیناً یہ ترکیب مذموم ہو جائے گی۔ کیونکہ ذہن سامع حرمگاہِ یار کو سُن کر حقیقی معنی کی طرف سے منتقل ہو جائیگا۔ ایک مسئلہ اور زیر بحث ہے۔ نئی روشنی کے دلدادہ ہماری ایشیائی شاعری پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ گل و بلبل شمع و پروانہ حسن و عشق کی داستانیں بے لطف ہو گئی ہیں۔ شعرا کو اب نیچرل مذاق کی طرف رجوع ہونا چاہیئے۔ بے شک فی زمانہ اصلاح کی ضرورت ہے لیکن وہ حضرات غالباً اس اصول سے انکار نہ کریں گے۔ کہ جذبات حسن و عشق سوز و گداز نیچرل شاعری سے علیحدہ نہیں ہیں۔ کائنات میں کوئی ایسی ہستی نہیں ہے۔ کہ جس کے دل میں عشق کا مادہ یا نگاہ میں حسن کی دلفریبیوں کا احساس نہ ہو۔ جب قدرت نے انسانی قلب و نگاہ میں یہ قوتیں ودیعت کی ہیں۔ تو پھر ان سے اثر پذیر نہ ہوتا کیا معنی۔ ہمارا ایشیائی مذاق شاعری مغربی مذاق سے بالکل جُدا ہے۔ کیونکہ اختلافِ طرزِ معاشرت۔ اختلافِ آب و ہوا۔ اختلافِ طبائع۔ اختلافِ مذاق مشرق کو مغرب سے وابستہ نہیں کر سکتا۔ دُور کیوں جائیے۔ عربی اردو بھاشا میں کس قدر فرق مذاق ہے۔ اہل عرب معشوق کو بالتانیث مخاطب کرتے ہیں۔ اردو شعرا بالتذکیر۔ اور بھاشا میں عورت مرد سے اظہارِ تعشق کرتی ہے۔ قطع نظر اس کے اگر منصفانہ نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو ہمارے شعرا کے

اعلےٰ طبقات میں اصلاح مذاق اب بہت کچھ ہو رہی ہے۔ ایک معمولی انقلاب کے بعد وہ زمانہ جلد آنے والا ہے کہ ہماری شاعری صرف مناظر قدرت کی دلکش تصویریں کھینچیگی۔ عارفانہ اور فلسفیانہ رنگ مرغوب طبع ہوگا۔ اظہار تعشق میں مادیت قطعی فنا ہو جائیگی۔ اب وہ دَور گذر گیا کہ احسن الشعر اکذبہ زبانوں پر تھا۔ بلکہ اب وہ وقت ہے کہ احسن العقول ماصدق الفعل۔ ماحصل شاعری تسلیم کیا جائے۔

ابتداً غزل کے معنی عورتوں سے ہم کلام ہونا مسلم تھے۔ اب یہ تبدیلی مذاق با یارِ ہم سخن ہونے کی ضرورت ہے۔ کہ جو بوالہوسی کو برداشت نہ کرے۔ ہمارے اردو شعرا نے فارسی تتبع سے معشوق مذکر کو مخاطب کیا ہے۔ ایسی حالت میں معشوق مذکر کے گیسو دراز یا کاکلِ خمدار کا وجود ممکنات سے ہے۔ لیکن یہ امر قطعی محال ہے کہ وہ معشوق جس کو بالتذکیر مخاطب کیا جائے۔ اس کا اٹھتا ہوا جوبن بھی موجود ہو

فن شعر میں وہ انداز بیان دلکش سمجھا جاتا ہے۔ جس میں کسی واقعہ کے درمیانی الفاظ کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ مگر طرزِ ادا سے سامع خود بخود اس مفہوم تک پہنچ جاتا ہے۔ مثلاً نظام رامپوری فرماتے ہیں ؎

جو مجھے دیکھنے کو آتا ہے پھر وہ یارِ دگر نہیں آتا

یہاں مصرعہ ثانی میں اگر میری حالتِ زار دیکھ کر جملہ مقدر نہ سمجھا جائے تو شعر میں کوئی خوبی نہیں رہتی مگر ذہن سامع فوراً اس مقدر تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح جذبات عالیہ کے علاوہ اگر اظہار جذبات مجاز میں کوئی کنایہ لطیف پیدا کیا جائے۔ جو مذاقِ سلیم کی حد میں رہے۔ وہ بھی قابلِ ترک نہیں۔ مثلاً جناب نظام فرماتے ہیں۔

؎ انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مُسکرا کے ہاتھ

اس شعر میں وہ دلکش تصویر کھینچی گئی ہے۔ جو مبنی بر مجاز ہے۔ مگر انداز بیان مہذب ہے۔ متانت کے ساتھ شوخیِ بیان مذاق سلیم کے خلاف نہیں ہے۔ مگر طرزِ بیان میں کنایہ ملحوظ رہنا چاہیئے۔ اسی طرح متانت آمیز رندانہ مذاق بھی معیوب نہ سمجھنا چاہیئے۔ اگر مذاق رندانہ کو متبذل قرار دیا جائے۔ تو حافظ شیرازی کا دیوان طاقِ نسیاں پر رکھ دینے کے قابل ہوگا۔ حالانکہ بلبل بوستانِ حقیقت جناب حافظؒ کا کلام ممالک مغرب میں قابلِ قدر سمجھا گیا ہے۔ عارفانہ انداز فلسفیانہ مذاق مہذب دُنیا میں مقبول ہو چکا ہے۔

شاعر کے دماغ میں موزونیِ کلام کا مادہ فطرتاً پیدا ہوتا ہے۔ یہ جوہر اکتسابی نہیں ہے۔ لیکن عیوب سے پاک ہونے کے لئے فن دانی کی ضرورت ہے۔ شکوہِ الفاظ اور اعلیٰ خیال موزون کرنے کے لئے علمی قابلیت درکار ہے۔ سلامت اور دلکش تراکیب کا حسن شاعر کی مشق پر منحصر ہے۔ مگر دلکش جذبات اور اُن جذبات میں اثر اُس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتا۔ جب تک کہ اس کے قلب میں تعشق کا مادہ نہ ہو۔ قدرت کے کرشموں۔ اور حسن کی دلاویزیوں کا احساس بغیر لذت چشیدہ قلب کے غیر ممکن ہے۔ عموماً جملہ اصنافِ شعرا اور خصوصاً

تغزل میں شاعر کے لئے ترنم اور موسیقیت کی بھی اشد ضرورت ہے۔ موسیقیت ایک آلہ ہے۔ کہ جس سے کلام کی فصاحت اور سلاست کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ موسیقیت ایسی کسوٹی ہے۔ جو موزونیت کلام کو بخوبی پرکھ لیتی ہے۔ موسیقیت ایسی قوت ہے جو کلام میں اثر کی روح پھونک دیتی ہے۔

مجھ کو بعض اہل الرائے کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ محض تغزل کو موضوع شعر نہ قرار دیا جائے۔ رنگِ تغزل محض تفنن طبع اور خصوصاً شاعر کے لئے جوش افزا ہے۔ فی زمانناً اس امر کی ضرورت ہے۔ کہ ہمارے جذبات میں ہیجان پیدا کیا جائے۔ اور ہماری افسردہ طبیعتوں میں شگفتگی کی رُوح اور قوم کے مردہ دلوں میں ترقی کا جوش پیدا کیا جائے۔ پست ہمتوں کو عالی ہمت بنایا جائے۔

کلام دِل کا مطالعہ کرنے کے بعد جس قدر متروکات دِل دستیاب ہوسکے وہ درج ذیل ہیں:۔

(۱) تقابل ردیفیں خصوصاً ردیف مفرد سے آپ بالتخصیص محتاط نظر آتے ہیں۔ جہاں ایک نازک خیال خوبصورت الفاظ میں ادا کیا گیا ہو۔ دعویٰ امر مجبوری ہے۔ آپ اپنے تلامذہ کو اس پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی ہدایت فرماتے ہیں۔

(۲) ۔ آپ نظم میں وہ الفاظ قطعاً استعمال نہیں کرتے۔ جو کانوں کو اچھے معلوم نہ ہوں۔ اور پرانے الفاظ جو دورِ حاضر میں ثقیل سمجھے جاتے ہیں وہ بھی آپ کے خیال میں قابلِ ترک ہیں۔ درج ذیل الفاظ جو دورِ حاضرہ میں اکثر خوش گو استعمال کرتے ہیں۔ آپ نے انہیں ترک فرمانے کا حکم دیا ہے۔

انکھڑیاں۔ تلک۔ بجائے تک۔ جوبن پستان کے معنی میں۔ گر بجائے اگر۔ علاوہ ازیں خوشی بجائے خوش۔ جائے بمعنی جگہ۔ بنت بمعنی ہمیشہ نہیں لکھتے۔ اور یہ بمعنی پر بھی آپ کے یہاں بہت کم استعمال ہوتا ہے اُس پاس بجائے اُس کے پاس بالاتفاق متروک ہے۔ البتہ اسمائے معرفہ کے ساتھ صرف پاس کا استعمال بھی کہیں کہیں بُرا نہیں معلوم ہوتا۔

لفظ بارے بھی لغنہ دِل میں کہیں نظر نہیں آتا۔ علاوہ ازیں کیونکہ بجائے کیونکر۔ کہیو۔ دیجیو بجائے کہنا دینا کے لکھنے سے بھی جناب دِل کو سخت نفرت ہے۔

مگر بمعنی شاید

نئے بجائے نہ

وصلت بجائے وصل یہ لفظ نہ آپ کے دیوان میں مل سکتا ہے۔ نہ آپ کی زبان سے سُنا۔

یاں واں بجائے یہاں وہاں

(ب) کریہ اور ثقیل الفاظ متعلقہ مرگ لاش وغیرہ مثلاً کرید۔ کاندھا۔ لاشہ وغیرہ وغیرہ۔

(۲)۔ رکیک اور عریاں الفاظ مثلاً ۔ بوسہ ۔ محرم ۔ پستان ۔ جانی وغیرہ سے سخت پرہیز ہے۔

(۳)۔ وہ الفاظ جو بزرگانِ دین کی شایانِ شان ہوں ۔

(۴) اردو زبان میں الف ندائیہ کا استعمال آپ کے خیال میں قابلِ ترک ہے۔ جیسے ؎

شادؔ عظیم آبادی ؎

تجھ میں پوشیدہ دلا نالۂ غماز بھی تھا   کیا سمجھتے تھے کہ اک خانہ برانداز بھی تھا

(۵)، ترکیبِ فارسی کے ساتھ واحد کا استعمال بجائے جمع گو دہلی اور لکھنؤ اسکول کے شعرا کے کلام میں بکثرت ہے مگر جنابِ ولیؔ اسے پسند نہیں فرماتے۔

امیرؔ ؎   قحطِ باراں نہیں دے جلد شراب اے ساقی   لکۂ ابر دھواں دھار چلے آتے ہیں

یہاں لکہ ہائے ابر کے بجائے صرف لکۂ ابر لکھنا بے شک قابلِ ترک ہے۔ اردو زبان میں فعل جمع کے ساتھ مذکر الفاظ میں بشرطیکہ آخر میں الف یا ہ نہ ہو کوئی تبدیلی نہیں۔ مثلاً رومال خریدا۔ رومال خریدے۔
البتہ مونث الفاظ نیز ان مذکر الفاظ میں جن کے آخر میں الف یا ہ ہو تبدیلی لازم ہو جاتی ہے مثلاً طوطا پالا۔ طوطے پالے وغیرہ اسی قاعدہ کلیہ کے قیاس پر اکثر شعرا ترکیبِ فارسی کے ساتھ بھی واحد کو جمع کے موقعہ پر لکھنا جائز سمجھتے ہیں

سالہا بجائے سال ہا سال قابلِ ترک ہے

یہ بمعنی اس قدر بھی قابلِ ترک ہے۔

جیسے مومنؔ ؎   بخت بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں
تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

جناب سید حیدر علی نظم طباطبائی شرح دیوانِ غالب میں لکھتے ہیں (صفحہ ۲۳۲)

"نہ کے ساتھ فعلِ نفی میں ہے بولنا خلاف محاورہ ہے۔ اور قدیم اردو میں بھی ایسا دیکھنے میں نہیں آتا مثلاً مجھ سے مارے ضعف کے نہ بولا جاتا ہے" غلط اور "نہیں بولا جاتا" ہے "یا صرف "نہیں بولا جاتا" صحیح ہے۔ نہ عطف کے لئے ہو۔ وہاں ہے کے ساتھ جمع کرنا درست ہے۔ جیسے نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے۔ غرضیکہ ہے کے ساتھ نہ کو جمع کرنا صریحاً خلاف محاورہ ہے۔ حضرت
ولیؔ بھی نظمؔ صاحب کے اس قول کے مطابق اپنے تلامذہ کو سختی سے پابند ہونے کا حکم فرماتے ہیں۔

لگ گئے بجائے لگے

پاؤں بجائے پاؤں (بروزن فعلن)

ترکیب فارسی میں نون کا اعلان یا اس کے برعکس فارسی کے جو الفاظ اردو زبان میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق کلیہ قاعدہ یہ ہے۔ کہ اگر وہ بلا اضافت ہوں۔ تو اہلِ زبان کے اصول کے خلاف اُن میں نون (ن) کا اعلان کیا جائے۔ لیکن ترکیب فارسی میں اعلانِ نون جواز نہیں سمجھا گیا۔ مثلاً صرف مکان یا جان کہنا ہوگا تو انہیں اعلان نون کے ساتھ بولیں گے لیکن اگر آرام جان۔ رگِ جاں کہنا ہوگا۔ تو ترکیب فارسی کی موجودگی کی وجہ سے اعلان نون جائز نہ ہوگا۔ اکثر شعراء ان باتوں کا لحاظ نہیں رکھتے۔

حضرتِ ولی اس کلیہ کے سختی سے پابند ہیں۔

ولی ؎ نہ وہ آرامِ جاں آیا نہ موت آئی شبِ وعدہ　　اسی دُھن میں ہم اُٹھ اُٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں

اُردو الفاظ کے ساتھ فارسی اضافت سراسر معیوب ہے۔ اس سے پرہیز لازمی ہے۔ جیسے غالب ؎

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ　　لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

بقول مولوی علامہ نظم طباطبائی۔ لفظ غلط میں یائے مصدری لگانا غلط در غلط ہے۔ فارسی میں کسی نے ایسا تصرف نہیں کیا۔ بلکہ اردو قدیم میں بھی ی نہیں بڑھائی گئی۔ اور مثلاً

بزمِ سوگ۔ بزم فارسی لفظ ہے۔ اور سوگ اُردو۔

صفاتِ معشوق میں جس قدر الفاظ آسکتے ہیں۔ انہیں صرف اشاروں کے بغیر استعمال کرنا ولی صاحب جائز نہیں سمجھتے۔ لہذا ناظرین کو اس بات میں کافی احتیاط برتنا چاہیئے۔

شکستِ ناروا کے عیب سے ہر شاعر کو احتیاط کرنا ضروری ہے۔ جیسے ڈاکٹر اقبال ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں　　کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تڑپ رہے ہیں کا پہلا حصہ یعنی تڑپ رہے مصرعۂ ثانی کے پہلے ٹکڑے میں اور دوسرا حصہ یعنی ہیں۔ مصرعہ کے دوسرے ٹکڑے میں واقع ہوا ہے۔ جناب ولی ایسے شعر کو پسند نہیں فرماتے۔

علاوہ ازیں

آپ کو بار بار عطف و اضافت ناپسند ہے۔

لفظ ہجوم گو جنس اسم ہے مگر بغیر عطف نہیں لکھتے۔ مثلاً ہجوم غم۔ ہجوم رنج و غم لکھتے ہیں۔

آشناؤں۔ گو شعراء نے دوستی کے معنی پر کثرت سے استعمال کیا ہے۔ مگر بول چال میں عموماً اس کا اطلاق ناجائز تعلق کے بنا پر ہوتا ہے۔ اس لئے ولی کے اصول کے مطابق قابلِ احتیاط ہے۔

اور حرفِ عطف کو فع کے وزن پر آپ نہیں لکھتے۔ درج ذیل الفاظ بھی قابلِ غور ہیں۔ آپ کی رائے میں یہ سب غیر فصیح ہیں۔

ذری	بجائے	ذرا	آکے	بجائے	آکر
رکھیو	״	رکھنا	ہم آغوشی	״	ہم آغوش
سندلیسا	״	پیغام	چھٹانا	״	چھڑانا
صفا	״	صاف	نالا	״	نالہ
نمط	״	روح	کار	״	کام
ولیکن	״	لیکن			

ضیقِ وقت سے مجھے طولانی فہرست تیار کرنے کا موقع نہیں ملا محض اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

حضرت اعتبار الملک عنقریب ایک جامع کتاب متروکات پر لکھنے والے ہیں جس میں عہد میر سے لے کر اب تک عہد بعہد کے مفصل نمونے پیش کئے جائیںگے بہت کچھ مسالا فراہم ہو چکا ہے۔ یہ کتاب طبع ہو کر اہلِ ملک کو مختلف کتابوں کی ورق گردانی سے بے نیاز کر دے گی ؂

(میر ذاکر حسین بی۔ اے۔ لکچرار الہ آباد)

نہایت مفید اور کارآمد باتیں

آہستگی ہر کام میں بہتر ہے۔ مگر نیک عمل میں تاخیر بہتر نہیں۔
گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے۔ جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔
پرہیزگار اللہ کے نزدیک معزز ہے اور فاجر ذلیل و حقیر ہے۔
توبہ اچھی ہے لیکن گناہوں سے توبہ بہت ہی اچھی ہے۔
سچا سوداگر جنت کے دروازوں سے بند نہیں کیا جائے گا۔
آہستگی سے کام کرنا اچھا عمل ہے۔ اور جلدی کرنا شیطانی فعل ہے۔
سچی توبہ کرنے والا اللہ کے نزدیک شہید کا درجہ رکھتا ہے۔
سچی توبہ سے مراد یہ ہے کہ انسان پھر اس فعل کے نزدیک نہ جائے۔
خدا کی نعمت کا بیان کرنا شکرِ نعمت ہے۔
کنگھی ایک روز بعد ہو۔ یا زیادہ۔ مگر ہونی ضرور چاہئے۔
اللہ کی عظمت میں تفکر اور سوچ کرنا تمام رات کی عبادت سے بہتر ہے۔

غزل

(بقیدِ یک قافیۂ دل)

(سید محمد علی صاحب آذر جالندھری)

نظر آتا نہیں دل کا شناسا کوئی محفل میں
لگائے کس سے دل کوئی کسے رکھے کوئی دل میں

جنازہ اُٹھ چکا مدت ہوئی اُس حسرتِ دل کا
نگاہِ ناز جس کو ڈھونڈتی ہے تو میرے دل میں

یہ کیا اندھیر ہے وہ بھی نظر آتا نہیں مجھ کو
ابھرنے کے لئے اک داغ جو رکھتا تھا میں دل میں

یہ دنیا لوگ جس کو حسن کی بستی سمجھتے ہیں
ہزاروں بستیاں آباد ہیں ایسی میرے دل میں

کبھی ہم نے نہ پایا دل کو خالی آرزوؤں سے
جو نکلی ایک دل سے چار پیدا ہو گئیں دل میں

میرے دل میں رہیں وہ اپنے دل میں انکو رکھوں میں
نہ طاقت اس قدر مجھ میں نہ وسعت اس قدر دل میں

ہر اک سے پوچھتا ہوں دیکھ کر میں اپنی دنیا کو
یہی ہے کیا میری دنیا جو رہتی تھی میرے دل میں

نہ ہنگامے بپا ہونگے نہ ایسی شورشیں ہوں گی
سکوں جس روز پیدا ہو گیا بیتابی دل میں

گلِ مقصود ہاتھ آئے یہ ناممکن ہے اے آذر
خلش خارِ تجسس کی نہ ہو جب تک کسی دل میں

خدائے سخن امیر الکلام حضرت امیر مینائی علیہ الرحمتہ کی اصلاحات

اعتبار الملک لسان الدھر حکیم الشعراء جناب دل شاہجہانپوری مدظلہ کے کلام پر

(از قلم جادو رقم علامہ حضرت صفدر مرزا پوری (لکھنؤ))

دورِ آخر میں ہندوستان کی سرزمین پر باعتبار کمال صرف تین شاعر مقبول ہوئے جن کے فیض سے آج ان کے ہزاروں تلامذہ غیر فانی شہرت کے مالک ہیں:-

(۱) جناب امیر مینائی	(۲) جناب داغ	(۳) سید جلال
لکھنؤ میں	دہلی میں	لکھنؤ میں

پیش نظر اوراق میں حضرت امیر علیہ الرحمتہ کی نادر اور گراں بہا اصلاحات ان کے مایۂ ناز شاگرد جناب دل شاہجہانپوری کے کلام پر پیش کی جاتی ہیں۔ حضرت امیر مینائی ایک عالم فاضل ادیب تھے۔ لیکن اس حیثیت کے ایک ہونے کے ساتھ ہی وہ کامل انشاپرداز اور فن عروض میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ انکی طبع وقاد نے جو گل افشانیاں کیں۔ وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

جناب دل شاہجہاں پوری پر حضرت امیر مینائی کی مخلصانہ نظر تھی۔ جیسا کہ مکتوبات امیر از حضرت ثاقب کانپوری سے کافی پتہ چلتا ہے۔ یہ حضرت امیر کی فیض صحبت کا حاصل ہے۔ کہ آج ہندوستان میں جناب دل نمایاں مرتبہ کے مسلم اور مستند کامل الفن شاعر ہیں۔ جناب امیر کے نامور تلامذہ حضرت جلیل استاذ السلطان - حضرت ریاض خیرآبادی - جناب دل شاہجہان پوری - حفیظ جونپوری - تسیم - مضطر - کوثر خیرآبادی وغیرہ حضرات کو جس قدر ملک میں غیر معمولی طور سے شہرت و ناموری حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہندوستان کا کوئی ایسا پرچہ نہیں ہے جس میں ان حضرات کا کلام عزت و احترام سے شائع نہ ہوتا ہو۔ اب ان بزرگوں میں سے حضرت دل اور حضرت جلیل کی شمع سخن سے بزم سخن منور ہے۔ باقی صورتیں کہانیاں ہو چکیں:- نعیم لکھنوی

جناب دل شاہجہانپوری۔

دل صد چاک میں دیکھا رخ روشن ان کا ہم نے نظارہ کیا ہے پس چلمن ان کا

اصلاح

ہم نے نظارہ کیا ڈال کے چلمن ان کا

توجیہہ - چلمن بندی ترکیب فارسی کی متحمل نہ تھی۔ اسلئے دوسرا مصرعہ بدل گیا۔ ہے بھی یہاں زائد تھا۔

جناب دِلؔ ؎ جس کی قسمت میں کجی ہو وہ نہیں ہٹ سکتی بل نکل جائے تری زلف کا ممکن ہی نہیں

اصلاح ؎ جس کی خلقت میں کجی ہو " " " " " "

توجیہہ۔ پہلے مصرعہ میں بجائے "قسمت" کے استاد نے خلقت بنا کر شعر میں ترقی پیدا کر دی۔

شعر ؎ جان و دل ناز کو نہ دیں گے ہم مستحق لطف کی ادا بھی ہے

اصلاح ؎ جان و دل دونوں دو نہ غمزے کو " " " " "

توجیہہ۔ پہلے مصرعہ میں اصلاح سے صفائی پیدا ہو گئی۔ لطف بیان بڑھ گیا معشوق کو مخاطب کرنا مزہ دے گیا۔

شعر ؎ دل کی امید بر نہیں آتی موت آتی نظر نہیں آتی

اصلاح ؎ " " " " ہم کو آتی نظر نہیں آتی

توجیہہ۔ تکرار سے شعر کا مرتبہ بہت بلند ہو گیا۔ اے سبحان اللہ۔

شعر ؎ قیس پہنچا ہے دور ناقہ سوار گرد بھی اب نظر نہیں آتی

اصلاح ؎ قیس کیا دیکھتا ہے ناقے کو " " " " "

توجیہہ۔ اصل مصرعہ ذرا اُلجھا ہوا تھا۔ اسلوب بیان بھی اچھا نہ تھا۔ اب اس مصرعہ نے قیس کیا دیکھتا ہے ناقے کو شعر میں صفائی اور روانی پیدا ہو گئی۔ دوسرا مصرعہ گویا اسی مصرعہ کا محتاج تھا۔

شعر ؎ مجھ سے بیمار پر یہ ظلم و ستم تجھ کو اے چارہ گر نہیں آتی

اصلاح ؎ مجھ سے بیمار پر یہ ظلم افسوس " " " " "

توجیہہ۔ پہلے مصرعہ میں بجائے ستم کے ظلم افسوس بنایا جس سے معنوی محاسن پیدا ہو گئے۔

شعر ؎ نکل جائیں گے اس طرح مرے ارماں کوئی آہ بن کر کوئی جان بن کر

اصلاح ؎ نکل جائیں گے رفتہ رفتہ سب ارماں " " " " "

توجیہہ۔ رفتہ رفتہ سب ارماں۔ یہ ٹکڑا استادانہ رکھ دیا۔ اس طرح میرے ارمان میں بات کہاں۔ مطلب یہ تھا کہ دِل میں ارمانوں کی کثرت ہے۔ رفتہ رفتہ سب نکل جائیں گے۔ کوئی آہ بن کر کوئی جان بن کر

جناب دِلؔ ؎ یہ داغ کہتا ہے میں بھی ہوں کوئی چیز ضرور جو دل میں رکھتے ہیں عاشق چھپا چھپا کے مجھے

اصلاح ؎ یہ درد کہتا ہے میں بھی ہوں کوئی چیز ضرور " " " " " "

توجیہہ۔ بجائے داغ کے مصرعہ اولےٰ میں درد بنایا۔ داغ سے سواد دکو چھپنے سے مناسبت ہے۔ اور ایک عجیب عاشقانہ انداز ہے۔

جناب دِلؔ ؎ آبلوں کو پھوٹنے کا شوق ہے ٹوٹتے رہتے ہیں نوکِ خار پر

اصلاح ؎ آبلوں کو پھوٹنے کا شوق ہے　　ٹوٹ کر گرتے ہیں نوکِ خار پر

توجیہہ۔ دوسرے مصرعہ میں بجائے ٹوٹتے رہتے ہیں کے ٹوٹ کر گرتے ہیں بنایا۔ ٹوٹ کر گرنا ایک محاورہ ہے۔ اس اصلاح سے شعر کی زوری بھی بڑھ گئی۔ اور ایک محاورہ بھی نظم ہوگیا۔

جناب دِل ؎ شمع تھی بالیں پہ وہ بھی ہے خموش　　کون روتا ہے ترے بیمار پر

اصلاح ؎ 〃 〃 〃 〃 〃　　کون اب روئے ترے بیمار پر

اب روئے نے شعر میں جان ڈال دی۔ کون روتا ہے۔ اس کے معنی کچھ اور تھے۔ اور کون اب روئے ترے بیمار پر اس کے معنی۔

توجیہہ۔ روشن ہیں مطلب یہ کہ شمع بھی بالیں پر خاموش یعنی بجھی ہوئی ہے۔ اب کون ترے بیمار پر روئے اِس اصلاح سے شعر میں بے تکلفی اور بیاختگی پیدا ہوئی:-

جناب دِل ؎ میخانے میں اعظانے جو توڑے خم وساغر　　شیشہ کی طرح دل بھی مرا ٹوٹ گیا ہے

اصلاح ؎ میخانے میں اعذانے جو ٹپکا ہے زمیں پر　　〃 〃 〃 〃 〃 〃

توجیہہ۔ پہلے مصرعہ میں بجائے خم وساغر کے ٹپکا ہے زمین پر بنایا۔ توڑنے اور ٹپکنے کا نازک فرق اِس اصلاح میں دکھایا گیا ہے جسے اہلِ مذاق ہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ چونکہ مصرعہ ثانی میں "شیشہ کی طرح" موجود ہے۔ اس لئے "ٹپکا ہے زمین" اس کی ضمیر شیشہ کی طرف راجع ہے۔ اِن اصلاحوں میں جس قدر رنزاکتیں ہیں۔ اُن کے سمجھنے کے لئے ناظرین کرام اپنی نکتہ نوازی اور نکتہ سنجی کو بھی لازمی سمجھیں۔ اگر راقم الحروف سے کوئی نکتہ رہ جائے تو خود غور فرمائیں۔

جناب دِل ؎ جو کچھ تھا یہاں پہلے ہی وہ لے گیا غمزہ　　اِک جان ہی باقی تھی تو وہ نذرِ ادا ہے

اصلاح ؎ 〃 〃 〃 〃 〃　　اِک جان ہی باقی تھی وہ اب نذرِ ادا ہے

دوسرے مصرعہ میں تھی تو وہ کے بجائے تھی وہ اب بنایا۔ جس سے شعر کی منزلت بہت بڑھ گئی ؛

نعرۂ مستانۂ دل

(پنڈت لبشنداس صاحب نزاؔر کپورتھلوی انگلش ماسٹر سکول ڈالہ ریاست کپورتھلہ)

کہیں رسوا نہ کرے نعرۂ مستانۂ دل
وقتِ امداد ہے اے ہمتِ مردانۂ دل

مہرباں آج ہے کچھ ساقئ میخانۂ دل
کہیں مستی میں چھلک جائے نہ پیمانۂ دل

اس لئے ہجر میں آنکھوں سے رواں ہیں آنسو
اپنی ہی آگ میں جل جائے نہ پروانۂ دل

غیر تو غیر کسی کو بھی یہاں دخل نہیں
اک تری یاد سے آباد ہے ویرانۂ دل

جذبۂ دردِ محبت کا کرشمہ دیکھو
اُن کی آنکھوں سے عیاں ہے مِرا افسانۂ دل

ترے ہی جلوۂ تاباں نے کرم گاری کی ہے
ورنہ آباد نہ ہوتا کبھی ویرانۂ دل

آخری دم میرے اظہارِ تمنا کے لئے
آگیا کھچ کے نگاہوں ہی میں افسانۂ دل

اب تو وہ بھی ترے نالوں سے جگر تھامتے ہیں
نزاؔر اِک بار وہی نعرۂ مستانۂ دل

اعتبار الملک لسان الدہر حضرت دلؔ شاہجہانپوری کی اصلاحات تلامذہ کے کلام پر

(از مولوی افتخار احمد صاحب بی۔ اے ایل ایل۔ بی۔ نیو دہلی)

کسی شاعر کی شہرت و ناموری کا بڑا سبب حسنِ اصلاح بھی ہے۔ جو شاعر کے منتہائے کمال پر مبنی ہوتی ہے۔ اصلاح کا مطلب یہ نہیں۔ کہ شاگرد کو از سرِ نو خود ہی نیا شعر کہدیا۔ بلکہ بلحاظ زبان بلحاظ تخیل بلحاظ وسعت بیان ہر پہلو سے شعر پر نظر غائر ڈالی جائے۔ لسان الملک مرزا عزیز لکھنوی اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں :۔

شاعری صرف موزونیت طبع کا نام نہیں۔ کم از کم علوم رسمیہ اور معائب و محاسن شعر پر عبور ہونا شاعر کا پہلا فرض ہے۔ علما معنی و بیان کے نزدیک معنی روح ہے۔ الفاظ جسد اور محاسن لفظی زیور۔ شعر پر تینوں حیثیتوں سے نظر کرنا چاہیئے۔ اگر معنی نہیں تو شعر بے روح اگر حسنِ بندش نہیں تو حسنِ ظاہری سے معرا۔ اکثر لوگ صرف الفاظ پر نظر کرتے ہیں معنی سے کوئی غرض نہیں رکھتے۔ الفاظ میں شوکت و جزالت۔ ترکیبوں کی ندرت ان کا نصب العین ہوتا ہے۔ سلیس صاف پُرلطف شعروں کی بعض مشاعروں میں داد نہیں ملتی۔ مرصع پیچیدہ۔ لغو شعر پر ہنگامہ برپا ہوتا ہے۔ اصلاح کی خوبی یہ ہے کہ جب اُستاد کوئی شعر بنا دے تو پھر لفظاً معناً اس سے بالاتر کوئی درجہ ترقی کا شعر میں نظر نہ آئے۔ جو لفظ رکھ دے۔ وہ ایک ترشا ہوا ہیرے کا نگینہ ہو۔ خواجہ آتشؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں   شاعری بھی کام آتشؔ ہے مرصع ساز کا

بعض وقت ایک لفظ رکھ دینے سے زمینِ شعر کا پایہ آسمان سے مل جاتا ہے۔ اور اس کو قدما نے کہا ہے۔
لفظیکہ تازہ است بمضموں برابر است ؂

(از چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی)

فنِ شعر میں کون اُستاد ہے؟

(۱) سلیم الفطرت۔ (۲) عظیم الفکرت۔ (۳) صحیح الطبع۔ (۴) جیّد الرّدیہ۔ (۵) دقیق النظر۔ (۶) خوشگو۔ (۷) شعرِ اُو بآں درجہ رسیدہ باشد کہ در صحیفۂ روزگار مسطور بُود ؂

شاعری کو اصلاح سے کس قدر تعلق ہے

مندرجہ بالا صفات کے بعد اُستادی مشاقی پر موقوف ہے۔ جس قدر مشق زیادہ ہوگی اتنا ہی نظم پر اس کو زیادہ

تسلط ہوگا۔ اس لئے نوشقوں کو ابتدا میں کسی استاد کامل کی ضرورت ہے ،،

خواجہ عبدالرؤف عشرت اپنے مقالہ میں رقمطراز ہیں:۔

کہ اصلاح دو طرح کی ہوتی ہے۔ (۱) صوری (۲) معنوی

یعنی اگر شعر کا وزن صحیح نہیں یا قافیہ غلط ہے۔ یا فعل کی جگہ فاعل اور فاعل کی جگہ فعل آگیا ہے۔ یا محاورہ غلط ہوگیا ہے یا ذم کا پہلو آگیا۔ ہے یا عطف و اضافت فارسی کے ساتھ اعلان نون ہے۔ یا اسم اردو کو اسم فارسی کے ساتھ مضاف الیہ کیا ہے یا الفاظ کا خلاف تلفظ مستعمل ہونا۔ یہ سب غلطیاں خلاف اصول زبان ہیں اور ان کی اصلاح کو اصلاح صوری کہتے ہیں ؛

۲۔ معنوی غلطیاں اس طرح واقع ہوتی ہیں کہ شاعر اپنے مقاصد کو ایک شعر میں ادا کرتا ہے لیکن جن الفاظ میں شعر ادا کیا جاتا ہے۔ وہ الفاظ شاعر کا مطلب ادا نہیں کر سکتے اور مطلب شاعر کے بطن میں رہ جاتا ہے۔ اس کی اصلاح کو اصلاح معنوی کہتے ہیں ؛

ایک غلطی اور بھی شعراء سے ہوتی ہے یعنے کلام صنف سخن کے خلاف ہوتا ہے۔ فرض کیجئے قصیدہ کیلئے تشبیب اور گریز لازمی چیز ہے۔ اب اگر کوئی غزل میں تشبیب و گریز لکھ جائے یا غزل میں واقعہ نظم کر جاتے یا اصول مفروضہ صنف سخن کے خلاف کوئی خیال نظم کر جائے تو اس غلطی کی اصلاح کا نام بھی اصلاح معنوی ہوگا

اُستاد کے لیے لازم ہے کہ مندرجہ ذیل اصول اصلاح کے ماتحت کلام پر اصلاح کرے :۔

۱۔ اپنے شاگرد کو تمام ضروریات شعر سے مطلع کر دینا چاہیئے ۔

۲۔ شعر میں محض الفاظ کا تغیر کرنا چاہیئے۔ خیال کے تبدیل کرنے کی بجائے شعر کو کاٹ دو ۔

۳۔ اگر پورے شعر کی ترمیم مطلوب ہو۔ تو صرف اسقام واضح کر دو اور اُسے کہو کہ خود مکرر طبیعت پر زور دے کر شعر کہے ۔

۴۔ اغلاط شعر سے شاگرد کو آگاہ کر دینا چاہیئے۔ تاکہ آئندہ محتاط رہے ۔

۵۔ تمام معائب کو رفع کر کے محاسن شعری پیدا کرنا شاعر کے منتہائے کمال اور مشاقی پر منحصر ہے جس سے بالاتر اور کوئی درجہ نہ ہو ؛

۶۔ ردیف اور قوافی کی صوری اور معنوی نزاکتوں کا خیال پیش نظر رہے ۔

۷۔ شعر کی بندش سست نہ ہو۔ چست بنا دینا چاہیئے ۔

۸۔ اصلاح تمامتر تنقید کلام پر مبنی ہے ؛

۹۔ استاد مراتب شاگرد کے مطابق اصلاح کرے ۔

اس مختصر تبصرہ کے بعد ہم اعتبار الملک جناب دل شاہجہانپوری مدظلہ کی نادر اصلاحات پیش کرتے ہیں ۔

دورِ حاضر میں جناب دل کو جس طرح مختلف اصناف سخن میں ید طولےٰ حاصل ہے۔ اسی طرح اصلاح دینے میں بھی آپ اپنی نظیر ہیں۔ اس مختصر سے مجموعے میں آپ حسن تخیل کی گلکاریاں۔ زبان کی شیرینی۔ بداعت اسلوب رنگینی و محاکات۔ حسن بندش۔ ترتیب الفاظ۔ وغیرہ تمام محاسن شعری پائیں گے۔ جو شاعر کم گو ہوتا ہے وہ زیادہ پختہ گو بھی ہوتا ہے۔ یہ عطیہ قدرت جسے چاہے دے۔ اس کی دین ہے۔

متقدمین میں میر۔ غالب۔ مومن اور متاخرین میں دل۔ فانی۔ یگانہ۔ عزیز وغیرہم اس عطیہ الٰہی سے مالا مال نظر آتے ہیں۔

اصلاحات

(۱) افضل الشعرا جناب عابد شاہجہانپوری

عابد ؎ آئی ہے اس کے در سے جبینِ وفا پرست — ناکامیوں کی ساتھ میں دنیا لئے ہوئے

اصلاح ؎ " " جبینِ وفا سرشت " " " "

استاد باکمال نے مصرعہ میں پرست کی بجائے "سرشت" کا لفظ رکھ دیا۔ پرست اور سرشت میں جو نازک فرق ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ دیکھئے یہ نازک اصلاح استاد باکمال کی شان استادی کو ظاہر کر رہی ہے ۔

عابد ؎ وہ سامنے ہیں پھر بھی نگاہوں سے دور ہیں — کوتاہی نگاہ کا پردا کہیں جسے

اصلاح ؎ " " ہے اک عالمِ حجاب " " "

عالم حجاب فارسی کی نہایت نفیس اور فصیح ترکیب ہے۔ ہیں کی تکرار بھی دور ہوگئی ۔

عابد ؎ ہر دل گرفتہ کے لئے وجہِ نشاط ہے — کتنا جنوں نواز ہے صحرا کہیں جسے

اصلاح ؎ ہر دل گرفتہ کے لئے ہے اک صلائے عام " " "

عابد کے مصرعہ اولےٰ کا آخری لفظ ہے جس کے مقابل میں مصرع ثانی کی ردیف جسے ہے ایک تو تقابل ردیف کا عیب پیدا ہوگیا۔ دوسرے صحرا کی جنوں نوازی دل گرفتگان کے لئے وجہ نشاط ہے۔ عابد صاحب نے "وجہ نشاط" انتہائی جنون نوازی کا حاصل قرار دیا ہے۔ استاد نے صلائے عام کی نادر اور اچھوتی ترکیب کا جواہر نگار ٹکڑا رکھ دیا جس سے شعر کی معنویت میں نمایاں ترقی پیدا ہوگئی۔

عابد ؎ بیگانۂ حواس دل مضطرب ہوا — اے برق جلوہ اب نہیں تاب نظر مجھے

اصلاح ؎ " " " اے شوق جلوہ " "

اہلِ نظر مندرجہ بالا شعر کی اصلاح پر غور فرماتے ہوئے اندازہ کر سکیں گے یہ شعر اصلاح سے مومن کا رنگ اختیار کر گیا۔ عابد نے مصرعہ ثانی میں برقِ جلوہ کے اثر سے دل کو بیگانہ جواس ثابت کیا ہے۔ مگر برقِ جلوہ کی تاثیرِ عالمگیر ہے یہیں بس نہیں۔ اس سے زیادہ یعنی اُس کے ہمہ گیر اثر سے دل خاک ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک تو حضرت اعتبار الملک نے معنوی نقص رفع کرنے کے لئے۔ دوسرے رنگِ مومن میں رنگنے کے لئے ایک ادنیٰ تغیر شوق جلوہ رکھ دیا جس سے شعر، شعر نہیں رہا۔ بلکہ الہام ہو گیا ہے۔ اے سبحان اللہ

(۲) منشی محمد عبد الرحیم خاں دردؔ شاہجہانپوری

درد ؎ نغمۂ دلکش سے عالم کی فضا معمور ہے میرا نالہ کون کہتا ہے اثر سے دور ہے

اصلاح ؎ ساز فطرت ″ ″ ″ ″ ″

تاثیرِ نالہ یہ نہیں ہو سکتی کہ نغمۂ دلکش سے فضا عالم گونج اُٹھے۔ اس عیب کو دور کرنے کے لئے جناب اعتبار الملک نے سازِ فطرت کا ٹکڑہ رکھ دیا جو آپ کے منتہا کمال کو ظاہر کر رہا ہے ؛

(۳) منشی اظہر الحق ردولوی ؎

ارباب خرد کو بھی اور اہلِ نظر کو بھی ہر جنبشِ ابرو میں تقدیر نظر آئی

اصلاح ؎ اربابِ تمنا کو بہیم دمِ نظارہ ″ ″ ″ ″

ایک تو اظہر کے مصرعہ اولے میں بھی دو دفعہ آنے سے پستی پیدا ہو گئی۔ اربابِ خرد۔ اہلِ نظر سے مفہوم بے ربط ہو جاتا ہے۔ باکمال استاد نے اربابِ تمنا کہہ کر حق اصلاح کر دیا ہے۔ اور ساتھ ہی اس کے بہیم دمِ نظارہ کی ترکیب قابلِ غور ہے۔ یہ اصلاح استاد کی بالغ نظری اور فکر متین کی صحیح معنی میں آئینہ دار ہے؛

شعر ؎ ناگفتنی ہیں عشق و محبت کے واقعات جو کام سہل تھے وہی دشوار ہو گئے

اصلاح ؎ ناگفتنی ہیں اب دلِ مضطر کے واقعات ″ ″ ″ ″

کوئے عاشقی میں عشق و محبت کے واقعات کی تشریح ضروری تھی جس سے سہل کام کے دشوار ہو جانے کا ثبوت پیدا ہو جاتا۔ اظہر صاحب مکمل ثبوت پیش نہ کر سکے۔ باکمال استاد نے اب دلِ مضطر کا ٹکڑہ رکھ دیا جس سے مصرعہ اول و مصرعہ ثانی کڑیوں کی طرح آپس میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لفظ اب شعر کی جان ہے؛

شعر ؎ جلوہ پوشیدہ ہوں جب اپنی نظر ہی میں تو پھر ننگ، نظارہ ہے ممنونِ گلستان ہونا

اصلاح ؎ نگہ شوق میں ہے جلوۂ رنگیں پنہاں ″ ″ ″ ″

مصرعہ اول میں فارسی کی دو خوبصورت ترکیبیں رکھ دینے سے بندش بہت چست ہو گئی ہے اور رکن ع دمن میں لفظ تو پھر مصرعہ ثانی سے تعلق رکھتے تھے۔ اور معلق سی حالت میں بدنما معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سقم بھی رفع

ہوگیا۔ اور شعر کی ساخت زیادہ رنگین اور دلکش ہوگئی۔ یہ اصلاح ہر پہلو سے لاجواب ہے ؎

شعر ؎ رقص میں خوب ہے انجام سے غافل ہو کر قطرہ اک خون کا نازاں ہے بیت دل ہو کر

اصلاح ؎ مائل رقص ہے انجام " " " " " "

مصرعہ اولے میں خوب حشو و زوائد ہے۔ استاد نے مائل رقص کا جواہر نگار تراشا ہوا ٹکڑہ رکھ دیا۔ جس سے مطلع۔ مطلع آفتاب بن گیا۔ سبحان اللہ۔

شعر ؎ ہاں یہی شرط ہے اظہر سر محشر بولے بیگناہوں کا لہو شاہد عادل ہو کر

اصلاح ؎ " " " " بیگناہوں کا لہو شاہد کامل ہو کر

بادی النظر میں اصلاح کی جگہ گنجائش نہ تھی مگر دوسرے مصرع میں جو نازک ترمیم (عادل کے بجائے کامل) کی گئی۔ اس سے ایک دلکش نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا ؎

(۴) شیخ محمد حسین صوفی کانپوری

شعر ؎ اب عالم تصور وجہ سکوں جاں ہے وہ سامنے ہوں جیسے ایسا مجھے گماں ہے

اصلاح ؎ رعنائی تصور " " " " " "

عالم تصور ہر حالت میں سکون جان کا باعث نہیں ہو سکتا۔ ہاں رعنائی ہر حال میں خوشی اور مسرت کا سبب ہوا کرتی ہے۔ اس اصلاح سے سارے شعر میں ایک روح پیدا ہوگئی ہے ؎

شعر ؎ جوش طلب سے منزل ہے سامنے نظر کے اب دیکھنا جدھر ہوں تیرا ہی آستاں ہے

اصلاح ؎ جوش طلب سے منزل خود آگئی ہے کھچ کر " " " " " "

کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے مصرعہ اول میں جو اصلاح کی گئی ہے۔ اس نے مضمون کو آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ نیز تقابل اولین کا عیب بھی رفع ہوگیا ؎

شعر ؎ رات دن رہتا ہے وہ خلوت نشین پیش نظر اس کی صورت دیکھتا ہوں ہر در و دیوار پر

اصلاح ؎ " " " " اس کی صورت نقش ہے گویا در و دیوار پر

صورت نقش ہونا محاورہ ہے۔ استاد عظیم النظیر نے اس اصلاح میں محاورہ نظم کردیا ؎

شعر ؎ مژدہ باد اے وحشیو نکھرا ہے پھر رنگ بہار رخصت صبر و شکیب دل کا ہنگام آگیا

اصلاح ؎ " " " " پیرہن کے چاک ہوجانے کا ہنگام آگیا

بہار کے موسم میں دیوانوں اور وحشیوں کا صبر و شکیب رخصت نہیں ہوتا۔ بلکہ پیرہن چاک ہوجایا کرتے ہیں۔ اور دیوانگی بڑھ جاتی ہے۔ صوفی صاحب کے مصرعہ ثانی بہت ہلکا اور بے ربط تھا۔ اصلاح سے یہ قسم بھی

جاتا رہا۔ اور شعر بھی پُر لطف ہو گیا ۔

ابو الاقبال حضرت عیش فیروزپوری ایڈیٹر ریاض سخن و تلمیذ نواب صدر یار جنگ بہادر علامہ نظم طباطبائیؒ بالقابہٗ و آفتاب سخن جناب وسیم خیرآبادی و خیام العصر حضرت ریاض خیرآبادی و عالیجناب اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری

شعر ؎ اس بے وفا صنم کے تصور کی حد نہ پوچھ — پہلا قدم اُٹھا تو سر کوہ طور تھا

اصلاح ؎ کچھ انتہا ہے گرمیٔ ذوقِ نگاہ کی " " "

جناب عیش کے مصرعہ اولیٰ میں پستی اور ابتذال کے عیب ہیں۔ جناب اعتبار الملک نے "اصلاحی مصرعہ چسپاں" کر کے دونوں مصرعوں میں توازن قائم کر دیا ہے! اور بلحاظ مضمون آپس میں کڑیوں کی طرح پیوستہ ہیں۔ بلحاظ تخیل و بندش شعر آسمانِ ہفتم پر پہنچ گیا ۔

شعر ؎ عشق ہے صبر آزما حسن سراپا حشر ہے — وجہ سکونِ قلب ہوں شورشِ کائنات ہوں

اصلاح ؎ عشق ہے صبر آزما یادِ نگار فتنہ زا " " "

سراپا کا آخری الف تقطیع میں گرتا تھا۔ فارسی الفاظ میں یہ الفاظ تخفیف معیوب ہے۔ اس لئے اصلاح سے یہ نقص دُور کرنا مقصود تھا ۔

شعر ؎ ان کے خرام ناز کی تاثیر دیکھنا — تم چلتی پھرتی حشر کی تصویر دیکھنا

اصلاح ؎ " " " " — ہنگامہ خیز حشر کی " "

تم حشو زائد۔ اصلاح سے یہ نقص رفع ہو گیا۔ اور اس اصلاح سے جو ادبی خوبیاں پیدا ہو گئیں وہ بیان میں نہیں آسکتیں ۔

شعر ؎ برباد یاں عیاں ہیں مرے حالِ زار سے — ہوں اک خراب حال جہانِ خراب کا

اصلاح ؎ " " " — بگڑا ہوا ہوں نقش جہانِ خراب کا

(ہوں اک خراب حال) بالکل رکیک ہے۔ "بگڑا ہوا ہوں نقش" محاکاتی پہلو لئے ہوئے ہے۔

(۵) جناب عبرت صدیقی بریلوی

شعر ؎ داستانِ عشق ہے ناگفتنی — مختصر یہ ہے کہ دل مجبور ہے

اصلاح ؎ واقعات عشق ہیں ناگفتنی " " "

جمع کی صورت مزہ دے گئی۔ تکرار ہے رفع ہو گئی ۔

شعر ؎ شعاعِ حسن بن کر موت کا پیغام آتا ہے — سر بام تمنا یا کوئی گلفام آتا ہے

اصلاح ؎ " " " — سر بام تمنا پھر کوئی گلفام آتا ہے

یا "کے بجائے "پھر" رکھ دینے سے شعر کتنا بلند ہو گیا۔

شعر ؎ کہتا ہے کسی شوخ کا انداز نظر آج　　لٹنے کو ہے اک بیکس و مجبور کا گھر آج

اصلاح ؎ " " "　　لٹ جائیگا اک بیکس و مجبور کا گھر آج

"لٹ جائیگا" سے شعر میں روانی اور زور پیدا ہو گیا۔ اور شک و شبہ کا شائبہ نہ رہا۔ سبحان اللہ۔

شعر ؎ مزہ جب ہے کہ اے جوشِ محبت بعد بربادی　　نظر صیاد کو ہر شاخِ گل پر آشیاں آئے

اصلاح ؎ مزہ جب ہے کہ اے جوشِ تمنا بعد بربادی　　" " " "

جوشِ محبت کے بجائے جوشِ تمنا لکھ دیا۔ معنویت کے لحاظ سے شعر قابلِ غور ہے

(۶) حضرت فضا جالندھری

فضا ؎ کیا ہوئی وہ تپشِ شوق وہ سرگرمیٔ عشق　　اب نہ وہ دل ہے نہ وہ رنگِ وفا کیا باعث

اصلاح ؎ فطرتِ عشق بدل دی مری ناکامی نے　　اب نہ وہ دل ہے نہ وہ جوشِ وفا کیا باعث

مصرعہ اولٰے ترمیم کردہ کتنا بلند اور کس قدر ناکامی کی سچی تصویر پیش کر رہا ہے۔ مصرعہ ثانی میں رنگ کے مقابلہ جوش فصیح ہے۔ یہ اصلاح بہت بلند اور نازک ہے۔

فضا ؎ دل میں کیا کوئی تمنا نہیں اے جوشِ طلب　　لب تک آتا نہیں کیوں حرفِ دعا کیا باعث

اصلاح ؎ دل میں کیا کوئی تمنا نہیں اے کاوشِ عشق　　" " " " "

جوشِ طلب اور کاوشِ عشق کے صوری اور معنوی پہلو پر نظر ڈال کر نازک اصلاح کا لطف اٹھائیے۔

شعر ؎ کیوں اسے اک جگہ قرار نہیں　　ہر طرف ڈھونڈتی صبا کیا ہے

اصلاح ؎ پردۂ گل میں دیکھتی اس کو　　" " " "

رنگینیٔ تخیل نے شعر کو بیت الغزل بنا دیا۔

(۷) منشی غلام حسن صاحب کسرے تلمیذ حضرت جلیل و حضرت دل

شعر ؎ بے لاگ محبت میں مزا آ نہیں سکتا　　ہو دل میں اِدھر سوز اُدھر درد جگر میں

اصلاح ؎ اے عشق مجھے یوں تو مزا آ نہیں سکتا　　" " " "

تخاطب کی ضرورت تھی۔

شعر ؎ ناز و غمزے ہی نہیں تیر لئے پھرتے ہیں　　ان کے ابرو بھی تو شمشیر لئے پھرتے ہیں

اصلاح ؎ ناز و انداز ہی کیا تیر لئے پھرتے ہیں　　" " " "

غمزے بحالت جمع ہندی ہے۔ لہذا عطف ناجائز۔

شعر ؎ ادائے حسن کی حسن ادا نے لوٹ لیا — وفا کی آڑ میں اُس بے وفا نے لوٹ لیا
اصلاح ؎ کرشمۂ نگہ شوخ ادا نے لوٹ لیا — کرم کی آڑ میں اُس بے وفا نے لوٹ لیا

مصرعہ اولے میں لوٹنے کی معقول اور بیّن وجہ نہیں تھی۔ اس لئے بدلا گیا اور مصرعہ ثانی میں وفا کے بجائے کرم بنا کر حق اصلاح ادا کر دیا ہے۔

پیمانۂ دِل

(از فخری قریشی آبادالوی تلمیذ علامہ محوی صدیقی لکھنوی مدظلہٗ)

کیوں نہ ہر گام پہ ہوں لغزشِ مستانۂ دِل
بادۂ عشق سے لبریز ہے پیمانۂ دِل

یاس اس میں ہے الم اس میں غم ہے اس میں
قدم یار کے لائق نہیں کاشانۂ دِل

سرفرازی یونہی دنیائے وفا میں ہو گی
آتشِ شوق میں جلتا رہے پروانۂ دِل

آج وہ میری عیادت کیلئے آتے ہیں
پیشوائی کو بڑھے جذبۂ شکرانۂ دِل

بختِ خوابیدہ کو آخر تو جگانا ہے ضرور
ہاں پھر اک بار وہی نعرۂ مستانۂ دِل

یادِ ایّامِ عشرتِ فانی

(اثر: جناب کسکر زیدی)

فلک پر نیم شب کو جب ستارے مسکراتے ہیں ۔۔۔ مجھے رہ رہ کے رنگِ بزم دوشیں یاد آتا ہے
نسیمِ صبح کی موجیں جب آ کر گدگداتی ہیں ۔۔۔ مجھے بھولا ہوا وہ خوابِ رنگیں یاد آتا ہے
تصور چٹکیاں لیتا ہے آ کر جب مرے دل میں ۔۔۔ بہشت آباد وہ عہدِ بہاریں یاد آتا ہے
نظر جب دل کی اس اجڑی ہوئی بستی پہ پڑتی ہے ۔۔۔ حریمِ حسن کا ماحول نوریں یاد آتا ہے
برستے بادلوں میں بجلیاں جب کوند جاتی ہیں ۔۔۔ مجھے رقصِ تبسّم ہائے رنگیں یاد آتا ہے
شفق زارِ وفا میں سُرخیاں جن کی جھلکتی ہیں ۔۔۔ مجھے ان آنسوؤں کا رنگِ غمگیں یاد آتا ہے

مری دُنیا ہے ان بھولے ہوئے خوابوں کا گہوارہ
مری ہستی ہے ان بکھرے ہوئے قصوں کا شیرازہ

وہ دن وہ کیف میں ڈوبے ہوئے دن پھر گئے آخر ۔۔۔ فقط ان کا تصوّر رُوح پرور رہ گیا باقی
جہاں تھی نغمہ ہائے قدس کی ہنگامہ آرائی ۔۔۔ وہاں مغموم خاموشی کا منظر رہ گیا باقی
شبِ یلدائے رنج و غم تو ٹلنے میں نہیں آتی ۔۔۔ فقط اک انتظارِ صبحِ محشر رہ گیا باقی
لگی تھی جس کے آنچل پر درِ مقصود کی جھالر ۔۔۔ اب اس دامن میں اشکِ دیدۂ تر رہ گیا باقی
دماغ عطرِ پیراہن کی ساری حسرتیں نکلیں ۔۔۔ مگر سودائے گیسوئے معنبر رہ گیا باقی
طلسمِ حسن ٹوٹا مٹ گئی اس کی فسوں کاری ۔۔۔ مگر نیرنگِ عشقِ فتنہ پرور رہ گیا باقی

دلِ درد آشنا کی غم بداماںی نہیں جاتی
حیاتِ مضطرب کی شعلہ سامانی نہیں جاتی

جدّت

(اثر خامہ: سید عابد حسین عابدؔ مشہدی سی ۔ سٹی (راولپنڈی))

جانسن کا قول ہے کہ "شاعری کلام موزوں کا نام ہے۔ یعنی معلومات عقلیہ کو جذبات کی چاشنی سے آشنا کر کے حقیقت کو مسرت کے ہم آغوش کیا جائے۔ اور شاعری کی روح جدّت ہے" جدت اُس مخصوص اور فنی اسلوب بیان کا نام ہے۔ جو جذبات معمولی یا خیالاتِ عالیہ کو ایسی خوش اسلوبی۔ جدید انداز اور نئے اسلوب سے بیان کرے۔ کہ دل پھڑک اُٹھے۔ بعض علمائے فن کے نزدیک جدّتِ ادا ہی کا نام شاعری ہے۔ اور یہی شاعری کی روحِ رواں ہے ٭

جدّت کے متعلق لوگ مختلف الرائے ہیں۔ بعض اس کو آتشِ تصوّر کے نام سے پکارتے ہیں۔ بعض اس کو اسلوب بیاں ہی کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ حقیقت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس امر سے انکار کرنا ذرا مشکل ہے۔ کہ جدّت شاعری کا جزوِ لاینفک ہے۔ اور جانسن کا قول کہ "شاعری کی روح جدّت ہے" بالکل درست اور صادق ہے٭

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جدّت خیالات کے اظہار میں ہماری سب سے بڑی معاون ہوتی ہے۔ بلکہ جدّت ایک جسم ہے جس میں خیالات کی روح داخل کی جاتی ہے۔ روح ایک عنصرِ لطیف ہے جسے ہماری قوتِ باصرہ بھی دیکھنے سے عاجز ہے۔ صرف جسم ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جس کے وجود سے ہماری نظریں آشنا ہیں اگر جسم اچھا اور خوشنما ہوگا۔ تو دیکھنے والا فرطِ محبت سے اس کی بلائیں لینے لگے گا۔ اگر جسم میں کوئی خرابی یا بھونڈا پن ہوگا۔ تو کوئی شخص بھی اُس کی جانب التفات نہ کریگا۔ یہی حال جدّت ادا کا ہے۔ خیال خواہ کیسا ہی کیفیت زا اور پُرلطف کیوں نہ ہو۔ اگر اُس کے بیان کرنے میں جدت ادا سے کام نہ لیا جائے۔ تو وہ پُرلطف نہ ہوگا۔ اور وہ سامع کے دل پر کسی قسم کی کیفیت طاری نہ کر سکے گا۔ ایک مرتبہ حجّاج نے ایک بدّو سے دریافت کیا کہ کیا تم کسی راز کو چھپا سکتے ہو؟ اُس نے جواب میں کہا "میرا سینہ راز کا مدفن ہے"۔ اگر وہ یوں بیان کرتا۔ کہ "میں راز ہرگز ظاہر نہیں کرونگا" مطلب تو ایک ہی تھا لیکن جدّتِ ادا سے ایک خاص لطف پیدا ہوگیا۔ خدائے سخن میر تقی میرؔ فرماتے ہیں ؎

اب کی جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

مضمون کس قدر مبتذل ہے لیکن جدّت ادا اور اسلوب بیان لاجواب ہے۔ جس سے شعر کا ابتذال حُسن سے بدل گیا۔ ایک فارسی کا شعر ہے ؎

نہ باندازۂ بازوست کمندم ہیہات ورنہ باگوشۂ بامیم سروکارے ہست

عاشق معشوق تک پہنچنا تو چاہتا ہے لیکن رسائی کا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا۔ اُس کو اس طرح ادا کرتا ہے۔ "مجھ کو ایک گوشۂ بام سے کام تو ہے لیکن افسوس کہ جتنی قوت میرے بازو میں ہے اُس کے موافق کمند نہیں" دیکھا جدتِ ادا کس قدر وجد آفرین ہے۔ یہی تو جدتِ ادا کے کرشمے ہیں کہ دل ایک سرمدی کیفیت محسوس کرنے لگے۔

جلیل القدر جلیل قبلہ کا ایک شعر ہے فرماتے ہیں ؎

بے کسی میں بھی کلیجے سے لگی رہتی ہے　　بے وفا تو ہے وفادار ہے الفت تیری

یارِ بے وفا کی محبت کو کیسے اچھوتے رنگ میں پیش کیا۔ اسی لئے شاعری کی روح جدت ہی کو کہتے ہیں۔

مثلاً تلسی داس نے رام چندر جی کے حسن و جمال کا ذکر کس خوش اسلوبی سے کیا ہے ؎

دیکھن[1] باگ کنور دوُ آئے　　وے کشور سب بھانت سہائے

شیام گوُر کم کھوُں بکھانی　　گرا انین نین بن بانی

ترجمہ۔ دیکھنے باغ شہزادے دو آئے وہ نوجوان سب طرح اچھے لگے ۔ سانولا گورا کیونکر کہوں ۔ زبان بے آنکھ کی ہے، اور آنکھ بے زبان ہے) (یعنی دو شہزادے تفریح طبع کے لئے باغ میں آئے ہیں وہ نوجوان ہر طرح خوبصورت اور اچھے لگتے ہیں۔ ان کے حسن و جمال کی خوبی کیونکر بیان کروں۔ کیونکہ زبان کی آنکھیں نہیں اور آنکھوں کی زبان نہیں ہے۔ دیکھئے جدتِ ادا سے مفہوم کس قدر پُر لطف ہو گیا ۔

اگر کسی مصنف کو کسی واقعہ کا بیان کرنا مقصود ہے۔ تو اُس کے لئے مواد تو ہر حالت میں جمع ہی ہوگا۔ لیکن اس کی کوشش بلیغ اس امر کی مقتضی ہے۔ کہ وہ خیالات کو اس طرح بیان کرے۔ کہ سامع کے دل پر ایک کیفیت طاری ہو جائے۔ اور وہ خیالات کو ایسے اچھوتے رنگ میں پیش کرے۔ کہ سامعین کے ذہن میں کوئی حالت منتظرہ اس کے سُننے کے بعد باقی نہ رہ جائے۔ اسی طرح جب کوئی شاعر کسی واقعہ کو نظم کرنا چاہتا ہے۔ تو اُسے اثر کی تلاش ہوتی ہے۔ اگر شعر میں اثر نہیں۔ تو وہ ایک گلِ بے رنگ و بو ہے۔ یہی وجہ ہے جو اشعار جدتِ ادا سے معرّا ہوتے ہیں وہ مؤثر نہیں ہوتے۔ کیونکہ جدت ہی اثر کی ضامن ہے۔ اور جدت ہی سے اثر وجود میں آتا ہے۔ جدتِ ادا سے معمولی سے معمولی بات میں بھی ایک خاص حسن اور لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہی بات شعر بن جاتی ہے۔ جن لوگوں کے نزدیک وزن شعر کے لئے ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ اُس کی اہمیت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ تو وہ جدتِ ادا ہی کو شعر سے تعبیر کرتے ہیں۔ جدت ایک ذوقی کیفیت ہے۔ جو دل اور روح کی پہنائیوں میں بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کا انداز جس طرح ہر جگہ ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح اس کا پیرایہ بھی

---

[1] جب سیتا جی کی سہیلیاں رام چندر جی اور لچھمن جی کو راجہ جنک کے باغ میں سیر کرتے دیکھتی ہیں۔ تو فوراً سیتا جی کے پاس واپس جاتی ہیں۔ اور جو حقیقت انہوں نے دیکھی تھی۔ وہ سیتا جی سے بیان کرتی ہیں۔ یہ دوہا اُس واقعہ کے متعلق ہے ۔

غیر محصور ہے ۔

یوں تو حکیم الشعراء حضرت دل قبلہ کا کلام معجز التیام خصوصیات لفظی و معنوی سے لبریز ہے ۔ تغزل میں اثر کی تلاش ہے ہر شعر موسیقیت کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ آپ کے اشعار میں محاکات ۔ فلسفہ اخلاق و تصوف ۔ علوئے تخیل ۔ متانت سنجیدگی بلند پروازی ۔ جوش اور سادگی کا عنصر غالب ہے ۔ آپ ایک فلسفی کی طرح عام اور سطحی جذبات کو ذریعہ اظہار بنانے کے حامی نہیں ۔ آپ آسمان ادب سے ستارے توڑ کر لاتے ہیں اور زمین شعر پر بچھا دیتے ہیں ۔ کبھی آپکے ساز سخن سے شکست تار کی صدائیں نکلتی ہیں ۔ اور کبھی ایسے دماغ افروز اور فرحت افزا نغمے بلند ہوتے ہیں ۔ کہ دل مستانہ وار جھومنے لگتا ہے ۔ آپ کا کلام شوکت الفاظ ۔ رفعت تخیل ۔ حسن بندش اور مضمون آفرینی کے اعتبار سے لاجواب ہے ۔ عالی فکری ۔ بلند پروازی ۔ لوازم لفظی و معنوی تشبیہیں اور استعارے ۔ صنائع و بدائع ۔ اچھوتے مضامین غرضکہ جس قدر محاسن ایک حقیقی شاعر کے کلام میں ہونے چاہئیں ۔ وہ بدرجہ اتم دکھائی دیتے ہیں ۔ آپ نازک سے نازک مضمون کو تشبیہ اور استعارہ کے زور سے معراج کمال تک پہنچا دیتے ہیں ۔ آپ کا رنگ تغزل مقبول خاص و عام ہے اور تشنگان ادب کی ایک کثیر جماعت آپ کے بحر تفکر سے سیراب ہو رہی ہے ۔ مگر آپ کے کلام فصاحت التیام کے مطالعہ سے جس چیز نے اپنی بے پناہ دلکشی سے میرے دل کو اپنی طرف کھینچا وہ آپ کی جدت ادا ہے ۔ اسی وجہ سے میں نے اپنے مضمون کا عنوان ہی جدت رکھا ۔

اس سے پیشتر بھی میں نے عرض کی تھی ۔ کہ شاعری کے لئے سب سے اہم اور مقدم چیز جدت ہے ۔ کیونکہ جب ایک بات سیدھی طرح سے ادا کی جائے ۔ تو وہ پر لطف اور بامزہ نہیں ہوتی ۔ اور نہ دل اس کے اثرات قبول کرتا ہے ۔ مگر جب وہی بات نئے انداز اور نئے اسلوب سے پیش کی جائے ۔ وہ موثر ۔ دلکش اور جاذب ہوتی ہے اور روح کی گہرائیوں تک اتر جاتی ہے ۔ پس اسی کا نام جدت ہے ۔ اب ہم حضرت اعتبار الملک قبلہ کے کلام سے اس کی چند ایک مثالیں پیش کرتے ہیں ۔ مثلاً ؎

اُن کے لئے اک کھیل ہے ناوک کا چلانا سمجھے ہیں کہ پہلو میں کوئی دل نہیں رکھتا

محبوب کی ناوک افگنی کیسے اچھوتے رنگ میں پیش کی ہے ۔ اسی طرح یہ دکھاتا ہے ۔ کہ فنا میں بقا ہے فرماتے ہیں ؎

جو ڈوب کر پھر کبھی نہ ابھرا ہوا وہی آشنائے ساحل بقائے دائم کا اک مرقع غریق بحر فنا کو دیکھا

مثلاً مضمون یہ ہے ۔ کہ میری خاموشی ہی شرح آرزو تھی ۔ اسے کس خوش اسلوبی سے بیان فرماتے ہیں ۔ جو مستغنی از داد ہے ؎

آخر مری خموشی مقتل میں رنگ لائی ہر قطرہ خون دل کا اک شرح مدعا تھا

مثلاً محبوب کی وعدہ خلافی کا قصور قسمت کے سر تھوپتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ہونہ الغایہ اپنی قسمت ہے اُس نے وعدہ تو بار بار کیا

مثلاً یہ بات کہنی ہے۔ کہ عشق میں ناکامیوں سے گھبرانا نہیں چاہیئے ؎

راہِ طلب میں ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی کہتا ہے عشق ترکِ تمنا نہ کیجیئے

؎ یہ بھی ہے اک کرشمۂ حسنِ ستم ظریف وعدہ تو کیجیئے مگر ایفا نہ کیجیئے

حسن کی وعدہ خلافی کیسے اچھوتے رنگ میں دکھائی۔ ایک اور جگہ وعدہ فراموشی کے متعلق فرماتے ہیں ؎

تجھ پہ او وعدہ فراموش مری جان نثار ہاں پھر اک بار یہ کہہ دے کہ مجھے یاد نہیں

یہ شعر جدت کی بہترین مثال ہے ؎

ضعف میں دنیا سے اُٹھ جائینگے ہم ساتھ لے کر ناتوانی جائے گی

مثلاً "حیائے تسکین کے لئے اضطراب ضروری ہے" اس مضمون کو بھی ندرت ادا سے معراج کمال تک پہنچایا ہے فرماتے ہیں ؎

درحقیقت مضطرب دل کے لئے وہ موت تھی اصطلاحِ عام میں تسکین جس کا نام تھا

مثلاً اپنے زخم کے لاعلاج ہونے کے متعلق فرماتے ہیں ؎

خدارا رحم کر اے چارہ گر ہے یہ نمک پاشی ہمارے زخم دل کو کیا تعلق تیرے مرہم سے

جلوہ نمائی کی خوبی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں ؎

اے دل یہ شانِ جلوہ نمائی تو دیکھنا وہ برق کی طرح اِدھر آئے اُدھر گئے

جدت کی ایک اور بہترین مثال ملاحظہ ہو فرماتے ہیں ؎

اللہ رے مآلِ شبِ وعدہ کا تصور نظروں میں سرِ شام سے آغازِ سحر ہے

بہار آئی ہے اور غنچے پھول بن رہے ہیں اس مضمون کو دیکھو کس خوش اسلوبی سے کہتے ہیں فرماتے ہیں ؎

خود بخود چاک ہوئے جاتے ہیں غنچوں کے لباس کچھ اس انداز سے گلشن میں بہار آئی ہے

مثلاً مضمون یہ ہے۔ کہ فصلِ بہار آئی ہے اور گلچیں پھولوں کو توڑ کر اپنے دامن میں جمع کر رہے ہیں ؎

دامنِ گلچین بنا ہے ہر گل تر کا کفن کیا اسی دن کے لئے فصلِ بہار آنے کو تھی

مذکورہ شعر جدت کی بہترین مثال ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

ہنس ہنس کے کہہ رہے ہیں قاتل سے زخم بسمل ہاں اب نگاہِ برہم روکے ہنسی ہماری

جدتِ ادا کی یہ بھی ایک بہترین مثال ہے فرماتے ہیں ؎

ہر محوِ حُسن صورت آئینہ بن گیا — اب آئینہ کی اُن کو ضرورت نہیں رہی

تشبیہ :- تشبیہ کلام کا زیور ہے اور جدّت کی جان۔ اگر ہمیں یہ کہنا مقصود ہے۔ کہ فلاں شخص بہت خوبصورت ہے اگر انہیں الفاظ میں یہ مفہوم ادا کریں تو پُر لطف نہ ہوگا۔ ہاں اگر یوں کہیں۔ کہ فلاں شخص ماہتاب ہے۔ تو یہ تشبیہ ہوگی۔ اس سے کلام میں زور اور اثر زیادہ ہو گیا۔ بہت سی بے مزہ۔ بے کیف اور روکھی پھیکی باتیں تشبیہ کی مدد سے پُرکیف۔ بامزہ اور مؤثر ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اعتبار الملک قبلہ فرماتے ہیں ؎

فراقِ یار میں دشوار ہے آزادِ غم رہنا — مرے تارِ نفس اب تو سلاسل ہوتے جاتے ہیں

تارِ نفس کو سلاسل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مثلاً یہ شعر ہے ؎

عجب تشبیہ ہے اک شاہد یکتا کے دامن کی — مری تخئیل نے تصویر کھینچی برقِ ایمن کی

؎ سوز و گداز دل سے ہیں شکلِ شمعِ محفل — کٹتی ہے جوشِ غم میں یوں زندگی ہماری

سوز و گداز دل کو شمعِ محفل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

جی بھر آیا آہ کی اُس بزم سے رو کر اُٹھے — تشنہ لب اُٹھے مگر چھلکا کے ہم ساغر اُٹھے

دیکھا تشبیہ سے جدّت میں جان پڑ گئی ۔

استعارہ :- استعارہ بھی کلام کا زیور ہے اور جدّت کی جان۔ مثلاً ؎

یادِ لبِ حبیب میں جی سے گزر گئے — آبِ حیات سامنے تھا پھر بھی مر گئے

یادِ لبِ حبیب کو آبحیات سے استعارہ کر کے کیسی پُر لطف بات کہی جو مستغنی از توصیف ہے۔

حضرت اعتبار الملک قبلہ کا ایک اور شعر ہے فرماتے ہیں ؎

اشکِ خوں آنکھ سے ڈھلتے ہیں تو کیا کرتے ہیں — غم کی تصویر میں یہ رنگ بھرا کرتے ہیں

؎ مدام داغِ محبت سے دل رہے روشن — کبھی چراغ نہ گل ہو غریب خانے کا

مذکورہ شعر استعارہ کے زور سے معراجِ کمال پر پہنچ گیا ؎

کس قدر دلچسپ ہوگا منظرِ ناز و نیاز — تیر برسائیگا کوئی پھول برسائینگے ہم

دو شعر اور ملاحظہ ہوں فرماتے ہیں ؎

حسینوں کا شباب آغاز ہے آشوبِ محشر کا — یہ جب اس سن میں آتے ہیں قیامت بن کے آتے ہیں

بن بن کے دل کی حسرت رہ رہ کے مثلِ نشتر — کیوں اے خیالِ جاناں ہم کو ستا رہا ہے

حسرت کو نشتر سے استعارہ کر کے جو ستانے کا مفہوم بیان فرمایا ہے قابلِ داد ہے ؎

کاوشِ غم سے عجب عالم ہمارے دل کا ہے — سینۂ مجروح منظر کوچۂ قاتل کا ہے

سینۂ مجروح کو کوچہ قاتل کہا ہے۔

تمثیل اور کنایہ:۔ تمثیل اور کنایہ بھی محاسن کلام کے لئے ضروری ہے۔ ان کا درجہ تشبیہ اور استعارہ سے کم نہیں۔ بہت سی بے مزہ اور روکھی پھیکی باتیں کنایہ اور تمثیل کی مدد سے تیر و نشتر بن جاتی ہیں۔ خیالات کی وسعت چونکہ دائرۂ زبان سے وسیع تر ہے۔ اس لئے اگر شاعر کو ان چیزوں کے استعمال پر قدرت کامل نہ ہوگی۔ تو بہت سے جذبات اور ارمنی خیالات ادا ہونے سے پہلے ہی مردہ ہو جائیں گے۔ اور بہت سے دقیق اور لطیف خیالات گونگے کا خواب بن جائینگے۔

میر انیس مغفور کا یہ شعر کنائے اور استعارے کی بہترین مثال ہے فرماتے ہیں ؎

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار　　خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

مثلاً خدائے میر تقی میر فرماتے ہیں ؎

تڑپ کے خرمن گل پر کبھی گرا اے بجلی　　جلا تا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا

دیکھا تمثیل سے کلام میں کس قدر زور اور اثر پیدا ہو گیا۔

اعتبار الملک قبلہ فرماتے ہیں ؎

تقاضائے وفا ہے پیکر ہستی مٹا دینا　　مجھے درس فنا یارب مثال نقش پا دینا

اس شعر کو تمثیل اور کنایہ نے معراج کمال پر پہنچا دیا ؎

ہنگامہ زا ہے کیا کیا دنیا دل حزیں کی　　ہم لطف اٹھا رہے ہیں خلوت میں انجمن کا

اس شعر میں کنائے سے کام لیا گیا ہے۔

دو شعر اور ملاحظہ ہوں فرماتے ہیں ؎

مثال پائی نہ اب تک جمال دلبر کی　　مری نظر میں ہیں رعنائیاں گل تر کی
فضا میں گرد پریشاں کو دیکھ اے غافل　　مٹی مٹی سی یہ تصویر ہے ترے گھر کی

ان اشعار میں بات تو ایک ہی تھی۔ جو پہلے مصرعے میں کہدی تھی۔ لیکن باکمال شاعر نے جب ان کو اثر سے معرا دیکھا تو تمثیل سے کام لے کر وہ کیف اور اثر پیدا کر دیا۔ جو محتاج بیان نہیں۔

مختصر یہ ہے کہ تمثیل اور کنایہ۔ تشبیہ اور استعارہ زیور کلام ہیں۔ ان سے دلی خیالات اور جذبات کی سی دعن تصویر کھچ جاتی ہے۔ اور ادائے مطلب کے لئے نئے نئے اسلوب اور مختلف پر لطف پیرائے نکل آتے ہیں جن سے کلام پر اثر اور پر زور ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک ایک لفظ اتنا مطلب ادا کر دیتا ہے۔ جو سطروں میں بھی نہیں سما سکتا۔ اور ان ہی کے طفیل کلام میں جدت۔ ندرت زور اور اثر پایا جاتا ہے۔ اگر طرز ادا کی جدت کلام کے اثر کی ضامن ہے تو تشبیہ اور استعارے کی ندرت بھی اثر کے لئے موجب تقویت ہے۔ لیکن ہر جدت پر لطف اور بامزہ نہیں ہوتی

اور ہر استعارہ باا ثر اور ہر تشبیہ پُر کیف نہیں ہوتی۔ بعض اوقات یہی چیزیں کلام کو مضحکہ خیز بنا دیتی ہیں ؛

جدتِ تخیّل کی بے راہ روی مفصلہ ذیل مثالوں سے ظاہر ہے ؎

چشم میں سُرمے کا دنبالہ بنا کر یوں لے — کیا عصا ٹیک کے ہو جائے کھڑی میری آنکھ
رات دن خوباں کو ہے لباسِ سفتوں کی تلاش — جس طرح ہوتی ہے افیونی کو افیوں کی تلاش
نوکِ مژہ پہ اشکِ صباحت نظام ہے — سونٹے پہ آبنوس کے چاندی کی شام ہے

ان مثالوں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور تمثیل کی موجودگی سے بھی مذکورہ اشعار بہت ہی پست ہیں۔ مولانا سیمابؔ فرماتے ہیں ؎

اک تڑپ پیدا ہوئی اس میں وطن کے رو سے — ہو گیا وہ آشنا دشت وچمن کے درد سے
جا کے ویرانوں میں رویا تشنگیٔ خار پر — انجمن میں نالہ کھینچا، انجمن کے درد سے
پابہ گل فطرت کی ان رعنائیوں کو دیکھ کر — چیخ اٹھا کاوشِ سروسخن کے درد سے

ایک جلوہ بھی نہ پھر باطل نظر آیا اُسے
سینۂ ہر ذرّہ میں اک دل نظر آیا اُسے

مفہوم :- شاعر دردِ وطن سے بیتاب ہوا۔ ویرانہ آبادی کی ہر کمزوری سے اُسکو ہمدردی پیدا ہو گئی۔ حتیٰ کہ ویرانوں میں کانٹوں کی تشنگی پر رو پڑا۔ اور آبادی میں سوسائٹی کی بدحالی پر آنسو بہائے۔ سروسخن جو شاہکار فطرت ہے انکو مقید قیام دیکھ کر چیخ اُٹھا۔ اُس کو ہر مخلوق میں جلوۂ حقیقت نظر آیا ؛

ہم نے اس بند کو معقولیت کا سفید جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے ناظرین خود اندازہ فرمائیں۔ ورنہ اس بند کے پہلے تین شعر جس قدر ژولیدہ اور پریشان ہیں وہ صاف ظاہر ہے۔ چوتھا شعر البتہ کچھ ڈھنگ کا ہے! وہ بھی اس لئے کہ بے ربطگیوں اور الجھنوں کے ہنگامے میں ذرا سی سنجیدگی بھی غنیمت معلوم ہوتی ہے ؛

اس بند میں دشت وچمن کی ثقیل ترکیب کے علاوہ درد کی اضافت بھی موجود ہے" دشت وچمن کا درد" شاعر ہی جانے کہ کیا بلا ہے اور یہ استعارہ کس قدر بھونڈا ہے! ۔ رسا تھ ہی جو جدت پیدا کی گئی۔ وہ نور ٌ علیٰ نور ہے۔" کاوشِ سروسخن کے درد" کو ملاحظہ فرمایئے تو اِس اضافت کی لعنت گلو گیر تھی ہی کہ لفظ "کاوش" کے غلط استعمال نے اس کو اور بھی مردود کر دیا۔ علاوہ ازیں ہم نے اس شعر کو سیاق وسباق کے لحاظ سے جو معنی پہنا دیئے ہیں وہ اسکے الفاظ سے ترشح نہیں ہوتے۔ اس شعر کی نثر یوں بنتی ہے . . . . .

(شاعر) فطرت کی ان رعنائیوں کو پابہ گل دیکھ کر کاوشِ سروسخن کے درد سے چیخ اُٹھا۔ الفاظ کی ترجمانی یہ ہے کہ شاعر نے فطرت کی ان رعنائیوں کو دیکھا۔ اور کاوشِ سروسخن کے درد سے چیخ اُٹھا۔ اب سوال یہ ہے کہ "ان رعنائیوں" سے کیا مراد ہے! "درد کاوشِ سروسخن کا درد" کیا بلا ہے۔ دیکھا شاعر جدت کی دھن میں کس قدر گمراہ ہو گیا ؛ فقط

دل سے خطاب

نہ کچھ فکر جزا تجھ کو نہ کچھ خوفِ سزا تجھ کو
یہ آخر کیا ہوا ہے اے دلِ بے مدعا تجھ کو؟

تجھے خود اپنی ہستی پر بھی شک ہوتا ہے یہ کہ
نہ اقرارِ بقا تجھ کو نہ انکارِ فنا تجھ کو!

کہاں تک روحِ غم بھرتا رہیگا قلبِ ہستی میں
ملے گا گریۂ بے سود سے دنیا میں کیا تجھ کو؟

تجھے ہر درد پنہاں کی نئی تاویل ملتی ہے
نظر آتی ہے ہر عشرت میں مضمر ابتلا تجھ کو!

نظامِ دہر میں تیری بھی فطرت کوئی فطرت ہے
نہ دولت کی خوشی تجھ کو نہ عشرت کا گلا تجھ کو؟

تری فیاضیاں اللہ اللہ اس غریبی پر
کسی کو سونپ دے عالم جو قدرت نے دیا تجھ کو!

تری خاطر ضمیرِ فطرتِ انساں نہ بدلے گا
کہاں سے لا کے دے کوئی رفیقِ بے ریا تجھ کو؟

خدا معلوم تو کرتا ہے کس عالم کا نظارہ
نظر آتی ہے ہر ذرہ میں تصویرِ وفا تجھ کو!

بدل دے اپنی فطرت کو کہ آئینِ کہن بدلا
زمیں بدلی فلک بدلا، زمانے کا چلن بدلا

(محمود اسرائیلی)

جذباتِ دل

غزل مشاعرہ نمائش شاہجہان پور

پھر اعتبارِ عشق کے قابل نہیں رہا
جو دل تری نظر سے گرا دل نہیں رہا

تسکین و ضبط کا متحمل نہیں رہا
ناصح ترے فریب میں اب دل نہیں رہا

معراجِ چشمِ شوق ہے اے قیس وہ مقام
حائل جہاں سے پردۂ محمل نہیں رہا

نشتر چبھوئے اب نہ پشیمانیِ نگاہ
مجھ کو تو شکوۂ خلشِ دل نہیں رہا

ٹکرائے سر کہاں کوئی مایوسِ آرزو
مشقِ ستم تو شیوۂ قاتل نہیں رہا

آئی صدا کہ اب تری منزل قریب ہے
جب امتیازِ جادۂ منزل نہیں رہا

وارفتگی نے مجھ کو پھرایا جہاں جہاں
اُن مرحلوں میں ساتھ کہیں دل نہیں رہا

ہر سجدۂ نیاز ہے محرومِ آستاں
میری جبیں کا اب کوئی حاصل نہیں رہا

موجیں اُبھار کر مجھے جس سمت لے چلیں
حدِ نگاہ تک کہیں ساحل نہیں رہا

کیا کہئے اب مآلِ محبت کی داستاں
یاد اس کی رہ گئی ہے مگر دل نہیں رہا

اے دل بہارِ حسنِ حقیقی نظر میں ہے
ہو محوِ رنگ و بو وہ مرا دل نہیں رہا

عالیجناب اعتبار الملک لسان الدھر حکیم الشعرا جناب دل شاہجہانپوری

کے

خوش گو تلامذہ

(از مولوی اشفاق حسین صاحب لودھی فاضل منشی کامل۔ ادیب فاضل۔ مراد آباد۔ یو۔ پی)

جناب دل کے فضائل و کمالات سے ملک کے ایک بڑے طبقہ نے فیض پایا۔ اور بارگاہ دل سے بیشمار ارباب ذوق نے لطف سخن اٹھایا۔ آپ کے تلامذہ کی تمام و کمال فہرست پیش کرنا بہت دشوار امر ہے۔ اس کڑی میں چند خوشگو تلامذہ کے اسمائے گرامی درج کئے جاتے ہیں :-

(۱) افضل الشعرا مولوی عابد حسین صاحب عابد شاہجہانپوری۔ آپ اب ایک کثیر جماعت کے استاد ہیں۔ تلامذہ جناب دل میں ان سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ **نمونہ کلام**

راز طوفاں سے بے خبر دل ہے　　ڈوب جانے کا نام ساحل ہے
کھنچ گئی دامن پہ تصویر نیاز　　ڈھل کے ہر آنسو اک افسانہ ہوا
مجھ سے پوچھو دلکشیٔ گل کا راز　　جوش پر رعنائیٔ مستور ہے
ترے جلوے ہیں دل پامال میں　　آئینہ خانہ بے جب سے چور ہے
دیکھ تو لے نگاہِ بے پروا　　اشکِ پیہم ہیں شکوۂ خاموش
دل کے ذروں میں روح دوڑ گئی　　کوئی دیکھے ترا تبسم ناز
ابھر آئے نشان سجدوں کے　　ذرّہ ذرّہ ہے شرح جوش نیاز
ان حجابوں پہ جب خدا کہئے　　سامنے آئے وہ تو کیا کہئے

(۲) منشی عبد الرحیم خاں ورد شاہجہانپوری۔ نہایت خوشگو شاعر ہیں۔ آپ کا کلام اکثر رسائل میں طبع ہوتا ہے

نمونہ کلام

دشت بھی زنداں نظر آنے لگا　　اب میری وارفتگی اک راز ہے
دل کے مٹنے تک رہا کچھ امتیاز　　آگے رودادِ وفا اک راز ہے
بن گئی ناکامیٔ پیہم جواب　　ہر سوال اب تک طلسم راز ہے

کوئی دیکھے تو سہی جوشِ وفا — اک نشاطِ روح سوز و ساز ہے
لن ترانی تک تو ہم سمجھے جواب — اب مآلِ التجا اک راز ہے
دردِ کوئی سننے والا ہی نہیں — ورنہ خاموشی بھی اک آواز ہے
ترکِ بیداد سے دل ہوگا پشیماں میرا — آپ دیکھیں نہ کبھی حالِ پریشاں میرا
سوچتا ہوں کبھی تبدیل بھی ہو سکتا ہے — ان کا اندازِ تغافل غمِ پنہاں میرا
آپ کے طرزِ تغافل پہ ہے دنیا کی نظر — ایک افسانہ ہوا چاکِ گریباں میرا
زندگی تیری امانت سہی اے چشمِ ستم — جورِ پیہم کہیں بن جائے نہ درماں میرا

(۳) مولوی منظور حسین خاں مضطر بی۔ اے۔ مولوی فاضل۔ شاہجہانپور۔ آپ ناظم اور ناشر بھی ہیں کہنہ مشق۔ نغز گو شاعر ہیں۔ اکثر پرچوں میں آپ کا کلام دیکھنے میں آیا ہے۔ نمونہ کلام

خدا معلوم کس حسرت کو لے کر — جبیں پہنچی ہے تیرے آستاں تک
وسعتِ دل میں اڑا کرتی ہے خاکِ حسرت — اب مقابل میں کوئی اس کے بیاباں کر دے
یوں تو روداد محبت کی ہے تفصیل دراز — میری تصویر کوئی شاملِ عنواں کر دے
یہ مانا بحرِ الفت کی نہیں سرحد مگر ہم تو — جہاں دل ڈوب جاتا ہے وہیں ساحل سمجھتے ہیں
ہاتھ آیا جو دمِ یاس تمہارا دامن — مل گیا بحرِ محبت کا کنارا مجھ کو
خلشِ نوکِ مژہ کاش رہے دل میں مرے — ایک تنکے کا بھی کافی ہے سہارا مجھ کو
اس فضائے بیخودی میں لے گیا ہے شوقِ دید — جس جگہ کچھ بھی نہیں نام و نشانِ زندگی
انتہا یہ ہو کہ بن جائے کسی کا آئینہ — دیدۂ پُر آرزو کو اور حیراں کیجئے
تیری رفتار سے پامال ہوئی جاتی ہے — اے صبا! کون مری خاکِ نشیمن دیکھے
میں ہر نوائے راز کو سمجھا سکوں شرح — گوش آشنا ہے نغمۂ مستانۂ الفت
مضطر ادب سے دیدۂ حیراں کو پیش کر — آئینہ کوئی اُن کے مقابل نہیں رہا

(۴) ماسٹر تبارک علی صاحب عبرت صدیقی بریلوی۔ آپ کا کلام جذبات سے مالا مال ہے۔ بلحاظ شاعری آپ کا مرتبہ مسلّم ہے۔ نمونہ کلام

واقعاتِ عشق ہیں ناگفتنی — مختصر یہ ہے کہ دل مجبور ہے۔
کس توقع پر اٹھائی تھی نظر — ڈوبنے والے نے ساحل کی طرف
بنا آئینہ حسنِ رُخِ زیبا ہر اک ذرہ — فنا ہو کر بھی اے دل تیری حیرانی نہیں جاتی

لرزتی ہیں فضائیں کائنات عشق برہم ہے — نگاہِ نازتیری فتنہ سامانی نہیں جاتی
اے عشق مبارک ہو اب لذت جانبازی — کھینچی ہوئی مقتل میں شمشیر نظر آئی
آنکھوں سے ٹپکتی ہے لہو بن کے تمنا — پیوست رگِ دل ہے تیر اثیر نظر آج
بیخودی میں امتیاز دیر و کعبہ تھا کسے — جس جگہ سر رکھ دیا وہ آستانِ ناز تھا

(۵) سیّد دل محمد فضا منشی فاضل جالندھری۔ آپ کے جذبات نہایت پسندیدہ ہیں۔

میں ذرۂ برباد ہوں دنیائے وفا میں — دل کیا ہے مرا سوختہ سامانِ تمنا
غرق ہو یہ کاش بحرِ عشق میں — کشتیٔ دل کو ہے ساحل کی طلب
جہاں دل مجھ سے بیگانہ تھا میں تھا دل سے بیگانہ — نظر کے سامنے آیا کئے ایسے مقام اکثر
فطرتِ عشق بدل دی مری ناکامی نے — اب وہ دل ہے نہ وہ جوشِ وفا کیا باعث
آہِ دلِ پُرجوش ہے مانوسِ اثر آج — رگ رگ سے ٹپکتا ہے مرے خونِ جگر آج
دفعتاً کیا جانے کیا آیا خیال — اُٹھ چکے تھے ہاتھ داماں کی طرف

(۶) اظہر الحق نعمانی اظہرؔ رودلوی حال وارد بھڑائچ۔ (نمونہ کلام)

دیکھا کرشمہ سازی تصویر یار کو — حیراں بنا دیا نگہ انتظار کو
تھک تھک گئے رہروانِ الفت — منزل کا مگر پتا نہیں ہے
رازِ نیازِ عشق کو افشا نہ کیجئے — یوں چشم دلفریب سے دیکھا نہ کیجئے
وہ جلوۂ لطیف حریفِ نگاہ ہے — سعیٔ نظارۂ رُخِ زیبا نہ کیجئے

(۷) علامہ ابوالاقبال عیشؔ فیروزپوری ایڈیٹر رسالہ ریاضِ سخن۔ (نمونہ کلام)

دیکھ کر نازک سا اِک خنجر کفِ جلاد میں — محو ہے ہر سر کہ نعرہ شورِ مبارک باد میں
پابہ زنجیر آئے ہیں ہم گلشنِ ایجاد میں — آنکھ کھولی بھی تو کھولی خانۂ صیاد میں
فصلِ گل آئی تو مانگی یہ اسیروں نے دعا — آسماں سے پھول برسیں خانۂ صیاد میں
جان جاتی ہے تو جائے عشق میں دل کی طرح — محو ہیں ہم تو خیالِ ہرچہ بادا باد میں
سب تیری مرادیں بر آئیں تو پوری مرادِ دل کر دے — آسانیوں میں رہنے والے آسان مری مشکل کر دے
میری ہی طرح یہ کتنا ہوا نکلا ہے مہِ نو گردوں پر — او نور کے پتلے بام پہ آ ناقص ہوں مجھے کامل کر دے

(۸) منشی غلام حسن کسرےؔ سیدی ضلع راولپنڈی۔ (نمونہ کلام)

نیازِ عشق میں مضمر ہیں حسن کے جلوے — ہوں مشتِ خاک مگر مظہرِ خدا ہوں میں

چشمِ خونبار کا شکوہ ہے مجھے شامِ فراق — کشتیٔ دل کو ڈبو دیگی یہ گریاں ہو کر
وہ دردِ دل میں سموئے ہوئے مرے ارماں — وہ کیفِ حسن میں ڈوبا ہوا شباب ترا
عشق کی ناکامیوں سے کھل گیا — حسن کی فطرت سراپا راز ہے
داغ عصیاں کا عبث ہے تجھ کو اے اہدؔ گماں — خوب دھویا میکشوں نے آج دامن پھول میں
رُوح پہ درتھی جواب تک وہ تمنا کیا ہوئی؟ — عالمِ احساس کی دلکش وہ دنیا کیا ہوئی؟

(۹) محمد عمر۔ صدیقی تلہر۔ یو۔ پی۔ عمر۔ (نمونہ کلام)

آج اشکوں سے ہم وضو کر کے — جا رہے ہیں حرم کو بہرِ نماز
ہیں جتنی یہ کاوشیں خلشِ آرزو سے ہیں — دل دے کے پھر کسی کی تمنا نہ کیجئے
پیشِ نگاہِ شوق ہے لطفِ انتظار — وعدہ ضرور کیجئے ایفا نہ کیجئے
عمرؔ وہ روزہ اُس پہ تمناؤں کا ہجوم — کیا کیجئے جہان میں اور کیا نہ کیجئے
دنیا مرے سکون کی برباد ہو گئی — ظالم ترا خیال بھی صبر آزما ہوا

(۱۰) شیخ معراج الدین صاحب شامیؔ سٹینوگرافر ڈپٹی کمشنر صاحب ضلع جالندھر۔ (نمونہ کلام)

نمودِ عشق ہے میرا سراپا آرزو ہونا۔ — کبھی ایسا بھی ہو میں حسن کی وادی میں گم ہوں
نگاہِ ناز نے بیگانۂ عالم کیا مجھ کو — یہ حالت ہے کہ اب تک لذتِ بیداد میں گم ہوں
مری ناکامیوں میں ہے نہاں عالم مسرت کا — کہ ہوں اک نغمۂ دلکش مگر فریاد میں گم ہوں
تغافل جس کی فطرت تم ہو وہ حسنِ ستم پرور — میں ناکامِ تمنا عشق کی بنیاد میں گم ہوں

(۱۱) چوہدری عشرت حسین صاحب عشرتؔ ردولوی۔ نمونہ کلام)

خدارا اہلِ محشر تم بھی آ کر غور سے سن لو — ہم ان سے اپنی بربادی کا آج افسانہ کہتے ہیں
مری حیات تری اک نگاہِ لطف و کرم — اسی پہ زندگیِ جانِ زار باقی ہے
یہ دامن خونچکاں دیکھو یہ چشمِ خونفشاں میری — انہیں سے حالِ دل پوچھو انہیں سمجھو زباں میری
یہ قسمت کا کرشمہ ہے کہ عشرتؔ جب بہار آئی — ہوا کے دوش پر ہم نے چمن میں آشیاں دیکھا

(۱۲) شیخ محمد حسین صاحب صوفیؔ کانپوری۔ (نمونہ کلام)

جوشِ طلب سے منزل خود آگئی ہے کھنچکر — اب دیکھنا جدھر ہوں تیرا ہی آستاں ہے
دلِ صبر آزما فنا مستند ہے — کوئی مانوسِ امتحاں نہ رہا
ہاں ذرا تیغ آزما ہو کر تماشا دیکھئے — ایک عالم قتل ہونے کے لئے تیار ہے

راہِ طلب میں ختم ہوا یہ بھی مرحلہ ہے ضعف سے قدم کا اُٹھانا محال آج

(۱۳) صابر بٹالوی۔ (۱۴) آذر انجینئر بلاسپور۔

(۱۵) افتخار حسین خاں صاحب عارف رئیس شاہ آباد۔ محلہ اختیار پور ضلع ہردوئی۔

مندرجہ بالا تینوں حضرات بھی لحاظ مرتبہ شاعری نغز گو اور کہنہ مشق شاعر ہیں! افسوس کہ ان کا کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ ورنہ ضرور پیش کیا جاتا ؎

(۱۶) سید محمد میاں علیم شاہجہانپوری منشی کامل۔ (نمونہ کلام)

وحشت انگیز ہے جوشِ غمِ پنہاں میرا ہے ثابت نہیں رہنے کا گریباں میرا
اللہ اللہ یہ جوشِ اشک فشانی اے تبسم بھر دیا نالۂ خوش رنگ سے داماں میرا
چار تنکے ہی بمشکل آئے جلانے کے لئے برق نے پھونک ہی ڈالا سروساماں میرا
کچھ دنوں اپنی طبیعت پہ مجھے ضبط رہا وہ سمجھتے تھے اس کو کوئی آزار نہیں
آپ نے حالِ دلِ زار نہ پوچھا ہوتا آپ کے سر کی قسم قابلِ اظہار نہیں
دُنیائے حسن تک نہ رسائی ہوئی کبھی طے کر سکے نہ ہم کبھی میدانِ آرزو

نہایت مفید اور کارآمد باتیں

دلیا اور دودھ بیمار کے دل کو قوی اور مضبوط کرتا ہے ؎
توبہ گناہ کو گرا دیا کرتی ہے ؎
توبہ اُس وقت تک مقبول ہے۔ جب تک مغرب سے آفتاب نکلے ؎
توبہ گناہ سے پشیمانی اور بخشش مانگنا ہوتی ہے ؎
تواضع انسان کا درجہ بلند کرتی ہے ؎
تین چیزیں دل کو سخت کر دیتی ہیں۔ محبتِ طعام۔ نیند اور آرام طلبی ؎
تین چیزیں واپس نہیں کرنی چاہئیں۔ تکیہ۔ خوشبو اور دودھ ؎
والدین۔ مسافر اور مظلوم کی دعا قبول ہوتی ہے ؎
تین شخص جنت میں داخل نہیں ہونگے۔ والدین کا نافرمان بیٹا دیوث اور مردانہ شکل بنانے والی عورت ؎
تین چیزیں فساد کا موجب ہیں۔ خوبصورت بال۔ حسین چہرہ اور خوش آواز ؎
تین چیزیں یعنی پانی۔ گھاس اور آگ کو کسی پر بند نہیں کرنا چاہیئے ؎
پڑوسی اپنے ہمسایہ کے گھر یا زمین کا زیادہ حقدار ہے ؎
عورتیں نہ اکٹھی کی جائیں گی اور نہ جمع کی جائیں گی ؎
صفائی ایمان کی طرف بلاتی ہے ؎

قند پارسی

(جناب حکیم ضمیر الحسن خاں صاحب دلؔ شاہجہان پوری)

جناب لے این سپروڈی سی شاہجہانپور کی آمد پر نظم

خوشا وقتیکہ مقصودِ جبینِ آں آستاں دارم — شکوہِ عجز بالاتر زِ اوجِ آسماں دارم
بہارِ دہر بر بختم مبارک باد مے گوید — کہ چشمِ پُر طرب دارم دلِ راحت نشاں دارم
ز ترسِ دوزخ و لطفِ ارم دل مطمئن گشتہ — سکونِ مستقل فارغ ز فکرِ ایں و آں دارم
شمیمِ راحت افزا در دماغم عطر مے پاشد — معطر گشت روح و قلبِ من آں بوستاں دارم
فنا شد ظلم در عالم نہاں شد جہل و ظلمت — سخن داں علم پرور عدل گستر حکمراں دارم
منور گشت از تنویرِ مسٹر سپرو ایں عالم — بہ ظلِ عدل و انصافش ضمیرِ شادماں دارم
بہ بوئے گل صبا در گلشنِ ایجاد مے نازد — من از گلہائے لطفش نکہتِ عنبر فشاں دارم
مرا از فکرِ عالم امن و اطمینان شد حاصل — خوشا تقدیرِ خود پیرم مگر بختِ جواں دارم
خدایا در جہاں پایندہ دار آں ذاتِ عالی را — ز چشمِ فیض و انصافش نشاطِ جاوداں دارم
زبانِ من بہ ہر ساعت پئے توصیف می جنبد — لبِ مدحت سرائے حسن ز فریاد و فغاں دارم
مرا عذرِ سخن اوصافِ آں ممدوحِ بے پایاں — زبانِ بے دہاں دارم دہانِ بے زباں دارم
دلِ مسرورِ ہنگامِ طرب بر غنچہ مے خندد — غمِ دنیا اگر دارم نصیبِ دشمناں دارم
دمِ خندیدنِ ہر گل دلِ مسرور مے گوید — بہ ظلِ دامنِ لطفش بہارِ بے خزاں دارم
بہ ہر لمحہ عروجِ نیرِ اقبال او گوید — ز فضلِ ایزدِ مطلق جہاں گیرم جہاں دارم

ترا زیبد رضا جوئی دعا گوئی ثنا خوانی
بگو اے دلؔ بہ لب ذکرش بہ دل جوشِ بیاں دارم

اعتبار الملک حضرت دل کے کلام میں

سحریت

انگلستان کے مشہور ادیب اور نقاد سخن پروفیسر "لیزلے ایبر کرامبی" جن کا انداز تحریر ذرا خطیبانہ ہوا کرتا ہے اپنے ایک تنقیدی مقالہ میں شعر کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بات پر بہت زور دیا ہے، کہ شعر کی ایک مخصوص خصوصیت INCANTATION ہوا کرتی ہے، اس "انکنٹیشن" یا "سحریت" سے مراد الفاظ و تراکیب کا وہ جادو ہے، جس کی بدولت شاعر اپنے مافی الضمیر کو اس طرح بیان کر دیتا ہے، کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے اصل واقعہ کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ حالانکہ اگر اسی مضمون کو ہم بیان کرنے لگیں، تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں اور معانی پھر بھی تشنہ اظہار رہیں، شاعر کے سامنے الفاظ اس طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے ہیں۔ جس طرح بادشاہ کے سامنے اس کے غلام، اس لئے اظہار مطلب کے لئے وہ صرف ان الفاظ و تراکیب کا انتخاب کرتا ہے، جو اُس کے نقطہ نظر سے ایسے معانی کے حامل ہوں، جو اس کے تخیل کی بلندیوں سے ہم آہنگ ہو سکیں، وہ الفاظ پر قادر ہوتا ہے۔ اور اپنے خیالات و احساسات کے اظہار کے لئے اُن کو ایسے معانی عطا کر سکتا ہے، جو لغت کی پابندیوں سے آزاد ہوں تو ہوں، لیکن کوئی نقاد بھی اُن میں موقعہ اور محل کے لحاظ سے اور ادائیگی مطالب کے نقطہ نظر سے کسی افراط و تفریط کی گنجائش نہیں دیکھ سکے گا۔ شاعر ایک چابکدست صنّاع ہے، جس کی تعمیر میں سے ایک اینٹ گرا دو۔ تو ساری عمارت کی زیبائش خاک میں مل جائے گی، ......

اس کو آپ قادر الکلامی کہیں، خوبیٔ بیان کہیں، حسن اظہار کہیں، کچھ کہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے، کہ شاعر کو اپنے جذبات و تخیلات کے لئے آسمان کے تارے توڑ لانے پڑیں۔ تو وہ توڑ لائیگا، اور اگر خاک کے ایک پامال ذرہ کے اندر بھی وہی تابانیاں دیکھ لے گا۔ تو اس کے اٹھانے سے دریغ نہیں کریگا، اس کی تمام کاوش کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے، کہ جو کچھ وہ خود محسوس کر رہا ہے، اس کو ایسے معجزانہ انداز میں بیان کر دے کہ پڑھنے والے کے دل میں بھی وہی جذبات و تاثرات موجزن ہو جائیں، اس مقصد کی تحصیل کے لئے جس چیز کو وہ اپنا آلۂ کار بناتا ہے۔ اس کو "سحریت" کہیں گے، یعنی الفاظ و معانی کی ان باریکیوں اور لطافتوں کا انوکھا استعمال جن کی گہرائیوں تک صرف شاعر ہی کی نگاہیں پہنچ سکتی ہیں۔ اور جن کی معنوی وسعتوں کی حدود سے صرف شاعر ہی آگاہ ہوتا ہے۔

فرض کیجیے کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک گھنے اور تنگ و تاریک جنگل کو، آپس میں الجھی ہوئی جھاڑیوں کو، تناور اور فلک بوس درختوں کو اور ان کی بے تحاشا پھیلی ہوئی ٹہنیوں اور شاخوں کو آن کی آن میں کاٹ دیا گیا، اس عجیب غریب مشاہدہ کو اگر ہم بیان کرنے بیٹھیں، تو ہم تمام جزئیات کو بیان کرینگے، درختوں کی کاٹ چھانٹ، جنگل کی شکل و صورت، منظر کی نوعیت اور اس قسم کی سینکڑوں تفصیلات دینگے، تب کہیں جاکر سننے والے کے دل میں ہمارے مفہوم کا عکس سا پیدا ہوگا۔ لیکن سپنسر (انگریزی شاعر از 1550 تا 1598) اس کو ایک سطر میں بیان کر دیگا،

"آج جنگل سورج کی روشنی کو حیرت سے دیکھ رہا تھا"

(فری کوئین)

دیکھا آپ نے؟ اس کو کہتے ہیں "سحریت" اور ہمارے بیان کو "تشریح" لیکن شاعر نے چند لفظوں میں اس تمام طول و طویل داستان کو بیان کر دیا۔ گویا شاعر نہ صرف موزوں اور برمحل الفاظ کو منتخب کر سکتا ہے، بلکہ کسی واقعہ، یا منظر کی تصویر کھینچتے وقت وہ صرف اس کے ایک ایسے نمایاں یا غیر نمایاں پہلو کو بیان کریگا۔ جس کے ساتھ واقعہ کی دوسری تمام تفصیلات خود بخود ذہن میں کھچی چلی آئیں۔

ایک اور مثال سنئے، ہیرک (۱۵۹۱ء تا ۱۶۷۴ء) کہتا ہے،

"وہ ایک دل کو موہ لینے والی موج (....) ہے
ایک طوفانی گھاگھرے کے اندر!"

سترھویں صدی کی ایک نازک اندام حسینہ، ایک طویل و عریض گھاگھرا پہنے ہوئے جب چلتے وقت سمٹتا، پھیلتا اور چنٹیں کھاتا جاتا ہے۔ اور حسینہ کا وہ لطیف جسم جو قدم قدم پر لچک جاتا ہے اور لہرا اٹھتا ہے۔ آہ اس منظر کو اس سے بہتر الفاظ میں کون ادا کر سکتا ہے،

یا

"جب میری جولیہ ابریشمیں لباس پہن کر چلتی ہے
تو۔ تو میں سوچتا ہوں کہ۔
اس کے کپڑوں کی سیّالیت کیسی لطیف ہے،

ابریشم کا لباس، اور ایک مصروف خرام حسینہ کے متحرک جسم پر اس کا منظر "سیّال"! ...... اسی چیز کو کہتے ہیں سحریت، اور اس کی مثالیں انگریزی زبان میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ شعر کی یہ خصوصیت جس کا اصطلاحی نام "سحریت" ہوگا۔ اردو شاعری میں بھی پائی جاتی ہے؟

یہی خیال تھا جو مقالہ مذکور کو پڑھتے ہی میرے دل میں پیدا ہؤا، اور اسی سوال کو مدِّ نظر رکھ کر میں نے "نغمۂ دل" کا مطالعہ کیا ہے، میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہیں رہتی، جب میں دیکھتا ہوں، کہ جناب دلؔ کا کلام اس صفتِ عالیہ سے پوری طرح مالا مال ہے۔ مثلاً اُن کا ایک شعر ہے ؎

وہ بن سنور کے لئے دل تیور بدل رہے تھے　　آئینہ وقتِ زینت منہ انکا تک رہا تھا!

"سحریت سے لبریز ہر شعر میں صوری اور معنوی لحاظ سے دو خصوصیتیں ضرور موجود ہونگی، جس کو نکال دیا جائے تو شعر بے معنی ہو کر رہ جائیگا۔ یوں تو ہر لفظ، ہر حرف، اور ہر نقطہ اپنی اپنی جگہ پر مناسب ہوگا، مگر ان میں ایک ایک ایسی چیز ضرور ہوگی جس کو مرکزی درجہ حاصل ہو، اور تسلسلِ خیالات کا جس کو محور کہا جا سکے، دوسری خصوصیت نفسِ موضوع سے متعلق ہے۔ یعنی کسی بات، کسی واردات، کسی مشاہدہ، کسی تجربہ کا اظہار کرتے وقت شاعر اصل واقعہ کی تفصیلات وجزئیات میں نہیں جائیگا، بلکہ اشارہ اور کنایہ سے کام لیتا ہؤا صرف ایسی چیز کہے گا، اور اُس کو اپنی جادو نگاری کے طفیل ایسے رنگ میں پیش کریگا کہ بادی النظر میں معمولی اور غیر اہم نظر آئے، مگر حقیقتاً میں معانی اور معارف کی ہزاروں دنیائیں اپنے اندر لئے ہوئے ہوں، اور اس طرح پڑھنے والے کے دل میں اصل چیز کی ایک جذبات آمیز تصویر کھینچ دی جائے، کیونکہ مذکورہ بالا شعر میں "منہ اُن کا تک رہا تھا" صوری اور معنوی لحاظ سے شعر کی جان ہے"۔ "منہ ان کا تک رہا تھا"! کتنے سادہ اور عام فہم لفظ ہیں، مگر کتنی تخییلی بلندیاں اور تصویری خوبیاں لئے ہوئے ہیں۔

اسی طرح ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

کھچتی ہوئی اک شکل مجسّم نظر آئی　　دیکھا کسی مایوس نے یوں جانبِ در آج

جہاں یہ شعر جذباتِ رنگیں کے تار و پود سے بُنا ہؤا ہے، وہاں اس کی ایک بڑی بھاری خصوصیت یہ ہے، کہ ایک ہی مصرعہ میں شاعر کے خامۂ سحر طراز نے عالمِ تصوّر اور دنیائے خیال کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے، جب عاشقِ بیقرار عالمِ خیال میں اپنے محبوب کا تصوّر کرتا ہے، تو اس تصوّر کی ابتدائی شکل، ایک دھندلا بے نام ونشاں سا خاکہ ہوتا ہے، جس میں چند اُلجھے ہوئے، غیر نمایاں اور مبہم سے خطوط ہوتے ہیں اور بس، رفتہ رفتہ یہ خطوط واضح ہوتے چلے جاتے ہیں، اور وہ تصویرِ خیالی، تخیّل تصویری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ان دونوں درجوں کا تعلق حسبِ مراتب اس حس باطنیہ سے ہوتا ہے۔ جس کو قوتِ خیال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، یہاں تک ظاہری بصارت کچھ کام نہیں کرتی، اور ساری چیز غیر مرئی ہوتی ہے، لیکن اس کے بعد وہی چیز جو ایک وقت واہمۂ اختلاق کے ایک ادنےٰ کرشمہ کے علاوہ اور کچھ حیثیت نہیں رکھتی تھی، عین حقیقت بن جاتی ہے، اور وقتِ تصوّر عاشق کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے، گویا وہ اپنی ظاہری آنکھوں سے اپنے محبوب کو دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ

؎ ایک تو یہ کہ اس میں ایک آدھ ایسا مکمل اور جامع لفظ یا ترکیب ضرور ہوگی

حضرت دل کا یہ مصرعہ

کھچتی ہوئی اک شکل مجسم نظر آئی

بھی اسی راز کو وا انکشاف کر رہا ہے، مصرعہ کے تین ٹکڑے ہیں:۔

(i) کھچتی ہوئی

(ii) اک شکل مجسم

(iii) نظر آئی،

جو اپنی تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے تصور کے تین ارتقائی مراتب کو ظاہر کر رہے ہیں، چاہیئے تو یہ تھا کہ جس "مایوس" نے "جانب در" دیکھا تھا، یہ "شکل مجسم" صرف اسی کی آنکھوں کے سامنے "کھچتی ہوئی نظر آتی" لیکن لطف تو یہ ہے کہ آج جو بھی اس شعر کو پڑھتا ہے، وہی "تصویر مجسم" اپنی تمام جلوہ آفرینیوں کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے محو رقص نظر آتی ہے، اور اس کو کہتے ہیں "سحریت" !!

ایک اور شعر ہے ؎

وہ سرگرم ستم تھے، دم بخود صبر آزما دل تھا　　یہ عالم تھا کہ ٹھنڈی سانس بھرنا امر مشکل تھا

پہلے مصرعہ میں "دم بخود" اور دوسرے مصرعہ میں "ٹھنڈی سانس بھرنا امر مشکل تھا" عاشق کی مظلوم مجبوریوں کے پُر درد ترجمان ہیں۔ خاصکر دوسرے مصرعہ میں طوالتِ بحر، اور تسلسل الفاظ سے دم گھٹنے کی کیفیت پیدا کی گئی ہے، اور اس طرح اصوات و معانی کو ایک ایسی پُر اسرار ہم آہنگی بخشی گئی ہے۔ کہ پڑھنے والا "دم بخود" رہ جاتا ہے ؎

ادھر گھبرا کے غمخواروں کی مایوسانہ سرگوشی　　ادھر بیمار کا کچھ کہہ کے سب سے بے خبر ہونا

یہ بے نظیر شعر حقیقت میں ایک مکمل داستان ہے۔ ایک بیمار غم ہے، جس کی زندگی کی تمام امیدیں منقطع ہو چکی ہیں۔ اور موت اپنی تمام ہیبت زائیوں کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے منڈلا رہی ہے۔ اُس کے بستر مرگ کے اردگرد اُس کے اعزہ و اقربا تصویر الم بنے کھڑے ہیں، وہ دیکھ رہے ہیں، کہ بیمار چند لمحوں کا مہمان ہے۔ ان کی تمام قوتیں، حکمتیں اور دولتیں سب بیکار ہیں، کیونکہ وہ اس کی زندگی میں ایک پل کا اضافہ نہیں کر سکتیں، اس بیکسی کے وقت میں، امید و بیم کی اس کشمکش میں، یاس و قنوط کے اس عالم میں نہ جانے ان کا دل کونسے جذبات کی آماجگاہ بن رہا ہے ——— بے پناہ جذبات، جن کا اظہار مریض کے لئے خطرناک ہوگا، اور جن کا اخفا خود ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہے ——— چنانچہ وہ ان جذبات حزن و ملال کو، سوگوار نظروں کی جنبش سے، ہونٹوں کے معنی خیز ارتعاش سے، درد بھری ہچکیوں سے، دبی ہوئی آہوں سے ادا کر رہے ہیں، اس تمام منظر کو ایک مصرعہ میں اس طرح بیان کر دیا گیا ہے کہ نزع کے

وقت کا سارا ماحول آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

ادھر گھبرا کے غمخواروں کی مایوسانہ سرگوشی

اور اُدھر وہ جاں بلب بیمار ہے، جو زندگی اور موت کی مہیب کشمکش میں گرفتار ہے۔ اُس کی پتلیاں پھر چکی ہیں، اُس کے دل کی رگیں کھچی جا رہی ہیں، ہونٹوں سے طاقتِ گویائی سلب ہونے والی ہے، اور آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوا چاہتی ہیں، اسے بہت کچھ کہنا ہے، لیکن کہہ نہیں سکتا، داستان طویل، اور فرصت قلیل، لیکن پھر بھی اندوہ و کرب میں ڈوبی ہوئی آواز سُنائی دیتی ہے، ایک چیخ کی طرح باریک، ایک آہ کی طرح اندوہناک! اس قدر خفیف کہ ہوا میں ہلکا سا تموج نہیں پیدا کر سکتی، اور اتنی معنی خیز کہ اُس پر ہزار گویائیاں نثار ــــ اور اس کے بعد کا منظر ــــ دائمی خاموشی ــــ ابدی سکوت !!!

ادھر بیمار کا کچھ کہہ کے سب سے بےخبر ہونا

لیکن یہ سارے واقعات آن کی آن میں ظہور پذیر ہو جاتے ہیں، موت کا لمحہ پُر اندوہ زمان و مکان کی بندشوں سے کس قدر آزاد ہے، ابھی کچھ اور منظر تھا، اور ابھی کچھ اور رنگ ہے، اور اس خیال کو چابکدست شاعر نے "اِدھر" اور "اُدھر" دو لفظ استعمال کر کے ادا کر دیا۔ ملاحظہ ہو "ادھر" اور "اُدھر" کی معنی آفرینی! جن سے شعر میں ایک ایسی "سرعت" پیدا ہو گئی ہے، جس کا کہ نفسِ مضمون متقاضی تھا، الغرض یہ شعر "سحریت" کی بہترین اور کامیاب مثال ہے!

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اشعار بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں:-

اک طالبِ منزل کی دنیا متحرک ہے ‏ ‏ ‏ محسوس یہ ہوتا تھا ہر نقشِ کفِ پا سے
قیامت خیز اندازِ روش جب دیکھ لیتا ہوں ‏ ‏ ‏ تو کیا کیا چھیڑ میرے دل کے ارمانوں میں ہوتی ہے
چبھنے تھے خارِ صحرا محمل نشیں کے دل میں ‏ ‏ ‏ پیشِ نگاہ جب تک قیس برہنہ پا تھا

یہ دو شعر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ؎

میں اپنے چارہ ساز کا مظلومِ لطف ہوں ‏ ‏ ‏ ناوک کو کھینچتا تھا کہ دم ہی نکل گیا
افسوس اک اسیرِ قفس کی تمام عمر ‏ ‏ ‏ وقفِ نظر شناسئ صیاد ہو گئی

یہاں ہر شعر میں شاعر ایک ایسا جامع المطالب، اور کامل المعنی لفظ استعمال کر گیا ہے، جس کی موجودگی کی وجہ سے شعر میں جان پڑ گئی ہے، ملاحظہ ہو "مظلومِ لطف" اور "وقفِ نظر شناسی" ایسی تراکیب ہیں، جو شاعر کی قادر الکلامی کی زندہ مثالیں ہیں۔ ان کے بغیر شعر کا مفہوم تشنۂ تکمیل رہتا۔ اور ان کی بدولت شعر میں جو سوز، درد، اور اثر پیدا ہو گیا ہے۔ وہ بالکل معدوم ہو جاتا۔ خاص کر دوسرے شعر میں "افسوس" ہزاروں حُزنیں جذبات

کی آئینہ داری کر رہا ہے۔ اسی طرح ؎

یوں دل میں اُس کی یاد ہے نقشہ نظر میں ہے
گویا ہمارے ساتھ وطن بھی سفر میں ہے

اس شعر میں "وطن بھی سفر میں ہے" سے وہ کام لیا گیا ہے، جو دفتر کے دفتر سیاہ کر دینے سے حاصل نہیں ہو سکتا، اور اسی کو "سحریت" کہتے ہیں۔ کہ شاعر اظہار مطالب کے لئے اور جذبات کی ادائیگی کی خاطر، ایسے جادو بھرے الفاظ استعمال کرے، کہ جن کی طلسمی تاثیریں پڑھنے والے کے دل میں اس کے معہود ذہنی کا نقشہ کھینچ دیں، ـــــ دیکھیے ان شعروں میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے، اسی طرح حسب ذیل اشعار میں بھی "تصویری" اور "سحریاتی" خوبیاں پائی جاتی ہیں ؎

یہ مژدہ تھا عجب مژدہ کہ آتے ہیں وہ بالیں پر — نکل کر دل سے لے دل رک گیا آنکھوں میں دم میرا
برق نگاہ میں وہ اثر تھا کہ الاماں — پھر دل کسی کا ہاتھ نہ دل سے جدا ہوا
ستم ایجاد! خونِ آرزوئے بیکساں کب تک — قیامت ہے ترا خنجر اٹھا کر مسکرا دینا
شب غم کی مصیبت بھی قیامت نہ مصیبت تھی — یہ عالم تھا کہ اب نکلا مگر نکلا نہ دم میرا
غنچوں کو کیا نوید سنائی بہار نے — کھلکر چمن میں سب ہمہ تن گوش ہو گئے

اسی طرح اگر کلام دل کا بغور مطالعہ کیا جائے، تو اس قسم کی سینکڑوں مثالیں مل سکتی ہیں، جدید اُردو شاعری اس خصوصیت میں بہت ترقی کر رہی ہے، اور "سحریت" کی جھلکیاں کم و بیش ہر شاعر کے کلام میں نظر آنے لگی ہیں، مثلاً اقبال کا یہ شعر ؎

پتیاں جھڑتی ہیں پھولوں کی خزاں میں اس طرح
دستِ طفلِ خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح

یا حفیظؔ کا یہ مصرعہ

ابھی ذرّوں نے سطحِ ریگ پر آنکھیں نہ کھولی تھیں

یا کسی کا یہ شعر ؎

رات کی تاریک اور بھیگی ہوئی خاموشیاں — عرش سے لائی ہیں پیغام سکوں میرے لئے

الغرض "سحریت" کی خصوصیت ہر شاعری کا ایک لازمی اور لابدی جزو ہے۔ خاص کر جناب دل کے کلام فصاحت التزام میں یہ چیز بدرجہ اولیٰ پائی جاتی ہے ◆ (عبدالمجید۔ امجد بی۔ اے گھمبالوی)

دمہ کا مجرب علاج

مسٹر اینڈرو الڈانس نے رسالہ "فزیکل کلچر" کی تازہ اشاعت میں دمہ کے مریض کے لئے نہایت مجرب اور احتیاط سے منتخب کی ہوئی خوراک کی باقاعدہ فہرست شائع کی ہے۔ مسٹر موصوف کا تجربہ ہے کہ اس خوراک کے استعمال سے انہیں خود بھی دمہ سے آرام حاصل ہوا۔ اور ان کے دیکھتے دیکھتے بہت سے دوسرے اشخاص کو بھی صحت حاصل ہو گئی۔ خوراک کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے شروع سے ہی اس امر کی احتیاط رکھنی چاہیئے کہ انتڑیوں میں ہوا کی آمد و رفت آزادانہ جاری رہے اور تنفس میں کاوٹ نہ آنے پائے۔

غذا کے استعمال کے پہلے تین دنوں میں روزانہ ایک "کورٹ" سوڈا واٹر پینا چاہیئے اور پہلے ۱۱ یوم تک روزانہ دو دفعہ انتڑیوں کو غسل دینا چاہیئے۔ غذا حسب ذیل ہے:۔

پہلے دو سرے اور تیسرے دن حسب خواہش پھلوں کا رس ملا کر پیو۔ اس کی آمیزش میں انگور۔ لیموں۔ رنگترہ (سنترہ) اور ٹماٹر کا رس شامل ہونی چاہیئے۔ نیز رس کی مقدار کے مساوی پانی ملا لینا چاہیئے چینی یعنی کھانڈ وغیرہ ملانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

چوتھے دن سے چودھویں دن تک حسب ذیل مائع (سیال) خوراک استعمال کرو:۔

۷ بجے	صبح	رنگترہ (سنترہ) کے رس کا ایک گلاس
۹ "	"	مکھن والے دودھ کا ایک گلاس
۱۱ "	"	انگور کے رس کا ایک گلاس
۱۲ "	دوپہر	مکھن والے دودھ کا ایک گلاس
۱½ "	بعد دوپہر	پھلوں کا رس ملا ہوا ایک گلاس
۳ "	"	انگور کے رس کا ایک گلاس
۷ "	شام	انگور کے رس کا ایک گلاس
۹ "	"	مکھن والے دودھ کا ایک گلاس

ناشتہ

ایک رنگترہ - ۶ کھجوریں اور ۶ انجیر۔

دوپہر کا کھانا

خشک شدہ سبزی ترکاریوں کی پکی ہوئی ایک رکابی۔ سبزیوں میں گاجریں۔ ٹماٹر۔ شلغم خاص طور پر مفید ہوتے ہیں۔ ان پر لیموں کی رس اور زیتون کا تیل ڈال لینا اور بھی اچھا ہوتا ہے۔ کچے پھل یعنی سیب یا ناشپاتی اور ۶ کھجوریں۔

شام کا کھانا

وہی جو دوپہر کا کھانا۔ پھلوں کا انتخاب مریض کی مرضی پر منحصر ہے۔ ۲۸ ویں دن سے ۴۲ ویں دن تک ۔

پھلوں کے رس کی آمیزش کا استعمال بدستور جاری رہے۔ اس پر حسب ذیل اضافہ کر دیا جائے:۔ ابلی ہوئی سبزی ترکاریوں کی ایک رکابی مکھن کے ساتھ کھائی جائے۔ سبزی ترکاریوں میں گاجریں شلغم اور ساگ پات خاص طور پر مفید ثابت ہوتے ہیں۔ روٹی کا ٹکڑا مکھن کے ساتھ کھایا جائے۔ پھلوں کو مریض اپنی مرضی کے مطابق انتخاب کر سکتا ہے ۔

دوپہر اور شام کا کھانا ایک ہی ہے۔ البتہ پھل اور سبزیاں تبدیل کی جا سکتی ہیں۔ یہ خوراک کا مکمل دَور ہے۔ مسٹر آمسن کا ذاتی تجربہ ہے۔ کہ جوں جوں غذا کا دَور گزرتا گیا۔ مرض آہستہ آہستہ دُور ہوتا گیا۔ اور مجھے دمہ جیسے موذی مرض سے شفا حاصل ہو گئی۔ اس کے بعد سالہا سال گزر گئے ہیں۔ مجھے کبھی دمہ کی شکایت لاحق نہیں ہوئی۔ اگر مجھے کبھی تھوڑی سی شکایت بھی ہوتی ہے۔ تو میں فوراً مائع (سیال) غذا کا استعمال شروع کرتا ہوں جس سے میری صحت فوراً بحال ہو جاتی ہے ۔

(انتخاب لاجواب)

مکاشفاتِ دلؔ

(از حضرت دلؔ شاہ جہان پوری)

تجلی ہے مکاں سے لامکاں تک — تمہیں تم ہو نظر پہنچی جہاں تک
جو پہنچا بھی تو مر مٹ کر وہاں تک — مری منزل کی حد تھی آستاں تک
تجھے ڈھونڈھا دلِ حسرت نشاں نے — جہاں تک ہم پہنچا ہے وہاں تک
مرا ہر نقطہ غم کی داستاں ہے — سناؤں سرگذشتِ دل کہاں تک
قیامت ہے وہاں کا ذرّہ ذرّہ — اثر دنیائے دل کا ہے جہاں تک
مری قسمت کا حاصل کوئی دیکھے — رسائی ہے کسی کے آستاں تک
کوئی حد ہی نہیں چاکِ جگر کی — خدا جانے یہ پہنچے گا کہاں تک
رہِ دشوار سمجھے تھے عدم کو — یہاں سے ایک منزل ہے وہاں تک
سیہ بختی تو پیوستِ جبیں ہے — مٹاؤں داغِ ناکامی کہاں تک
اسیری میں مری آہوں کے شعلے — بھڑکتے ہیں قفس سے آشیاں تک
مجھے یہ دیکھنا ہے وقتِ گریہ — کہ دامن میں ہے گنجائش کہاں تک
وہ لختِ دل ہیں جوشِ غم کی تشریح — پہنچ جائیں جو چشمِ خونچکاں تک
جو ہیں راز آشنا اُن سے یہ پوچھو — مری دنیا کی وسعت ہے کہاں تک
یہ سرد آہیں ہیں میری راز در راز — کہ جس سے بیخبر ہے رازداں تک

کہی اک آخری ہچکی نے اے دلؔ
مری روداد ہستی تھی جہاں تک

شاعرانہ اسلوبِ بیان

(از۔ حضرت کسریٰ منہاس)

مختلف السنہ کے مختلف نقادانِ سخن نے جہاں شاعری کی دیگر خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے وہاں اسلوبِ بیان کو بھی شعر کے مخصوص محاسن کا عنصر لاینفک قرار دیا ہے۔ مثلاً:۔

لے ہنٹ (Leigh Hunt) کا قول ہے "شاعری اظہار ہے اس بے پناہ خواہش کا جو انسان حُسن حقیقت اور قوت کیواسطے اپنے دل میں ہمیشہ محسوس کرتا ہے۔ اسکے ساتھ ہی خیالات اور جذبات کو ایک ترنم اور موزوں اسلوب میں بیان کیا جائے۔" مسٹر واٹس ڈنٹن (Mr. Watts Dunton) کا خیال ہے "شاعری نام ہے ٹھوس اور فنی اسلوب بیان کا جو انسانی خیالات کو ایک موزوں اور جذباتی کلام میں پیش کرے۔" آرنلڈ (Matthew Arnold) کہتا ہے "شاعری اس خوشگوار اور مکمل ترین اسلوب بیان کا نام ہے۔ جو انسانی الفاظ حاصل کر سکتے ہیں۔" کارلائل (Carlyle) کا بیان ہے۔ "شعر وہ کلام ہے جسمیں موسیقیت ہو۔ اگر کوئی بیان موسیقیت سے لبریز ہو تو وہ شاعری ہے۔ موسیقیت سے مراد محض لفظاً یا لفظی ترنم نہیں بلکہ معنوی ہم آہنگی خیال اور اس کا طریقِ اظہار ہے۔"

ادب تنقید ہے صرف اس زندگی کی جو ایک مخصوص رنگ میں نقاد کے دل پر اثرانداز ہوتی ہے کسی چیز کے شعری ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ تخیلی اور جذباتی ہو۔ پس ایک شاعرانہ تنقیدِ حیات سے مراد یہ ہے کہ حقائق۔ تجربات۔ مسائل وغیرہ کو ایک ایسے انداز میں پیش کیا جائے جسمیں جذباتی اور تخیلی عناصر غالب ہوں۔ پس شاعری کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ زندگی کے ان پہلوؤں کی وہ آئینہ داری کرے۔ جو صرف ہمارے جذبات اور خیالات سے متعلق ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنی تخیلی قوتوں کے زور سے دنیا کی حقیقتوں اور کائنات کی صداقتوں کو ایک نئے اچھوتے اور لاہوتی رنگ میں ظاہر کرے۔ پس یہی اچھوتا اور لاہوتی رنگ جسپر تفہیم مطالب کی جمالیاتی مسرتوں کا انحصار ہے اسلوبِ بیان ہی ہے . . . اسلوب بیان شاعری کیلئے سب سے مقدم اور ضروری ہے طرحی اور خزنی خیالات کا اظہار اس کی بے پناہ قوتوں کا مرہونِ منت ہے۔ شعر کی اس مخصوص صنعت سے مراد الفاظ اور تراکیب کا وہ جادو ہے۔ جس سے اثری تخیلات اور ارضی کیفیات کی حقیقی تصویر آنکھوں میں کھچ جائے۔ اور جس سے سامع کے دل پر ایک ایسی وجدانی کیفیت طاری ہو جائے۔ کہ جس کے سننے کے بعد اس کے ذہن میں کوئی حالتِ منتظرہ باقی نہ رہے۔ اگر شعر کا پیرایہ بیان خشک ہوگا تو اسکی توضیح کے لئے منطقی براہین و استدلال اور فلسفیانہ مباحث سے کام لینا پڑے گا جس سے واقعات کے منتشر ہو جانے کا احتمال ہے۔ پس شعر کی سریع الفہمی اور لطافتِ معنوی اسلوبِ بیان ہی کی منت کش ہے۔

شاعر جب آئینہ خانۂ قدرت میں قدم رکھتا ہے۔ تو وہ حسن کے جلوؤں کو بے نقاب دیکھتا ہے۔ اسے ہر شئے میں شانِ جمالی کے کرشمے جھلکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ پھولوں کی رعنائی اور رنگینی کو دیکھکر ایک پُر لطف مسرت محسوس کرتا ہے ستاروں کا مسکرانا۔ چاند کا نور برسانا۔

برستے بادلوں میں بجلیوں کا کوندنا اُسے ایک وجد سامان پیغام دیتا ہے۔ ہر ذرہ ایک کیف ابدی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ پرندوں کے چہچہانے کی فرحت انگیز دلکش آواز سنکر وہ جھوم اٹھتا ہے۔ صبح کی شبنم کے ساتھ وہ خود بھی اشک آلود ہو جاتا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے سنتا ہے محسوس کرتا ہے اگر وہی محسوسات، جذبات اور کیفیات اپنے بیان سے دوسروں کے دل میں بھی پیدا کر دے۔ تو یہ اس کے لئے تمغۂ کمال ہے۔ اور یہ تب ممکن ہے جب اسلوب بیان معجزانہ ہوگا۔

احساس شعر کا عنصر لاینفک ہے جس کی بے پناہ شعاعوں سے کائنات کا ذرہ ذرہ درخشاں ہو جاتا ہے۔ احساس ہی شعر کی اساس ہے اسی کا وجود دوسرے عناصر کو عالم عدم سے منصۂ شہود پر لاتا ہے۔ اور اسی کی گود میں انکی پرورش ہوتی ہے۔ احساس کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کا ادراک کرے یا کسی منطقی یا فلسفیانہ مسئلہ کا حل بتائے۔ بلکہ یہ موثر واقعات سے متاثر ہونے کا نام ہے۔ جب احساس ہم پر خود فراموشی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ تو اس وقت دو اندرونی باطنی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ ایک کا تعلق بصارت سے ہوتا ہے۔ اور دوسری کا تعلق سماعت سے ایک کو اہل فن تخئیل کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور دوسری کو موسیقی کے نام سے موسوم کرتے ہیں تخئیل معانی کا سرچشمہ ہے اور شعر کا باطنی وجود اسی کا منت کش ہے اور ظاہری وجود موسیقی کا۔ کیونکہ موسیقی کا وجود احساس کا مرہون منت ہے۔ اسلئے اگر احساس غم نزا کو الفت سے متعلق ہوگا تو ہمارا دل درد بھری آواز سے اسکی ترجمانی کریگا۔ اگر احساس میں عناصر فرحت و انبساط شامل ہونگے تو ہمارا دل شادمانی کے گیت گائیگا۔ اگر احساس نرم اور لطیف ہوگا۔ تو جو نغمہ دل کی بہنا بول اٹھیگا۔ وہ نرم اور لطیف ہوگا۔ شاعر کو اپنے احساسات قلبی کے اظہار کیلئے اگر آسمان سے تارے توڑنے پڑیں تو بھی توڑ لائیگا کیونکہ اسکی کاوش کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے قلبی کیفیات اور جذبات کو پڑھنے والے کے دل میں بھی پیدا کر دے۔ اور اس مقصد کی تحصیل کیلئے جس چیز کو وہ اپنا آلۂ کار بناتا ہے اسی کا نام حسن اظہار ہے اور اسی کو اسلوب بیان کہتے ہیں شاعر اپنی اس لامحدود قوت کی استعانت سے بڑے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیسکتا ہے مثلاً شکسپیئر رومیو اور جولیٹ کی جدائی کے موقع پر اپنے جذبات اور احساسات کو رومیو کے خیالات اور محسوسات میں جذب کر دیتا ہے وہ خود رومیو بنجاتا ہے۔ ساری کائنات اسکے سامنے جدائی کا منظر پیش کرتی ہے چنانچہ وہ پکار اٹھتا ہے "جان من! مشرق کیطرف دیکھو بادل کے ٹکڑے بھی ایکدوسرے سے چشم پر نم لیکر رخصت ہوتے ہیں ہمیں چمکیلی دھاریاں شاید نہیں ملنے کی کوشش کر رہی ہیں" دیکھا پُر شکوہ اسلوب بیان نے جدائی کے منظر کو کس خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے۔ مثلاً ملک الشعراء حضرت جلیل قبلہ فرماتے ہیں ؎

وصل میں ان کی تبسم خواب آلود میری قسمت نہیں تو پھر کیا ہے؟

جدتِ تخئیل کے ساتھ اسلوب بیان ایسا پُر لطف ہے جو مستغنی عن التوصیف ہے۔ لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی کا ایک شعر ہے جس کا پیرایۂ بیان بہت نادر اور اچھوتا ہے فرماتے ہیں ؎ نہیں دن آئے ہیں رہنے کے، بس ہے جل بجھنے کا، جوانی کی اُمنگیں جھانکتی ہیں جالی محرم سے۔ اگر کوئی شاعر بلند اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اپنے خوش آہنگ الفاظ کے سانچے میں ڈھالدے تو اسکی ادائیگی منطقی استدلال اور فلسفیانہ براہین سے اسکی صداقت کو تسلیم کریں تو یہ حسن کیلئے قادر الکلامی کی سند ہے۔ اور اس شعر میں صدگونہ کہربائیت پیدا ہو جاتی ہے اہل فن کے نزدیک جدتِ اسلوب بیان ہی شاعری ہے کیونکہ جب کوئی مطلب عنوان اور دلفریب انداز سے بیان کیا جائے تو اس میں لطف اور اثر آجاتا ہے اور دل ایک غیر معمولی مسرت محسوس کرنے لگتا ہے اور سننے والے وجد کرنے لگتے ہیں مثلاً محبوب کے وعدے کی نااستواری کو حضرت دلؔ نے اپنی جدت بیان سے کسقدر دلفریب بنا دیا فرماتے ہیں ؎ او عہد شکن حشر میں بھی وعدہ فردا ، آخر یہ ہے اس دن کے سوا کیا؟ کوئی دن اور۔

ایک اور جگہ عہد شکن محبوب کی باتوں کا اعتبار کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎ خدا کے بعد وہ عہد وفا کریں تو یہی محال ہے کہ مرے دل کو اعتبار نہ ہو

دیکھیے اس شعر کا اسلوب بیان کس قدر اچھوتا [illegible] اگر [illegible] کی پتیاں [illegible] گلچیں پھولوں کو توڑ توڑ کر اپنے دامن میں اکٹھا کر رہا ہے۔ شاعر اس حالت کو دیکھتا ہے اور پکار اٹھتا ہے ؎ [illegible] گلچیں [illegible] کیا اسی دن کیلئے فصل بہار آئی تھی

شکوہ اسلوب بیان کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ مثلاً بہار آئی ہے اور [illegible] کلیاں چٹک رہی ہیں ؎

خود بخود چاک ہوئے جاتے ہیں غنچوں کے لباس ۔۔۔ [illegible] بہار آئی ہے

لیکن جہاں اسلوب بیان کی برجستگی اور شگفتگی محاسن شعر کی ضامن ہوتی ہے [illegible] کی خوشگواری محاسن شعر کو لے ڈوبتی ہے اور اسے درجۂ اثر سے گرا دیتی ہے جب شاعر اپنے جذبات و احساسات کو ایسے [illegible] ذہن کی ناقص تفہیم سے قاصر ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے اسلوب بیان میں کوئی نقص ہے [illegible] ترتیب نا گوار ہے۔ مثلاً منظر صدیقی اکبر آبادی کا ایک شعر ہے ؎ [illegible] مذہب کچھ نہیں ہے

مذکورہ شعر کا اسلوب بیان نہایت بھونڈا ہے [illegible] کام فتح ہو گیا۔ شاید منظر صاحب نے اپنے والد ماجد مولانا سیماب کی تقلید میں یہ شعر کہا ہے وہ تو یہاں تک پہنچ گئے ؎

سیماب [illegible] عشق ہے ۔۔۔۔ میری [illegible] خدا کی کتاب ہے

باپ نے تو اپنی بیاض شعر کو صحیفہ الٰہی بنا دیا [illegible] کہ یہ شعر تخیل کی بے اعتدالی اور اسلوب بیان کی ناخوشگواری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎ [illegible] کی پانی میں کتھا سفید

فلسفی اور شاعر کے اسلوب بیان میں فرق

براؤننگ کہتا ہے کہ فلسفہ معانی اور حقیقتوں کا مطالعہ ہے [illegible] حیات کی توجیہ [illegible] جب کسی چیز کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کا نقطۂ نظر بہت وسیع ہوتا ہے۔ وہ کسی چیز پر محدود [illegible] نگاہ نہیں ڈالتا بلکہ تمام زمان اور مکان کا دقیق نظری سے مطالعہ کرنے میں منہمک رہتا ہے اور ایک شے کا دوسری شے سے موازنہ کرتا ہے۔ اور [illegible] تناسب کا پورا پورا خیال رکھتا ہے ۔۔۔ شاعر کا سینہ بحر فطرت کا گنجینہ ہوتا ہے [illegible] رنگ میں [illegible] کبھی وہ ایک چیز کو ایک رنگ میں پیش کرتا ہے اور کبھی دوسرے رنگ میں لیکن [illegible] شاعر کا مرتبہ فلاسفر سے بہت ارفع اور بلند ہوتا ہے فلاسفر جب کسی حقیقت کا اعتراف کر لیتا ہے [illegible] کی یہی دلیل ہے مگر شاعر اثیری تخیلات اور انہی کیفیات کا فرمانروا ہے [illegible] وہ گلشن ہستی کے ایک پھول پر ہزاروں قسم کا غازہ چڑھا کر مختلف حیثیتوں سے [illegible] پیش کرتا ہے۔ بہت ہی جاذب پر لطف اور سحر انگیز ہوتے ہیں۔ اور یہی اسکے قابل [illegible] دلیل ہے فلاسفر اور شاعر دونوں گلستان فطرت کے خوش الحان ہیں۔ دونوں ایک ہی چمن کے پھول ہیں۔ دونوں [illegible] دونوں ایک ہی محمل کے شائق ہیں۔ فلاسفر جب ایک حقیقت

منکشف ہو جاتی ہے تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے لیکن شاعر اپنی تگ و دو ہمیشہ جاری رکھتا ہے اسکے دل پر مختلف کیفیتیں مختلف صورتوں سے جلوہ گر ہوتی رہتی ہیں۔ فلاسفر اپنے انکشافات کو بنظرِ تیقن دیکھتا ہے لیکن شاعر کی فطرت اس سے معرّا ہے۔ فلاسفر بحرِ عالم کی تہ تک پہنچنے کے لئے انتہائی کوشش کرتا ہے اور جو چیز تلاش کر کے لاتا ہے اُسے نہ خود موتی تصور کرتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی ایسا خیال کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسکی سمندر کی تہ تک رسائی ہی نہ ہوئی ہو۔ ممکن ہے جو چیز اُسے دستیاب ہوئی ہو موتی ہی نہ ہو بلکہ کوئی اور چیز ہو۔ یا اس کے مشابہ کوئی اور چیز ہو۔ دُنیا کو اس سے مغالطہ پڑ جاتا ہے اور یہاں تک کہ لوگ اُس پر موتی کا اطلاق کر ہی دیتے ہیں لیکن شاعر جو چیز اپنی پہلی غواصی میں تلاش کر کے لاتا ہے اسکی حقیقت اور ماہیت لوگوں پر من و عن ظاہر کر دیتا ہے۔ جب دوسری کوشش میں اس کا دستِ تجسس اسی چیز پر پڑتا ہے۔ اور اُسکی نظریں اس چیز کے محاسن میں اضافہ دیکھتی ہیں۔ تو وہ دوبارہ اُسکو نئے رنگ میں اور اُسکے لوگوں کے دلوں پر ایک اور کیفیت طاری کر دیتا ہے جو پہلی سے الگ لیکن پُر لطف ہوتی ہے۔ جب تیسری مرتبہ بھی اتفاقیہ وہی چیز اُسے دستیاب ہوتی ہے تو وہ عیوب جو شوقِ نظارہ کی فراوانی کی وجہ سے اسکی نظروں سے پنہاں اور نظر انداز ہوتے رہے ہوں۔ ان کو ایسے حسرت اثر رنگ میں بیان کرتا ہے کہ اسکی کیفیت اور زینت میں ایک پُر لطف تبدیلی واقع ہو جاتی ہے لیکن ایسی بھلی کہ دل اُسپر ہزار جان سے نثار ہو لیکن فلاسفر کے حیطۂ امکان سے یہ باہر ہے کہ وہ جس چیز کو ایک مرتبہ موتی کہے دوسری دفعہ حرف بنا دے کیونکہ جن عقلی و نقلی دلائل کی بنا پر اُس نے ایک چیز کو موتی ثابت کیا ہے اُسے موتی ہی کہنا رہے گا۔ ورنہ جن مسلمہ اُصول پر اُس نے اپنے دعوےٰ کی بنیاد رکھی۔ وہ باطل ہو جائیگا۔ فلاسفر قطرۂ شبنم کو شبنم کا قطرہ ہی بتائیگا اگر زیادہ تگ و دو کرے تو اسکے کیمیاوی اجزا کو علیحدہ علیحدہ کر کے اُنکے خواص سے روشناس کرا دے۔ لیکن شاعر کا نقطۂ نظر ہزاروں پُر اسرار کیفیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ وہ مناظرِ قدرت کا شیدائی۔ خندۂ گل کی ہنسی پر ہنسنے والا اور نالۂ بلبل کو سنکر رونے والا ہوتا ہے۔ دُنیا و مافیہا کی ہر شے سے اُسے اُنس ہے۔ وہ ہر ایک کے رنج و غم میں شریک ہوتا ہے۔ اگر موسمِ بہار میں اُسکا گذر کسی سرسبز و شاداب گلشن میں ہوگا۔ اور وہ گلاب کی سبز پتیوں پر شبنم کے قطروں کو دیکھے گا۔ تو بے اختیار کبھی تو کہہ اُٹھیگا سبز مخمل پر موتی جڑے ہیں۔ اور کبھی اُنہیں گوہرِ آبدار سے تشبیہہ دیگا کبھی اُنہیں فلکِ حسن کے مہ جبین اختر کہیگا اور کبھی انہیں گوشِ گل کے آویزے کے نام سے موسوم کریگا۔ گر موسمِ خزاں میں وہی قطرہ اسکی نظر پڑ جائے تو کبھی اُسے بلبلِ سوختہ جگر کے آبلہ سے تعبیر کریگا اور کبھی آنسوؤں سے تشبیہہ دیگا۔ غرض شاعر کا دل مختلف واقعات سے ہمیشہ متاثر ہوتا رہتا ہے اور وہ اسی دھن میں اسقدر محو ہوتا ہے کہ اپنے گذشتہ انکشافات کو نذرِ نسیان کر دیتا ہے۔ فلاسفر ایسا کرنے سے ہمیشہ عاجز رہا ہے"۔

عناصرِ اسلوبِ بیان

الفاظ کا استعمال ۔ بیان کی پختگی اور دلعزیزی کوئی آسان بات نہیں ہر شخص میر۔ غالب۔ امیر۔ جلیل۔ داغ۔ انیس اور آتش نہیں ہو سکتا اکابرینِ فن میں سے ہر ایک کا اسلوبِ بیان جدا جدا ہے۔ ہر ایک کا رنگ علیحدہ علیحدہ ہے۔ ہر ایک اپنی سمجھ اور سوچ کے مطابق ایسے الفاظ استعمال کرنیکی کوشش کرتا ہے جو اپنے اندر ایک گنجینۂ معانی پنہاں کئے ہوئے ہوتے ہیں اور جو لغوی معانی سے کہیں زیادہ مؤثر۔ جاذب اور لطیف ہوتے ہیں ہر انشا پرداز کی یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ قانونِ ایتلافِ افکار کے ماتحت اپنی دلالتہائے التزامی کے باعث اپنے تعلقاتِ صوتی یا ہماری ذہنی کیفیات اور احساسات کی وجہ سے ایسے الفاظ کا انتخاب کرے جنکے معانی اور ترنم میں چولی دامن کا سا ساتھ ہوتا ہے۔ اور جو لغوی معانی سے بہت بالاتر ہوتے

میں انفرادی ہو بہو اُن ہی اصوات کو سنتا ہے جو مصنف کے دل میں بوقتِ استعمال پیشِ نظر تھیں۔ جب ایک شاعر کو الفاظ کے استعمال پر قدرت کاملہ حاصل ہو جاتی ہے تو وہ نعت اسکی رنگین نوائیاں اور آتش بیانیاں معرضِ وجود میں آتی ہیں اور یہی الفاظ ہی شعر کی پاکیزگی۔ پختگی۔ تناسب توازن کی روح ہوتے ہیں۔

شاعری اور موسیقی میں بہت مماثلت ہے دونوں کا نصب العین ایک ہے۔ دونوں روح اور قلب کی دستوں پر چھا جاتی ہیں۔ اگر ایک قلب کو گرماتی ہے تو دوسری جگر کو تڑپاتی ہے۔ اگر ایک مایہ فرحت و انبساط ہے۔ تو دوسری وجہ عشرت و نشاط مگر موسیقی کی تخلیق نظم اور وزن کے اشتراک پر مبنی ہے جس باکمال شاعر نے موسیقی کو پیشِ نظر رکھا یگانۂ روزگار ہوا اور اس کا کلام زندۂ جاوید۔ حضرت دلؔ قبلہ کا کلام موسیقیت سے لبریز ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ذلیل جوشِ ہیں نالے، مگر ہمت شکن چھالے	بہر حالت مصیبت میں ہوں وہ گم گشتہ منزل ہوں
بیٹھے تو گرد کی طرح، اٹھے تو درد کی طرح	عمر یونہی گزار دی دشتِ جنوں نواز میں
جوشِ ضاعف کیا، نقشِ دوئی مٹا دیا	شمعِ جمالِ یار نے خلوتِ سوز و ساز میں
پتھر کی جو مورت تھی، وہ راحتِ دل کی صورت تھی	کعبہ خدا کا گھر ہے مانا دیر بھی ہم سے چھوٹ گیا
آہوں کا سلسلہ ہے، نالوں کا مشغلہ ہے	زنداں میں ہم جنوں کی تصویر کھینچتے ہیں

الفاظ کی معجز نمائیاں شعر کو بہت حسین بنا دیتی ہیں۔ شاعر اپنی قوتِ متخیلہ کی طاقت سے ایسے الہامی۔ اچھوتے اور نادر الفاظ ڈھونڈ لاتا ہے کہ انسانی عقل دریائے حیرت میں مستغرق ہو جاتی ہے مثلاً اعتبار الملک حضرت دلؔ کا ایک شعر ہے فرماتے ہیں ؎

اِدھر گھبرا کے غمخوار دل کی مایوسانہ سرگوشی	اُدھر بیمار کا کچھ کہہ کے سب سے بے خبر ہونا

ایک بیمارِ غم بسترِ علالت پر کراہ رہا ہے اسکی امیدیں یاس سے بدل چکی ہیں اسکی جان ہونٹوں پر آگئی ہے اسکے تمام خواب خوابِ پریشاں ہو گئے ہیں۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے اسکی سوگوار نظروں میں حزن و ملال کی لہر دوڑ رہی ہے نبضیں چھوٹ چکی ہیں۔ دل سینے کی بجائے لبوں پر آکر دھڑک رہا ہے۔ یاس و قنوطیت کی کشاکش اسے مہیب پیغام سنا رہی ہے اسکے عزیز و اقارب اسکی زندگی سے ناامید ہو چکے ہیں انکی وہ تمام امیدیں جو اسکی ذات سے وابستہ تھیں منقطع ہو رہی ہیں۔ ان کی گھبراہٹ اور مایوسی میں اضافہ ہو رہا ہے ایک خفیف سی دردبھری آہ مریض کے ہونٹوں سے نکل رہی ہے اور وہ کچھ دل ہی دل میں دبی زبان سے گنگنا رہا ہے اور پھر دفعتہً اسکے لبوں پر مہرِ خاموشی ثبت ہو جاتی ہے اتنے وسیع واقعہ کا یہ شعر آئینہ دار ہے۔ الغرض شعر ہے یا گویائی اور معنی آفرینی کا مرقع۔ اور جدتِ اسلوب کی بعینہٖ تصویر نیز اس شعر میں مندرجہ ذیل الفاظ معجزانہ ہیں۔ (۱) اِدھر گھبرا کے (۲) مایوسانہ سرگوشی (۳) کچھ کہہ کے (۴) بے خبر ہونا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

میں اپنے چارہ ساز کا مظلوم لطف ہوں ۔ ناوک کا کھینچنا تھا کہ دم ہی نکل گیا۔ اس شعر میں حضرت دلؔ قبلہ نے جامع المعانی الفاظ کا استعمال کیا ہے مظلوم لطف میں جو مظلومیت ہے اسکی اتھاہ گہرائیوں تک پہنچنا امرِ مشکل ہے ہم اس شعر کو پڑھتے ہیں تو دل میں ایک طوفانِ معانی محسوس کرتے ہیں جو محتاجِ تشریح نہیں۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎ ذروں میں کچھ کشش ہمیں محسوس ہو چلی ۔ اے دل سنبھل کہ پیشِ نظر کوئے یار ہے

عاشق کی وارفتگی میں کسے کلام ہے اُسے نہ اپنی عزت کا خیال ہوتا ہے نہ بے عزتی کی فکر کبھی دشت نوردی کا مشغلہ ہے کبھی آبادی میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ اس کا دل دنیوی احساس سے بالکل بے بہرہ ہوتا ہے نہ وہ کچھ سوچتا ہے نہ اسے سمجھنے کی تمیز ہوتی ہے دیوانگی کے عالم میں اُسے کچھ نہیں دکھائی دیتا اُسے دنیا کی کسی شے سے اُنس نہیں لیکن وارفتگی اور دیوانگی میں بھی احترامِ حسن کا دامن نہیں چھوڑتا اسکے دل میں حسن کی عزت کا ہر وقت احساس

ہوتا تو۔ چنانچہ آستانِ حبیب کے پاس پہنچتے ہی وہ سنبھل جاتا ہے کہ کہیں وارفتگی کے عالم میں مجھ سے کوئی بے ادبی نہ ہو جائے۔ مذکورہ شعر میں لسان الدہر حضرت دل قبلہ نے اس تمام منظر کو جس خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے قابل تحسین ہے اور الفاظ کا انتخاب ایسا نادر اور اچھوتا ہے جو ایسے مضمون کے ادا کرنے کے مطابق ہے۔ نغمۂ دل[1] میں ایسے اشعار بکثرت ہیں:

علامہ شبلی اپنی معرکۃ الآرا کتاب شعر العجم کی چوتھی جلد میں رقمطراز ہیں: "ہر زبان میں مترادف الفاظ ہوتے ہیں جو ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں لیکن جب غور سے دیکھا جائے تو ان الفاظ میں باہم فرق ہوتا ہے یعنی ہر لفظ کے مفہوم اور معنی میں کوئی ایسی خصوصیت ہوتی ہے جو دوسرے میں نہیں پائی جاتی۔ مثلاً خدا کو فارسی میں خدا، پروردگار، داور، ایزد اور رب کہتے ہیں۔ بظاہر ان الفاظ کے ایک ہی معنی ہیں لیکن درحقیقت ہر لفظ میں ایک خاص بات اور خاص اثر ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اسلئے شاعر کی نکتہ دانی یہ ہے کہ جس مضمون کے ادا کرنے کیلئے خاص جو لفظ موزوں اور موثر ہے وہی استعمال کیا جائے ورنہ شعر میں وہ اثر پیدا نہ ہوگا۔ یہ ایک دقیق نکتہ ہے اور بغیر اس کے کہ خاص مثال میں ایک ایک لفظ پر بحث کر کے نہ سمجھا یا جائے، سمجھ میں نہیں آسکتا۔ فیضی کا ایک شعر ہے ؎

بانگ قلمم دریں شب تار — بس معنیٔ خفتہ کرد بیدار

شعر کا اصل مضمون یہ ہے کہ میں نے شاعری میں بہت سے نئے مضمون پیدا کئے لیکن اس کو اس نے اس پیرایہ میں ادا کیا ہے کہ میرے قلم کی آواز نے بہت سے سوتے ہوئے مضمونوں کو جگا دیا۔ اب اس کے ایک ایک لفظ پر خیال کرو۔ بانگ۔ خاص اس آواز کو کہتے ہیں جس میں بلندی اور ضخامت ہو جو جگانے کیلئے موزوں ہے۔ بانگ اور آواز اور صریر ہم معنی ہیں۔ اس لئے بانگ قلم کے بجائے آواز قلم اور صریر قلم بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اس موقع کیلئے صرف بانگ ہی موزوں ہے۔ قلم کو فارسی میں خامہ اور کلک بھی کہتے ہیں لیکن قلم کے لفظ میں جو ضخامت اور رعب ہے اور لفظوں میں نہیں۔ قلمم کے میم نے مکرر اس ضخامت کو اور بڑھا دیا۔ بانگ اور قلم کی ترکیب نے لفظ کو اور زیادہ پُر زور کر دیا۔ تار کو تیرہ اور تاریک بھی کہتے ہیں لیکن اس مصرع میں حسن صوت کے لحاظ سے تار ہی موزوں ہے۔ بس کے ہم معنی بہت سے الفاظ ہیں مثلاً بسیار۔ لختے۔ خیلے وغیرہ۔ لیکن بس کے لفظ میں کثرت کی جو وسعت ہے اور لفظوں میں نہیں۔"

مذکورہ اقتباس سے یہ ثابت ہوا کہ الفاظ و معانی کا ارتباط ہی حسن شعر کا ضامن ہے۔ الفاظ کی ترتیب اور ان کا باہمی تناسب و توافق معانی کی نوعیت سے مشروط ہوتا ہے۔ جس قسم کے معانی ہونگے اسی قسم کے الفاظ کا انتخاب کرنا ایک انشا پرداز کیلئے بیحد ضروری ہے لیکن افسوس مولینا سیماب اکبرآبادی اسکے خلاف ہیں۔ مندرجہ ذیل شعر کی اصلاح پر وہ اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اصل شعر:۔ لینا ہمیں قضا کا سہارا ضرور تھا — ہم ناتواں تھے کوچہ جانانہ دور تھا

حضرت جلیل القدر قبلہ کی اصلاح:۔ " " " " " محبوب دور تھا

سیماب صاحب کی توجیہہ: "ہر زبان میں جانانہ کے معنی بھی محبوب ہی کے ہیں۔ پھر معلوم نہیں "جانانہ" کو "محبوب" سے کیوں بدلا گیا ہے۔" کاش مولانا! اگر آپ نے شعر العجم ہی کو بہ نظر غور پڑھا ہوتا۔ تو ایسا مکرر وہ اعتراض نہ کرتے۔ جو آپکی بے خبری پر دال ہے۔

مصور و شاعر:۔ مصور جو کام رنگوں سے لیتا ہے شاعر وہی کام الفاظ سے لیتا ہے۔ مصور کے پاس گوناگوں رنگوں کی پیالیاں دھری ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ جس رنگ کو جہاں مناسب سمجھتا ہے استعمال کرتا ہے۔ کہیں اسے سرخ رنگ کی ضرورت پڑتی ہے۔ کہیں سبز کی۔ کہیں وہ قرمزی رنگ استعمال کرتا ہے کہیں عنابی۔ اسی طرح شاعر کے خزانۂ فکر میں بھی قسم قسم کے الفاظ موجود ہوتے ہیں۔ کبھی وہ انہیں کنائے کے پیرایہ میں استعمال کرتا ہے کبھی ان پر تشبیہ کا غازہ چڑھا کر ان کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتا ہے کبھی تمثیل کے انداز میں ایسا پُرنور نکتہ کہہ جاتا ہے جو دل کی تاریکیوں کو بقعۂ نور بنا دیتا ہے کبھی انوکھی تراکیب کے جادو سے دنیا کو مسخر کرتا ہے۔ غرضیکہ وہی کام جو مصور گوناگوں کے رنگوں سے لیتا وہی کام شاعر الفاظ سے لیتا ہے۔

[1] نغمۂ دل حضرت دل کے کلام معجز النظام کا مجموعہ ہے۔

مصور کی یہ کوشش قابلِ صد تحسین ہے سب وہ اپنی بنائی ہوئی تصویر کو اصل کے مطابق پیش کر سکے اسکے ہر ایک خط و خال کو ایسے حسن و قبح سے نمایاں کرے کہ اصل اور نقل میں تفریق نہ ہو سکے اگر وہ ایسا کرنے سے قاصر ہے تو یہ اسکے بیگانۂ فن ہونے کی بین دلیل ہے۔ شاعر ہر ایک چیز کا ڈوب کر مطالعہ کرتا ہے وہ ان جذبات اور احساسات کو نمایاں کرتا ہے جس پر وہ عنصر غالب ہوتا ہے اگر اس کا شعر اثر سے معرّا ہو تو سمجھ لیں کہ شاعر بیگانۂ فن ہے اور اثر جب مفقود ہوگا جب الفاظ کا انتخاب مطابق مضمون نہ ہوگا۔ اور اسلوب بیان میں نقص ہوگا۔ حضرت دل قبلہ کے کلام سے خوبی الفاظ کی چند ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔ فرماتے ہیں ؎

شب غم کی مصیبت بھی قیامت تھی مصیبت تھی
یہ عالم تھا کہ اب نکلا، مگر نکلا نہ دم میرا

شمع ساں دل کی لگی بجھ نہیں سکتی شب غم
ہم کو جلنا ہے بہر حال سحر ہونے تک

درحقیقت مضطرب دل سینۂ بے موت تھی
اصطلاح عام میں تسکین جس کا نام تھا

وہ نا کام تمنا ہوں وہ برگشتہ تقدیر دل
سر منزل اگر پہنچوں تو منزل دور ہو جائے

صنائع و بدائع:۔ صنائع و بدائع بھی اسلوب بیان کی ندرت کیلئے بہت ضروری ہیں۔ اردو ادب میں انکی اکثریت ہے۔ تمام شعراء اپنی اپنی بساط کے مطابق ان کا استعمال کرنا نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا جلیل القدر شاعر ہو جو انکی اہمیت کا منکر ہو۔ صنائع و بدائع کی بحث بہت دلچسپ ہے لیکن ہوں سے اسوقت نظر انداز کر رہا ہوں نہ تو میرے پاس وقت ہے اور نہ ہی رہنمائے تعلیم کے صفحات اسکے متحمل ہو سکتے ہیں اگر زندگی رہی تو پھر کبھی انشاء اللہ یہ بحث چھیڑا جائیگا۔

خصوصیاتِ اسلوبِ بیان:۔ (۱) سادگی:۔ سادگی سے یہ مراد ہے کہ مضمون اس طریقہ سے ادا کیا جائے کہ سننے والا فوراً سمجھ جائے بلند سے بلند اور باریک سے باریک خیال سادگی کا حامل ہو سکتا ہے۔ خیال کا سطحی یا عام ہونا سادگی نہیں۔ جب شعر کی بنا کسی موہوم خیال پر ہوگی یا شاعر اس جذبہ کی ترجمانی کرے جسکے سمجھنے سے وہ خود قاصر ہے تو شعر چیستان بن جاتا ہے۔ شعر کے مضمون کا الجھاؤ اسلوب بیان ہی کے نقص کا دوسرا نام ہے۔ آپ دیکھیں کہ بلند سے بلند اور پیچیدہ سے پیچیدہ خیال میں بھی حضرت دل قبلہ سادگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے فرماتے ہیں ؎

عجیب راز ہے ناکامیٔ نگاہ طلسم!
قصور دیدہ کہوں یا کمال جلوہ گری

خود فراموشی سے پیہم مٹ گئی ہر آرزو
حادثہ اسے چارہ جو ہے یہ ہماری یاد کا

وہ تمنا جسے سمجھا تھا سکون دل زار
صرف غم کی ہے کسی کو نہیں تنہائی سے

ذیل کے شعر کی ترتیب بالکل نثر کی سی ہے ؎ بہ گویا واقعات بزم ہستی کا خلاصہ ہے ۔ تیرا یوں دفعتاً خاموش اے شمع سحر ہونا

سر طور ایک برق حسن لہراتی نظر آئی
ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے داماں کو

(۲) **اختصار**:۔ کم سے کم الفاظ میں جب مطلب ادا کیا جائے تو اس کا نام اختصار ہے اور یہ اسلوب بیان کی خاص خصوصیت ہے مثلاً مرزا دبیر مغفور کی ایک رباعی ہے ؎

نادان کہوں دل کو کہ خود مند کہوں ۔ یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں ۔ ایک بندۂ خدا کو منہ دکھانا ہے دبیرؔ ۔ بندہ دل کو میں کس منہ سے خداوند کہوں

کسی نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا اور لطف یہ ہے کہ پورے کا پورا مضمون دو مصرعوں میں آ گیا ؎

دل کو ناداں کہوں یا وضع کا پابند کہوں
مجھ سے ہوتا نہیں بندوں کو خدا وند کہوں

(۳) **اثر**:۔ اثر کلام سے مراد کیفیت قلبی کا [illegible] ادا ہونا ہے یعنی جو کیفیت یا حقیقت شاعر دکھانا چاہتا ہے۔ وہ پوری طور سے آنکھوں میں پھر جائے اور یہی وصف ہے جو بہت کم شعراء میں پایا جاتا ہے۔ اثر کلام سے یہ مراد نہیں کہ دقیق الفاظ اور شاندار اضافتیں استعمال کیجائیں بلکہ شاعر جس تخیل یا تصور کو دکھانا چاہتا ہے اسکے دکھانے میں کسی قسم کی کمی نہ رہ جائے۔ مثلاً خدائے سخن مفتی امیر مینائی فرماتے ہیں ؎

رقابت سے ہوائے گل میں ایسی پھوٹ ڈالی ہے
جدا پتے سے پتہ ہے الگ ڈالی سے ڈالی ہے

حکیم الشعراء حضرت دل قبلہ فرماتے ہیں ؎ مٹا کے ہستی دل صرف یہ دعا کرتے ۔ یہیں سے سعی طلب کی ہم ابتدا کرتے

کاوشِ پیہم بالآخر ہو گئی لطف آفریں ٭ اب وہ نشتر راحتِ دل ہے جو خلش آشام تھا ٭ کہئے تو کہہ دوں عرش بریں کو مقام دل ٭ ہمت مگر کچھ اور ہے اپنے خیال کی

شدتِ غم میں کوئی جوشِ تمنا دیکھیے   اب تو ہر ہر نفس سرخی افسانۂ دل

(۴) مناسبت الفاظ :- اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو الفاظ کی مناسبت خیال سے جو بلاغت کلام کی آئینہ دار ہوتی ہے دوسرے الفاظ کی مناسبت الفاظ سے اور یہ فصاحت کلام میں داخل ہے۔ مثلاً انیس مغفور کا ایک شعر ہے ؎ نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک ٭ ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا اعتبار الملک قبلہ کے کلام میں ایسی مثالیں بکثرت ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎ مژگاں پہ اشکِ خوں نہیں اشکوں سے تر ہے دامن ٭ ہم چشمِ خونچکاں کی تصویر کھینچتے ہیں شعلۂ عشق سے عاشق کو جلانا کیسا ٭ بھر دیا رنگِ وفا شمع نے پروانے میں ٭ لڑکھڑاتے ہیں قدم منزل جب آ پہنچی قریب ٭ عالم غربت میں بھٹکا ناتواں کوئی نہ ہو

کوئی گرد تھا ابھی کس ناز سے دامن کشاں   ہائے قسمت اس گل پر خاکِ تربت کیا ہوئی

مذکورہ اشعار میں الفاظ کی مناسبت کس قدر خیال سے ہے اور یہی شاعر کا طرۂ امتیاز ہے اور یہی وہ معیار ہے جہاں کھوٹے اور کھرے پرکھے جاتے ہیں۔ مناسبت الفاظ کیلئے اس امر کی حتی الامکان کوشش کیجئے کہ شعر میں ایسے الفاظ کا اجتماع ہو جنکو ادا کرنے کیلئے زبان کسی قسم کی دقت یا شکل محسوس نہ کرے الفاظ فصیح اور خوشگوار ہوں اور ان میں ناہمواری اور کھرکھراپن نہ ہو۔ فصاحت کیلئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ الفاظ غریب اور غیر مانوس نہ ہوں شعر میں روانی تب پیدا ہوگی جب الفاظ کھینچ کر یا دب کر ادا نہ ہونگے بلکہ جو انکی اصلی آواز ہو وہی نکلے گی۔ ترنم جو شعر کے حسن اور اثر کا منبع ہے ان ہی فقط مناسبت لفظی ہی کا مرہونِ منت ہے اگرچہ موزونیت ہی کی کلام میں ترنم پیدا ہو سکتا ہے لیکن ترنم اور موزونیت دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ ترنم جب پیدا ہوگا جب شاعر الفاظ کے انتخاب میں انکی انفرادی اور مجموعی آواز کا کانوں سے زیادہ خیال رکھیگا۔ مثلاً حضرت دل قبلہ فرماتے ہیں ؎ یہ بھیگی رات، یہ ٹھنڈا اسماں، یہ کیف بہار ٭ یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اٹھ کے جانے کا ٭ فراقِ یار میں دشوار ہے آزادِ غم رہنا ٭ مرے تارِ نفس اب تو سلاسل ہو گئے جاتے ہیں

(۵) جدت :- یعنی کسی بات کو نئے انداز سے پیش کرنا جس سے سننے والے وجد کرنے لگیں۔ طرزِ ادا کی جدت سے معمولی سے معمولی بات موثر اور جاذب ہو جاتی ہے مثلاً قبلہ عشرت لکھنوی (دیا گار میر) کا ایک شعر ہے ؎ پانی پانی ہوئے غیرت سے پری رخ غنچے ٭ بن بلائے ہوئے شبنم جو چمن میں آئی۔ دیکھا جدتِ اسلوب بیان نے کلام میں کس قدر دلکشی پیدا کر دی۔ حضرت دل فرماتے ہیں ؎ خاک ہو جانا عشق ہی اک اہل دل ٭ جل گیا پروانہ لیکن رنگ محفل جم گیا مثلاً کہنا ہے کہ عشق میں ناکامیوں سے گھبرانا نہیں چاہئے قبلہ دل فرماتے ہیں ؎ راہِ طلب میں ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی ٭ کہتا ہے عشق ترکِ تمنا نہ کیجئے ٭ عشق کی بلند حوصلگی کو ایسے وجد آفریں سلیقے سے بیان کیا ہے جو دادِ بے نیازی سے مستغنی ہے فرماتے ہیں ؎ وہ کیا گھبرائے اے ہمدم خرام حشر پرور سے ٭ کہ جسکے شیشۂ دل کی ہو زینت جو ہر دو جہاں مثلاً اس بات کو بیان کرنا ہے کہ نور کی زیادتی مانع نظارہ ہوئی ؎ کثرتِ تنویر آخر بن گئی وجہِ حجاب ٭ پردہ اٹھنے پر بھی اک پردہ نظر آیا مجھے ٭ تشبیہ، استعارہ، تمثیل اور کنایہ بھی کلام کا زیور ہوتے ہیں اور جدت کی جان۔ لسان الملک خیام العصر حضرت ریاض قبلہ مغفور کا ایک شعر ہے فرماتے ہیں

میسر فلتے ہمیں دانۂ انگور ملے   ہم یہ سمجھے کہ بھرے ساغرِ بلور ملے

"دانۂ انگور" کو "ساغرِ بلور" سے جو تشبیہ دی ہے کس قدر برمحل اور بدیع ہے۔ اور اس سے کلام میں کس قدر دلکشی اور جاذبیت پیدا ہو گئی مثلاً میر انیس مغفور فرماتے ہیں ؎

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار   خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

استعارے اور کنائے میں کیسی پُر لطف بات کہہ دی حضرتِ دل قبلہ نے کیا خوب کہا ؎

دل منتظر ہے لطف و کرم کی نگاہ کا   ہو مست جس سے رو رح وہ ساغر یہاں چلے

مثلاً فصیح الملک حضرت داغ مغفور کا ایک شعر ہے۔ فرماتے ہیں ؎

خوش نوائی نے رکھا ہم کو اسیرِ صیاد   ہم سے اچھے رہے صدقے میں اترنے والے

تمثیلی انداز میں کیسی پر لطف بات کہی ہے۔ اور موثر ٭

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۱۶ رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۱۶ رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۱۶

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مہتہ ایشور داس پرنٹر چھپا اور ماسٹر جگت سنگھ پروپرائٹر و پبلشر رسالہ رہنمائے تعلیم رام گلی لاہور نے شائع کیا